انسپکٹر نواز خان کی جرم و سزا پر مبنی تفتیشی کہانیاں
جرم و سزا
لڑکی، چور اور سپاہی
طاہر جاوید مغل

پیش لفظ

انسپکٹر نواز خان کی کہانیاں جرم اور جرم کے ''نتیجے'' کی کہانیاں ہیں۔ ان میں سے اکثر کہانیاں دیہاتی ماحول کی ہیں۔ ہمارے پنجاب کا دیہاتی ماحول ہمیشہ سے ''داستان گو'' کے لئے بہت دل پسند رہا ہے۔ یہ کہانی کے لئے بڑا زرخیز ماحول ہے۔ یہاں کہانی دریاؤں اور نہروں کے مٹیالے پانیوں کے ساتھ بہتی ہے...... کھیتوں کھلیانوں میں اُگتی ہے، رہٹوں اور بیٹھکوں میں کروٹیں لیتی ہے۔ سردیوں کی طویل شبنم آلود راتیں، گرمیوں کی سنسان دوپہریں، ساون کی لمبی جھڑیاں، سنہری کھیتوں پر پھیلی ہوئی بیکراں چاندنی...... یہ سب پنجاب کی کہانی کے سرچشمے ہیں۔

نواز خان کی زیرِنظر کہانیاں ہمارے اردگرد کی روداد ہیں۔ زر، زن اور زمین ہمیشہ سے فساد کی جڑ رہے ہیں۔ ان تینوں میں سے ''زن'' کا عنصر سب سے اہم ہے کیونکہ یہ باقی دونوں چیزوں کی خواہش بھی انسان کے اندر بھڑکا دیتا ہے۔ عورت فساد کی وجہ بنتی ہے یا نہیں، یہ ایک علیحدہ بحث ہے لیکن ''فساد'' کی سب سے زیادہ ''سزا'' عورت کو ہی بھگتنا پڑتی ہے۔ کبھی ماں کی حیثیت سے بیٹا کھو کر، کبھی بہن اور بیوی کی حیثیت سے بھائی اور شوہر کھو کر اور اکثر وہ براہِ راست انتقام کا نشان بن جاتی ہے۔

مرد اپنی دشمنیاں چکانے کے لئے دشمن کی عورت کو بہترین ہدف سمجھتے ہیں۔ ان کہانیوں میں انسپکٹر نواز خان آپ کو ایسے ہی لوگوں کے خلاف برسرِ پیکار نظر آئے گا، جو عورت اور دولت کی خواہش میں اخلاقی قدروں کو پامال کرتے ہیں۔ عام طور پر پولیس کے محکمے کو سخت تنقید کا نشانہ بنایا جاتا ہے لیکن اچھے برے لوگ ہر جگہ موجود ہیں۔ آج بھی اس محکمے میں کئی انسپکٹر نواز خان ہوں گے۔ ایسے لوگ جو ظالم کے لئے کرخت اور مظلوم کے لئے نرم و مہربان ہیں۔ وہ ترقیوں، تمغوں اور داد و تحسین کی پرواہ کئے بغیر اپنی جان خطرے میں ڈالتے ہیں اور اپنا فرض نبھانے کی کوشش کرتے ہیں۔

میں نے ان کہانیوں کو لکھا ہے اور علی میاں پبلیکیشنز کے عبدالغفار صاحب نے انہیں کتابی سلسلے کی شکل میں خوبصورتی سے شائع کیا ہے۔ ہم دونوں کی یہ کوشش پنجاب پولیس کے اُن فرض شناس افسروں اور اہلکاروں کے نام ہے جو انسپکٹر نواز خان کی طرح نمک کی کان میں رہ کر نمک نہیں بنے اور اپنی علیحدہ شناخت رکھتے ہیں۔

طاہر جاوید مغل

فہرست

لڑکی، چوراورسپاہی

دوارکا سنگھ بڑا شاطر اور خطرناک ڈاکو تھا۔ دو انسپکٹر اور دو ڈی ایس پی اس کی گرفتاری میں ناکام ہو کر لائن حاضر ہو چکے تھے۔ دوارکا سنگھ ایک خانہ بدوش دوشیزہ موہنی کی آواز کا عاشق تھا۔ میں نے اسے پھانسنے کے لیے موہنی کا جال بچھایا اور پھر......

وہ ایک سخت گرم اور حبس زدہ رات تھی، چاندنی کی ٹھنڈک بھی اس گرمی پر کوئی خاص اثر نہیں کر رہی تھی۔ پسینہ دھاروں کی صورت بہہ رہا تھا۔ میں عام دیہاتی لباس یعنی دھوتی کُرتے میں تھا۔ چہرے پر ''مڑاسا'' باندھ رکھا تھا کوئی مجھے اس حلیے میں دیکھتا تو یہی سمجھتا کہ کوئی رسہ گیر یا نقب زن اپنے ''کام'' پر نکلا ہوا ہے۔ مٹی کی پانچ فٹ اونچی دیوار کے پاس پہنچ کر میں نے احتیاط سے اردگرد دیکھا۔ کھیت سنسان پڑے تھے۔ فصلوں کے درمیان کہیں کہیں بیری، شیشم اور شریہہ کے درخت سر جھکائے خاموش کھڑے تھے کوئی شاخ کوئی پتا حرکت میں نہیں تھا۔ رات دس بجے کا وقت تھا۔ کسی رہٹ کی آواز بھی نہیں آ رہی تھی۔ صرف دور گاؤں کے نواح میں آوارہ کتے بھونک رہے تھے۔ میں نے اچک کر دونوں ہتھیلیاں مٹی کی دیوار پر جمائیں اور بے آواز اندر کود گیا۔

یہ ایک وسیع و عریض فارم تھا۔ ہر قسم کے پھلدار پودوں کی بہتات تھی۔ کوئی چار ایکڑ پر پھیلا ہوا یہ فارم گاؤں کے چوہدری شاہ مراد کی ملکیت تھا۔ وہ ایک زبردست، ٹھاٹ باٹ والا چوہدری تھا اور اس نے اس فارم کو علاقے کا بہترین فارم بنا دیا تھا۔ نایاب پھول، پودے، سبزیاں اور درخت اس فارم میں دیکھے جا سکتے تھے بہرحال میں اس وقت یہ چیزیں دیکھنے نہیں آیا تھا۔ میرا مقصد کچھ اور تھا، مجھے اس دیہی تھانے میں آئے ہوئے پانچ ماہ گزر چکے تھے اور اس وقت سے میری یہ خواہش تھی کہ کسی طرح چوہدری کے فارم کو اندر سے اچھی طرح دیکھ سکوں۔ مطلب یہ کہ فارم کی کوئی بات مجھ سے چھپی نہ رہے۔

بظاہر تو چوہدری شاہ مراد ایک شریف چوہدری تھا مگر پولیس کا کام شک کرنا ہوتا ہے اور شک کر کے ہی وہ اچھے بُرے کی تمیز کرتی ہے۔ چوہدری نے اس فارم کو ممنوعہ علاقہ بنا رکھا تھا۔ (حالانکہ اِس میں کچھ بھی نہیں تھا) چاروں طرف مٹی کی دیوار تھی اور جہاں دیوار نہیں تھی

وہاں خاردار باڑ تھی۔ کوئی دیہاتی اس فارم میں داخل نہیں ہوسکتا تھا اور اگر ہوتا تھا تو سزا بھگتتا تھا۔ میں نے ایک دو دفعہ چوہدری کے ساتھ فارم کی سیر کی تھی مگر اُس سیر اور آج کی سیر میں بڑا فرق تھا۔ آج چوہدری کے کارندوں کو اِس آمد کا قطعاً علم نہیں تھا۔ میں اپنی مرضی سے گھوم پھر سکتا تھا۔

یہ موقع بھی مجھے اس طرح مل گیا تھا کہ چند روز بعد گاؤں کے نواح میں ایک بڑا میلہ شروع ہورہا تھا۔ اس میلے کے بارے میں مَیں آپ کو آگے چل کر بتاؤں گا۔ فی الحال یہ سمجھ لیں کہ میلے کی تیاری کے لیے زمین ہموار کرنے کا کام ہورہا تھا اور چوہدری کے بہت سے کارندے اس کام میں مشغول تھے، فارم کے راکھے بھی اُدھر ہی گئے ہوئے تھے۔

میرے لیے یہ مناسب وقت تھا کہ فارم میں گھس کر اس کا اچھی طرح جائزہ لے سکوں۔ میرے اس جائزے کا کیا نتیجہ نکلا؟ میرا خیال ہے میں اس بارے میں آپ کو پہلے ہی بتا دوں تاکہ آپ خواہ مخواہ تجسس کا شکار نہ ہوں۔ میں کوئی ایک گھنٹہ فارم کے اندر رہا مگر مجھے وہاں کوئی قابلِ اعتراض چیز نظر نہیں آئی۔ درحقیقت وہاں کوئی غیر قانونی کام نہیں ہورہا تھا۔ مجھے اس سلسلے میں وقتاً فوقتاً جو اطلاعات ملی تھیں۔ اُن کی بنیاد کمزور شک پر تھی۔ غالباً چوہدری نے اپنے قیمتی پودوں کی رکھوالی کے لیے اتنے سخت حفاظتی انتظامات کر رکھے تھے۔

اس فارم میں گھسنے کا مجھے صرف ایک فائدہ ہوا اور وہ یہ کہ میں نے ایک بے گناہ لڑکی کو دو افراد کے ہاتھوں برباد ہونے سے بچالیا۔ تفصیل اس واقعے کی کچھ یوں ہے کہ میں جب فارم کے اُس حصے میں پہنچا جہاں چوہدری نے ایک بڑا جھیل نما تالاب بنا رکھا تھا اور جس میں اس نے مچھلیاں پال رکھی تھیں، اچانک مجھے کیلے کے درختوں سے دبی دبی آہٹوں کی آواز آئی پھر یوں لگا جیسے کوئی بڑی مچھلی پانی میں تڑپ رہی ہے۔ میں لپک کر موقعے پر پہنچا۔

جھیل کے کنارے میں نے تین سائے دیکھے، اُن میں ایک عورت تھی۔ وہ آپس میں گتھم گتھا تھے۔ کچھ دیر درختوں کے اندر سے یہ منظر دیکھنے کے بعد میں سمجھ گیا کہ کیا معاملہ ہے۔ چوہدری کے دو راکھے کسی اکیلی لڑکی کی عزت سے کھیلنے کی کوشش میں تھے۔ میں نے لپک کر آگے بڑھ کر انہیں للکارا۔ انہوں نے لڑکی کو چھوڑا اور لپک کر اپنی لاٹھیاں اٹھائیں۔ بڑی تیزی سے وہ مجھ پر جھپٹے۔ میں نے ایک کی لاٹھی کا وار بچا کر اس کے پیٹ میں زوردار ٹانگ رسید کی۔ وہ اچھل کر پانی میں جا گرا۔ دوسرے کی چمکدار لاٹھی میرے کندھے کو چھوتی

گزر گئی۔ میں قمیص کے نیچے سے اپنا ریوالور نکال چکا تھا۔ یہ ریوالور میں نے پوری قوت سے مدِ مقابل کے منہ پر دے مارا۔ وہ بھی تالاب کے کنارے کیچڑ میں جا گرا۔ میرے ہاتھ میں ریوالور دیکھ کر اُن کے چہرے خوف سے پیلے ہو رہے تھے۔ دونوں بزدل سے شخص تھے۔ میں نے اُن کے پاؤں میں دو فائر کیے تو وہ پاگل گھوڑوں کی طرح اچھلے اور سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ نکلے۔

لڑکی ایک درخت سے لگی تھر تھر کانپ رہی تھی۔ چاندنی میں اُس کا پورا حلیہ نمایاں تھا۔ اس کی قمیص، جسم پر برائے نام ہی رہ گئی تھی اور وہ اپنی عریانی کو اپنے بازوؤں میں چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں نے غور سے دیکھا اور پہچان گیا۔ وہ چوہدری شاہ مراد کی ایک ملازمہ تھی۔ میں اسے حویلی میں ایک دو بار دیکھ چکا تھا۔ نام مجھے معلوم نہیں تھا۔ وہ کانپتی آواز میں بولی۔

''بھرا جی...... آپ کی بڑی بڑی مہربانی۔ یہ دونوں غنڈے میری جان لینے پر تُلے ہوئے تھے۔ یہ حرامجادہ، ٹٹ پیناں کرموں میرا چاچا بنتا تھا۔ مجھے کیا پتہ تھا چاچے کے بھیس میں شیطان ہے۔'' لڑکی اپنا دکھ بھی بیان کر رہی تھی اور مجھ سے خوفزدہ بھی تھی۔ میرا ڈاکوؤں جیسا منڈاسا اُسے ڈرا رہا تھا۔

میں اپنا تعارف کرا کے لڑکی کا ڈر دور کر سکتا تھا مگر اس وقت میں ایسی جگہ کھڑا تھا کہ تعارف کرانا ممکن نہیں تھا۔ بلکہ میں کوئی لفظ بھی بولنا نہیں چاہتا تھا تاکہ میری آواز میرا پول نہ کھول دے۔ میں چوہدری کے فارم میں چوری چھپے آیا تھا۔ چوہدری مجھ پر اعتماد کرتا تھا اور سچی بات ہے میں اُس کے اعتماد کو ٹھیس پہنچانا نہیں چاہتا تھا۔

میں نے بغیر کچھ کہے اپنے کُرتے کے بٹن کھولے اور کُرتہ اتارنے لگا۔ لڑکی سہم کر کچھ اور پیچھے ہٹ گئی۔ میں نے آگے بڑھ کر یہ کُرتہ اسے تھما دیا اور بھاری آواز میں غرا کر کہا۔

''جاؤ...... چلی جاؤ۔''

وہ میرا مطلب سمجھ گئی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں شکریے کے آنسو بھی تھے اور خوف کے سائے بھی۔ کُرتہ سنبھالتے ہوئے وہ درختوں میں گھس گئی۔ غالباً فارم میں اِس وقت اُن دونوں راکھوں کے سوا اور کوئی موجود نہیں تھا ورنہ میرے دو فائروں کی آواز ضرور کسی نہ کسی کو یہاں کھینچ لاتی۔ لڑکی کُرتہ پہن کر واپس آگئی تو میں نے اُسے ساتھ لیا اور چار دیواری پار کرنے میں مدد دی۔ چار دیواری سے نکلتے ہی وہ وحشی ہرنی کی طرح گاؤں کی طرف بھاگ نکلی۔ میں خاموشی سے ایک دوسرے راستے پر چل دیا۔

☆======☆======☆

اگلے روز چوہدری مراد اپنے دونوں کارندوں کے ہاتھ رسی سے باندھے ہوئے تھانے لے آیا۔ میں اُن خبیثوں کو پہچان گیا۔ ایک کے منہ پر میرے ریوالور کا زخم تازہ تھا۔ چوہدری مراد چالیس پینتالیس برس کا ایک لمبا تڑنگا شخص تھا۔ اُس نے میرے قریب پہنچ کر دونوں مجرموں کو ''کھینچا'' مارا تو وہ لڑکھڑاتے ہوئے میرے قدموں میں آگرے اور منتیں سماجتیں کرنے لگے۔ چوہدری نے ڈانٹ کر اُنہیں چپ کرایا۔ اُس کے عقب میں رات والی لڑکی بھی سہمی ہوئی کھڑی تھی۔ اب اس کے جسم پر ڈھنگ کا لباس تھا۔ وہ گندمی رنگ کی ایک دلکش لڑکی تھی۔ عمر یہی کوئی پندرہ سولہ برس رہی ہوگی۔ اُس کی ناک میں خانہ بدوش لڑکیوں کی طرح چاندی کی نتھ تھی۔ چوہدری مراد نے دھاڑتے ہوئے کہا۔

''تھانیدار! گرفتار کرلے ان دونوں بدکاروں کو۔ رات اِن شیطانوں نے میری عزت پر ڈاکہ ڈالنے کی کوشش کی ہے۔''

میں نے انجان بنتے ہوئے کہا۔ ''ہوا کیا چوہدری صاحب؟''

چوہدری نے کہا۔ ''بول کُڑیے، کیا ہوا تھا تیرے ساتھ۔ سب کچھ بتادے تھانیدار کو۔''

چوہدری کے ساتھ کچھ اور آدمی بھی آئے تھے اور اب وہ سب خونی نظروں سے دونوں مجرموں کو دیکھ رہے تھے۔ مجرموں میں سے ایک نوجوان تھا اور دوسرے کی عمر چالیس سال سے اوپر تھی۔ اُس کے منہ پر چیچک کے داغ تھے۔

لڑکی نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

''تھانیدار صیب! یہ چاچا کرموں...... یہ چاچا کرموں......''

لڑکی کی آواز میں بڑی معصومیت تھی لگتا تھا کوئی بچی بول رہی ہے۔ چوہدری نے اسے ڈانٹ کر کہا۔ ''تھتلا کیوں رہی ہے۔ صاف صاف بتادے وہ سب کچھ جو مجھے بتایا تھا۔''

لڑکی نے لڑنے والے انداز میں ہاتھ نچایا اور بولی۔ ''یہ چاچا شڑنگ (کرموں کی چھیڑ) مجھے چکر دے کر وہاں لے گیا۔ کہتا تھا چل آ میرے ساتھ آج ڈیرے پر کوئی نہیں۔ تجھے آم کھلاؤں گا۔ مجھے کیا پتہ تھا اس کے من میں کیا کھوٹ ہے۔ میں وہاں چلی گئی۔ اس نے پہلے مجھے دوتین سُکے سڑے آم کھلائے پھر...... جبر دستی کرنے لگا۔ یہ دوسرا بھنڈی کے منہ والا بھی اس کے ساتھ تھا۔ دونوں میرے کپڑے کھینچ رہے تھے۔ کہتے تھے......'' لڑکی شرما کر چپ ہوگئی۔ پھر چیچک زدہ شخص سے بولی۔ ''بتاؤں چاچا شڑنگ تُو نے کیا کہا تھا۔''

چوہدری نے کہا۔ ''اچھا دفع کر۔ آگے بتا کیا ہوا تھا؟''

لڑکی نے کہا۔ ''تھانیدار صیب! ان دونوں نے مجھے پانی میں گرادیا۔ بس مار ہی دینا چاہتے تھے...... اتنے میں ایک واہ گرو کا پیارا سفید گھوڑے پر سوار درختوں سے نکلا تو میں سمجھی شاید ان کا ہی ساتھی ہے۔ پر اس نے بڑا کام دکھایا۔ اس نے نیفے سے کوئی...... کوئی آدھ گز لمبا پستول نکالا اور دھاں دھاں گولیاں چلانا شروع کردیں۔ موت سامنے دیکھی تو یہ دونوں شیر دُم دبا کر بھاگ گئے۔ اس بھلے مانس نے مجھے اپنا کُرتہ اتار کر دیا تاکہ میں پہن کر گاؤں آسکوں۔ گُرو کی سوگند اگر وہ نہ ہوتا تو آج چھپڑ (تالاب) سے میری لاش ملنی تھی۔''

لڑکی اپنی کہانی اس طرح سنا رہی تھی جیسے رات اُس کی عزت نہیں جارہی تھی بلکہ کوئی اُس سے ایک روپے کا نوٹ چھین رہا تھا۔ بڑا کھلنڈرا سا انداز تھا اُس کا۔ وہ جھوٹ سے بھی کام لے رہی تھی۔ اُس نے کہا تھا کہ اس کا منہ بولا چاچا شڑنگ یعنی کرموں اسے خود فارم پر لے کر گیا تھا۔ جہاں تک میرا اندازہ تھا وہ آموں کے لالچ میں خود ہی وہاں پہنچی تھی۔ اس کے علاوہ وہ کچھ اور بھی جھوٹ بول رہی تھی۔ یعنی آدھ گز لمبا پستول۔ سفید گھوڑا اور تابڑتوڑ فائرنگ۔ بہرحال اُس کی باتوں سے ظاہر تھا کہ وہ ایک سیدھی سادی اور کھری لڑکی ہے۔ مجھے اُس کا انداز بہت پسند آیا اور دل میں اس کے بارے جاننے کی خواہش پیدا ہوئی۔

مجرم تھوڑی سی چھینٹی کھا کر حوالات میں پہنچ گئے تو گاؤں کے معززین بھی واپس چلے گئے۔ لڑکی بھی چلی گئی۔ تھانے میں صرف چوہدری شاہ مراد بیٹھا رہ گیا۔ میں نے اُس سے لڑکی کے بارے میں پوچھا تو اُس نے کہا کہ اس کی کہانی بھی عجیب وغریب ہے۔ اُس نے بتایا کہ اس کا نام موہنی ہے۔ آج سے چند سال پہلے یہ اپنی بڑی بہن کے ساتھ ہمارے گاؤں کے میلے میں گانے آئی تھی۔ دراصل یہ ایک خانہ بدوش قبیلے سے تعلق رکھتی ہے۔ اس قبیلے کی کئی عورتیں گانے بجانے میں اپنا جواب نہیں رکھتیں۔ اُس سال موہنی اور اس کی بڑی بہن نے میلہ لوٹ لیا۔ لوگوں نے دونوں بہنوں کا گانا بے حد پسند کیا۔ دور دور کے دیہات سے لوگ دونوں بہنوں کی آواز سننے کے لیے آئے۔ میلہ سات روز کا ہوتا ہے لیکن اُس سال پورے نو دن چلا۔

سب کچھ ٹھیک ٹھاک تھا لیکن میلے کے آخری روز ایک گڑبڑ ہوگئی۔ تماشائیوں میں سے ایک شخص نے موہنی سے چھیڑ چھاڑ کی تو میرے دونوں بیٹے طیش میں آگئے۔ پنڈال کے اندر ہی لڑائی شروع ہوگئی۔ لاٹھیاں لگنے سے پانچ چھ بندوں کے سر پھٹ گئے۔ پولیس نے آکر

معاملہ رفع دفع کرادیا۔ بعد میں پتہ چلا کہ موہنی کو چھیڑنے والا شخص علاقے کا مشہور ڈاکو دوارکا سنگھ تھا۔ وہ ایک عام دیہاتی کے بھیس میں میلہ دیکھنے آیا ہوا تھا۔ اُس نے ایک بندے کے ہاتھ مجھے پیغام بھجوایا کہ دوارکا سے ٹکر لے کر میرے بیٹوں نے اپنے رستے میں کانٹے بوئے ہیں اور بہت جلد مجھے اس کی سزا مل جائے گی۔

دوسری طرف موہنی اور اس کی بڑی بہن سہتی کو بھی معلوم ہو چکا تھا کہ اُن کی خاطر لڑنے بھڑنے والا مشہور ڈاکو دوارکا تھا۔ وہ سخت خوفزدہ ہوئیں اور میرے پاس آکر مشورہ طلب کیا۔ میں نے انہیں تسلی تشفی دی اور کہا کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ میں نے پولیس کی مدد طلب کی ہے اور بہت جلد دوارکا جیل کی سلاخوں کے پیچھے نظر آئے گا، وہ اطمینان سے واپس جائیں انہیں کوئی خطرہ نہیں۔ کہنے کو تو میں یہ سب کچھ کہہ رہا تھا لیکن خوف میرے دل میں بھی موجود تھا۔ میں جانتا تھا دوارکا کو پکڑ لینا اتنا آسان نہیں۔

دس پندرہ روز خیریت سے گزرے۔ پھر ایک دن سہتی اور موہنی روتی دھوتی میرے پاس آگئیں۔ سہتی نے کہا کہ کل رات دوارکا کے کچھ بندے ہمارے ڈیرے پر آئے تھے انہوں نے ہمارے سردار کو دھمکیاں دیں اور کہا کہ موہنی نامی لڑکی کو ہمارے حوالے نہ کیا تو بُرا نتیجہ نکلے گا۔ انہوں نے ہمارے سردار کو روپے گہنے کا لالچ بھی دیا اور کہا کہ جیسے بھی ہو یہ لڑکی اُن کو ملنی چاہیے۔ آج ہمارے سردار نے ہمیں اپنے خیمے میں بلا کر کہا کہ تمہاری اور ڈیرے کی بہتری اسی میں ہے کہ تم دونوں یہاں سے چلی جاؤ۔ دوارکا جیسا بدنام شخص تمہارے پیچھے پڑ گیا ہے اور اس سے پوری بستی کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔ ہمیں خود بھی یہی بات سمجھ میں آئی کہ ہم ڈیرے سے نکل جائیں۔

چوہدری مراد نے حقہ گڑگڑایا اور پھر میرے اردگرد دھواں چھوڑ کر ماضی میں جھانکتا ہوا بولا۔ ”مجھے دونوں بہنوں پر بڑا ترس آیا اور میرے دل نے کہا کہ مجھے ان دونوں عورتوں کو اس مصیبت میں تنہا نہیں چھوڑنا چاہیے۔ میں نے انہیں حویلی میں پناہ دے دی اور وہ پوری حفاظت سے وہاں رہنے لگیں۔ دوارکا میری حویلی میں داخل ہونے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا اس لیے پیچ وتاب کھا کر رہ گیا۔ وقت گزرتا رہا۔

سہتی اپنی چھوٹی بہن کا بہت خیال رکھتی تھی۔ بالکل ماں کی طرح اُس کے لاڈ دیکھتی تھی۔ اسی دوران وہ بیمار ہوگئی...... پھر کچھ عرصہ بستر پر گزارنے کے بعد مرگئی۔ یہ آج سے کوئی ڈیڑھ سال پہلے کی بات ہے۔ مرنے سے پہلے اُس نے مجھ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ میں اُس کے پاس پہنچا تو اس نے شدید بیماری کے باوجود بستر سے اتر کر میرے پاؤں پکڑ لیے

اور دعائیں دینے لگی کہ میں نے مشکل میں دونوں بہنوں کا ساتھ نبھا کر بڑی نیکی کی ہے۔ پھر اُس نے مجھے ایک گٹھڑی دی جس میں اس کی عمر بھر کی کمائی تھی اور کہا کہ میں ایک دو سال میں کوئی اچھا سا رشتہ دیکھ کر موہنی کی شادی کر دوں......

سہتی کے مرنے کے بعد اب موہنی میری ذمہ داری ہے۔ میں جانتا ہوں دوارکا سنگھ اب بھی اُس کے پیچھے ہے۔ اس لیے میں نے اُسے حویلی سے باہر نکلنے سے منع کر رکھا ہے۔ اگر وہ کہیں جاتی بھی ہے تو ایک دو مسلح آدمی اس کے ساتھ ہوتے ہیں۔ لیکن رات نہ جانے وہ کیسے فارم میں پہنچ گئی۔ کم بخت کے پاؤں سے بلیاں بندھی ہوئی ہیں...... میں اس کوشش میں ہوں کہ اس کی برادری کے کسی لڑکے سے شادی کرا کے اسے کسی دوسرے علاقے میں بھجوا دوں تا کہ اس کی بہن کو دیا ہوا قول پورا ہو......“

میں جانتا تھا چوہدری جو کچھ کہہ رہا ہے ٹھیک کہہ رہا ہے۔ وہ اُن لوگوں میں سے تھا جو قول دیتے ہیں تو پھر جان کے بدلے بھی اُسے نبھاتے ہیں اور ایک بار جس کا ہاتھ پکڑتے ہیں اُسے منزل تک پہنچا کے دم لیتے ہیں۔ ایک طرح موہنی کو دوارکا سنگھ سے بچانے کا مسئلہ اس کی آن کا مسئلہ بن چکا تھا اور وہ اس معاملے میں پوری طرح سنجیدہ تھا۔

چوہدری شاہ مراد اپنی کہانی ختم کر چکا تھا۔ مجھے اس موقع پر اُس کی اصول پسندی کی تعریف کرنی چاہیے تھی لیکن میرا ذہن کہیں اور ہی پہنچا ہوا تھا۔ کانوں میں دوارکا سنگھ کا نام گونج رہا تھا اور دل و دماغ میں جیسے کوئی گھڑ دوڑ جاری تھی۔ میں دوارکا سنگھ کے نام سے واقف تھا اور مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ کئی ضلعوں کی پولیس اس کے پیچھے ہے۔ میرے علم کے مطابق قریباً دو انسپکٹر اور دو ڈی ایس پی اس کی گرفتاری میں ناکام رہنے کے بعد وقتاً فوقتاً لائن حاضر اور ٹرانسفر ہو چکے تھے۔ اگر اُس کی گرفتاری کا کارنامہ میرے ہاتھوں انجام پا جاتا تو اعلیٰ افسروں میں میری نیک نامی ہو سکتی تھی۔ اس وقت مجھے نیک نامی کی ضرورت بھی تھی۔ مجھے ترقی کی خواہش نہیں تھی اور نہ ہی میں ترقی کرنا چاہتا تھا۔ (اس کی کیا وجوہات تھیں پھر کبھی آپ کو بتاؤں گا) ہاں یہ ضرور چاہتا تھا کہ محکمے کے اعلیٰ افسر مجھ پر اعتماد کرنا سیکھ جائیں اور مجھ سے میری قابلیت کے مطابق کام لیں۔

میں نے وہیں چوہدری مراد کے سامنے بیٹھے بیٹھے فیصلہ کیا کہ مجھے دوارکا سنگھ کو گرفتار کرنا ہے...... قدرت مجھے ایک سنہری موقع فراہم کر رہی تھی اور مجھے ہر قیمت پر اس موقعے سے فائدہ اٹھانا تھا۔ جس دن میری تبدیلی اس تھانے میں ہوئی تھی۔ میں خاصا ناخوش تھا لیکن آج میں سوچ رہا تھا کہ اس تھانے میں میرا آنا ایک نیک فال ثابت ہوا

ہے۔

☆======☆======☆

کوئی تین روز بعد میں چوہدری مراد کی حویلی میں اُس کے سامنے بیٹھا تھا۔ میں نے کہا۔

''چوہدری صاحب! آپ دوارکا کو گرفتار کرانے کا کیوں نہیں سوچتے جو تلوار دیر سے آپ کے سر پر لٹک رہی ہے وہ ہٹ جائے گی......''

چوہدری نے کہا۔ ''یہی سوال میں تم سے پوچھ سکتا ہوں۔ تمہارا تعلق پولیس سے ہے۔ آخر تم لوگ اب تک اُسے گرفتار کرنے میں کامیاب کیوں نہیں ہوئے۔ دو تین ضلعوں کی پولیس اس کام میں لگی ہوئی ہے۔ کئی بے گناہوں کے تم لوگوں نے ہاتھ پاؤں توڑے ہیں اور جیلوں میں ڈالا ہے۔ وہ خبیث پھر بھی تمہارے ہاتھ نہیں آیا۔''

میں نے کہا۔ ''چوہدری صاحب! اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنا ٹھکانہ بہت خفیہ رکھتا ہے اور واردات کرنے سے پہلے ہی اڈا بدل دیتا ہے۔ اس کے علاوہ پچھلے دو سالوں میں اُس نے وارداتیں بھی چند ایک ہی کی ہیں۔ اب میری اطلاعات کے مطابق پچھلے چھ ماہ سے اُس نے کوئی واردات نہیں کی۔ کہیں چھپ کر بیٹھا ہوا ہے اور جمع شدہ پیسے سے موج کر رہا ہے۔ ایسے میں پولیس بھلا کیا کر سکتی ہے۔''

چوہدری نے کہا۔ ''پھر مجھ سے کیوں کہہ رہے ہو کہ اُسے گرفتار کیوں نہیں کراتے۔''

میں نے مسکرا کر کہا۔ ''اس کی ایک وجہ ہے مراد صاحب۔ آپ کے پاس ایک ایسا پھندا ہے جس میں دوارکا آسانی سے پھنس سکتا ہے۔''

''کیا مطلب؟'' چوہدری نے چونک کر پوچھا۔

میں نے کہا۔ ''موہنی۔''

چوہدری کا منہ کھل گیا اور چہرہ غصے سے سُرخ ہو گیا لیکن پھر دھیرے دھیرے منہ بند ہو گیا اور چہرے کا رنگ بھی واپس آ گیا۔ اُس کی آنکھیں گہری سوچ میں ڈوب گئیں۔ کچھ دیر بعد اس نے کہا۔ ''نہیں تھانیدار! میں یہ خطرہ مول نہیں لے سکتا۔ تمہارا مطلب ہے کہ دوارکا کے لیے موہنی کو چارے کے طور پر پیش کیا جائے......لیکن اس میں نقصان بھی ہو سکتا ہے۔ وہ بدبخت تمہارے اندازوں سے زیادہ ہوشیار اور بے رحم شخص ہے۔''

مجھے خوشی ہوئی کہ چوہدری میری بات سمجھ رہا ہے۔ اس کے خدشے بھی اپنی جگہ درست تھے۔ مجھے پہلے سے معلوم تھا کہ وہ ان خدشوں کا اظہار کرے گا لہٰذا میں پہلے سے تیاری

کر کے آیا تھا۔ میں نے پورے اعتماد کے ساتھ چوہدری کو سمجھانا شروع کیا۔ آخر ایک طویل کوشش کے بعد میں اُسے اپنے ڈھب پر لانے میں کامیاب ہو گیا۔ اُس کے چہرے پر نیم رضامندی کے آثار نظر آنے لگے۔ اُس نے الجھن سے کہا۔

''نواز خان! لیکن یہ سب ہو گا کیسے؟''

میں نے کہا۔ ''چوہدری صاحب! جو کچھ مجھے آپ نے بتایا ہے اور جو باتیں مجھے دوسرے لوگوں سے معلوم ہوئی ہیں اُن سے پتہ چلتا ہے کہ دوارکا سنگھ موہنی کے پیچھے پاگل ہو رہا ہے اور موہنی سے بھی زیادہ وہ اس کی آواز کا عاشق ہے......میں صحیح کہہ رہا ہوں نا؟'' چوہدری نے بے دلی سے اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے کہا۔ ''گاؤں میں بڑے بوڑھوں میں یہ بات بھی مشہور ہے کہ دوارکا نے شہر کی ایک رنڈی کو ایک ہزار روپے کے گہنے انعام میں دیئے تھے۔ صرف اس لیے کہ اس کی آواز موہنی کی آواز سے ملتی تھی......''

چوہدری نے کہا۔ ''ہاں لوگ کہتے تو ہیں لیکن پتہ نہیں اس میں کتنا سچ ہے اور کتنا جھوٹ؟''

میں نے کہا۔ ''چلو یہ تو آپ مانتے ہیں نا کہ دوارکا پرانا پاپی، رنڈی باز اور گانا سننے کا بے حد شوقین ہے۔ اچھا گانا سننے کے لیے وہ دور دور تک پہنچ جاتا ہے۔'' چوہدری نے سر ہلا کر میری ہاں میں ہاں ملائی۔ میں نے کہا۔ ''تو بس ٹھیک ہے۔ دوارکا کے لیے ہم ایک شاندار پھندا تیار کر سکتے ہیں۔''

''وہ کیا؟'' چوہدری نے پوچھا۔

میں نے کہا۔ ''چوہدری صاحب! آپ قانون کی خاطر اور لوگوں کی بھلائی کے لیے چند روز کے واسطے موہنی کو حویلی کی چار دیواری سے باہر نکالیے۔''

چوہدری نے کہا۔ ''کیا مطلب ہے تمہارا۔ میں دوارکا کو للچانے کے لئے اُس بے سہارا کو کھیتوں میں کھلا چھوڑ دوں۔''

میں نے کہا۔ ''میرا یہ مطلب نہیں مراد صاحب......دیکھئے ٹھیک دو روز بعد میلہ شروع ہو رہا ہے۔ اس دفعہ میلے کی منادی کرنے والے یہ منادی بھی کریں گے کہ ناچ گانے کے تھیٹر میں سہتی کی چھوٹی بہن موہنی اپنی آواز کا جادو جگائے گی۔ ایک دفعہ یہ خبر اِردگرد کے دیہات میں پھیل گئی تو مجھے یقین ہے کہ دوارکا سنگھ تک بھی پہنچے گی اور وہ کسی نہ کسی طرح تھیٹر میں پہنچنے کی کوشش کرے گا......ایک دفعہ وہ یہاں آ گیا اور آپ لوگوں نے اُسے پہچان لیا تو میرا دعویٰ

ہے کہ وہ بچ کر نہیں جا سکے گا۔"

میری آواز میں جو پختہ عزم تھا وہ خود میرے اپنے کانوں نے بھی محسوس کیا۔ چوہدری کی آنکھوں میں پہلی بار امید کی ایک کرن چمکی۔ اُس نے حقے کا ایک طویل کش لے کر کہا۔

"نواز خان! مجھے تجھ پر بھروسہ ہے اور بات بھی تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ پھر بھی یہ ایک خطرناک معاملہ ہے۔ ایک طرح سے ہم سوئے ہوئے فتنے کو جگانے کی کوشش کریں گے۔ مجھے اس بارے میں اچھی طرح سوچ سمجھ لینے دو۔"

میں نے پنجابی میں کہا۔ "چوہدری صاحب! سوچیں پیا تے بندا گیا۔ تُسی بس فیصلہ کرو۔"

☆======☆======☆

چوہدری شاہ مراد کا فیصلہ میرے حق میں ہو گیا۔ دو روز بعد ڈھنڈورچی دیہات میں جو منادی کر رہے تھے اُس میں موہنی کا ذکر بھی وضاحت سے موجود تھا......اب میں آپ کو اُس میلے کے بارے میں تھوڑا سا بتا دوں جو ہر سال گاؤں سے باہر شاہ مراد کی زمینوں میں لگتا تھا۔ ایک مجبوری کی وجہ سے میں اس علاقے کا نام ظاہر نہیں کر سکتا لیکن کچھ پڑھنے والے جان جائیں گے کہ یہ کس جگہ کی بات ہے۔ یہ میلہ "میلہ فردوسی" کے نام سے مشہور تھا۔ اس کا آغاز شاہ مراد نے ہی کوئی دس سال پہلے کرایا تھا جب تک شاہ مراد زندہ رہا یہ میلہ دھوم دھام سے ہوتا رہا۔ آخر کوئی تیس سال بعد جب شاہ مراد فوت ہوا تو میلے کا زور بھی ٹوٹ گیا اور پھر دھیرے دھیرے یہ ختم ہو گیا۔

"میلہ فردوسی" اردگرد کے موضعات میں جشن کی طرح منایا جاتا تھا۔ کئی روز پہلے سے مٹھائیوں کی دکانیں سج جاتی تھیں اور جھولے وغیرہ لگ جاتے تھے۔ گزرنے والے ہر دن کے ساتھ میلے کی رونق بڑھتی جاتی تھی۔ اردگرد کے دیہات سے لوگ ٹولیوں کی صورت میلے میں شریک ہونے آتے تھے۔ یہاں تک کہ امرتسر اور جالندھر سے بھی شوقینوں کے قافلے پہنچتے تھے۔ دور دور سے طوائفیں اور گانے والیاں بلائی جاتی تھیں۔ قوالوں کو خاص طور پر دعوت دی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ بازی گر، میراثی، بھانڈ، پہلوان، گھڑ سوار اور نیزہ باز بھی دور دور کے دیہات سے شرکت کے لیے آتے تھے۔ شاہ مراد نے میلے کا انتظام نہایت سلیقے سے کر رکھا تھا۔ ہر کھیل تماشے کے لیے علیحدہ پنڈال تھا اور نظم و نسبق برقرار رکھنے کے لیے چوہدری کے مسلح آدمی آٹھوں پہر گشت کرتے تھے۔

میلے کے آخری روز مختلف کھیلوں کے زبردست مقابلے ہوتے تھے اور شاہ مراد اپنے ہاتھوں سے جوانوں میں انعام تقسیم کرتا تھا۔ میلے کے آخری روز ہی پیر فردوسی شاہ کے مزار پر پنکھا چڑھانے کی رسم ادا ہوتی تھی اور ایک بہت بڑا جلوس شاندار پنکھے کے ساتھ مزار پر حاضری دیتا تھا۔ اس جلوس کی قیادت شاہ مراد خود کیا کرتا تھا۔ قصہ مختصر اس سات روزہ میلے میں کھیل تماشے، راگ رنگ، خدا خوفی اور عیش و عشرت سب کچھ موجود ہوتا تھا اور یہ سب کچھ ایسا شاندار ہوتا تھا کہ دیکھنے والا مدتوں بھول نہیں سکتا تھا۔

آخر میلے کا آغاز ہو گیا۔ راگ رنگ کے تھیٹر میں موہنی بھی دوسرے فن کاروں کے ساتھ اپنی آواز کا جادو جگانے لگی۔ میں نے میلے کے دوسرے روز اُس کا گانا سنا۔ چند لوک گیتوں اور ایک زبردست بھنگڑے کے بعد موہنی کی باری آئی تو تماشائیوں نے جوش و خروش سے اُس کا استقبال کیا۔ اُس نے اپنی شوخ آنکھیں مٹکا مٹکا کر پیتل کی گڑوی بجانا شروع کر دی اور ایک دل موہ لینے والا ماہیا سنایا۔ پورا پنڈال جھومنے لگا۔ لوگ فرمائش کرنے لگے۔ کوئی ایک گھنٹے بعد وہ بمشکل جان چھڑا کر جا سکی۔

میں نے ایسا انتظام کیا تھا کہ پنڈال کے اندر اور باہر ہر وقت کم از کم دس پولیس والے موجود رہتے تھے۔ یہ سارا عملہ سادہ لباس میں تھا۔ اُن میں دو اے ایس آئی بھی تھے اور اُن کے پاس ریوالور تھے۔ باقیوں کے پاس لاٹھیاں اور برچھیاں وغیرہ ہوتی تھیں۔ میں موہنی کی جان اور عزت کے لیے ہرگز کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا اور اگر ایسا کچھ ہو جاتا تو میں خود کو کبھی معاف نہ کر سکتا۔

دوسرے روز جب وہ میلے میں گانا سنا کر واپس حویلی پہنچی تو میں بھی حویلی چلا گیا۔ چوہدری گھر میں موجود نہیں تھا۔ حویلی کے پچھواڑے کچے احاطوں میں ملازموں کے کمرے تھے۔ ان ہی میں سے ایک کمرہ موہنی کا بھی تھا۔ موہنی اب مجھ سے کافی بے تکلف ہو چکی تھی۔ میں سیدھا اُس کے کمرے میں چلا گیا۔ دروازہ کھٹکھٹایا تو وہ خود ہی باہر نکلی۔ اُس نے تھیٹر والا لباس بدل لیا تھا اور اب سیدھے سادے کپڑوں میں بڑی معصوم سی نظر آ رہی تھی۔ مجھے اندر لے جا کر اُس نے چارپائی پر بٹھایا اور خود بوریہ بچھا کر نیچے فرش پر بیٹھ گئی۔

"صیب جی! آج آپ پہلی بار میرے "گریب خانے" پر آئے ہیں۔ بتائیں کیا کھدمت کروں؟"

میں نے کہا۔ "جو کچھ تم کر رہی ہو اس سے بڑی خدمت اور کیا ہو سکتی ہے۔ اگر تمہاری

کوشش سے دوارکا سنگھ پکڑا گیا تو یقین کرو ایک خلقت تمہیں دعائیں دے گی۔''

وہ ننھی سی ناک چڑھا کر بولی۔ ''صیب جی! میرے بس میں ہو ناں تو گردن میں دانت مار کر خون پی جاؤں اُس شیطان کا۔ میری بس ایک ہی آرجو (آرزو) ہے۔ جب آپ اسے پکڑ لیں اور تھانے میں لے جا کر اس کی ٹھکائی کریں تو مجھے جرور وہاں بلائیں۔ جب وہ چیخیں مارے گا تو قسم سے بڑا مجا آئے گا مجھے......''

میں نے کہا۔ ''ضرور بلائیں گے موہنی ضرور بلائیں گے وقت تو آنے دو......'' اچانک میری نگاہ کھونٹی پر لٹکتی ہوئی ایک قمیص پر پڑی۔ میں پہچان گیا۔ یہ وہی کُرتہ تھا جو چند روز پہلے میں نے موہنی کو فارم میں دیا تھا۔ موہنی نے اس کُرتے کو دھو کر بڑے سلیقے سے کھونٹی پر لٹکا رکھا تھا۔ میں نے یونہی پوچھا۔

''موہنی اس کمرے میں تیرے ساتھ......کوئی مرد بھی رہتا ہے؟''

وہ جھینپ کر بولی۔ ''نہیں تو......میرے ساتھ کون رہے گا۔ بس ایک رام پیاری رہتی ہے۔ وہ حویلی میں کھانا وغیرہ پکاتی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''تو پھر یہ کھونٹی پر کُرتہ کس کا ہے؟''

اس نے چونک کر کھونٹی کی طرف دیکھا۔ پھر ساری بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔ مسکرا کر بولی۔

''صیب جی! یہ اسی کا کُرتہ ہے جس نے مجھے ڈیرے پر شرنگ اور شریفے سے بچایا تھا۔ میری قمیص پھٹ گئی تھی ناں۔ تو اُس نے مجھے یہ کُرتہ دیا تھا۔ بڑا بھلا مانس تھا اور دلیر بھی کھوب تھا۔ وہ نہ ہوتا تو شاید آج میں بھی نہ ہوتی......پتہ نہیں کون تھا؟ کہاں سے آیا تھا؟ میں تو ٹھیک طرح اس کا شکریہ بھی ادا نہ کر سکی۔''

میں دیکھ رہا تھا کہ موہنی کی معصوم آنکھوں میں محبت کا رنگ ہے لیکن یہ کوئی بازاری یا سستی قسم کی محبت نہیں تھی۔ یہ ایسی ہی محبت تھی جو اپنے کسی محسن کے لیے ہو سکتی ہے یا پھر باپ بھائی یا پیارے عزیز کے لیے ہو سکتی ہے۔ میں موہنی کی کیفیت سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ میں نے پوچھا۔

''میرا خیال ہے تُو پھر اُس سے ملنا چاہتی ہے۔''

وہ بے باکی سے بولی۔ ''ملنا تو چاہتی ہوں لیکن میں تو اس کی شکل بھی نہیں پہچانتی۔ اس نے چہرہ منڈاسے میں چھپا رکھا تھا......میں نے آپ کو بتایا تو تھا تھانے میں۔''

میں نے کہا۔ ''ہاں......مجھے یاد آ گیا۔ تم نے بتایا تھا......لیکن بھئی اس کی چال ڈھال

ڈیل ڈول، آواز کوئی تو نشانی ہو گی۔''

وہ بولی۔ ''نشانی سے بھلا کیا پھائدہ ہو گا۔''

میں نے کہا۔ ''فائدہ ہو سکتا ہے۔ کیا پتہ وہ اسی گاؤں کا رہنے والا ہو۔''

وہ بولی۔ ''بس ایک ہی نشانی یاد ہے مجھے۔ اس کے سینے کے بالوں میں دائیں طرف ایک سفید بندیا سی چمک رہی تھی۔ جب اُس نے کُرتہ مجھے دینے کے لیے اتارا تھا تو میری نظر اس بندیا پر پڑی تھی۔''

مجھے موہنی کی بات پر ہنسی آ گئی۔ میں سمجھ رہا تھا کہ وہ سفید بندیا کسے کہہ رہی ہے۔ میرے سینے پر بغل کے پاس گولی کا ایک پرانا نشان تھا۔ اس واقعہ کے بارے میں آپ کو کسی کہانی میں بتا چکا ہوں۔ اس گول نشان پر چونکہ بال نہیں تھے اس لیے وہ فوراً موہنی کی نظر میں آ گیا تھا۔ میں نے ہلکا سا قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

''بہت خوب......اچھی نشانی بتائی ہے تم نے۔ اب تو ایک ہی طریقہ ہے جس کسی پر تمہیں شک ہو اُس کا گریبان پھاڑ کر دیکھ لو، ہو سکتا ہے کبھی نہ کبھی پتہ چل ہی جائے۔''

وہ ہنسی تو اس کے سفید دانت موتیوں کی طرح چمکنے لگے۔ اس وقت دروازے پر آہٹ ہوئی اور چوہدری شاہ مراد کا ایک ملازم جو چوہدری کے مخبر کا کام بھی کرتا تھا۔ اجازت لے کر اندر آ گیا۔ اس نے بتایا کہ کل رات گاؤں سے کوئی تین کوس دور ایک کنوئیں پر کچھ کسانوں نے دوارکا سنگھ کو دیکھا ہے۔ وہ اور اس کے کچھ ساتھی سانڈنیوں پر سوار پانی پینے کے لیے وہاں رکے تھے۔ کسانوں کو پورا یقین ہے کہ وہ دوارکا سنگھ ہی تھا......میرے لیے یہ اطلاع نہایت اہم تھی۔ اس کا مطلب تھا فیصلہ کن مرحلہ قریب آ گیا ہے۔

☆======☆======☆

مخبر کی اطلاع کے بعد ہم مزید چوکس ہو گئے لیکن مسلسل انتظار کے باوجود تین راتوں تک کوئی واقعہ پیش نہیں آیا۔ یہ چوتھی رات یعنی میلے کی چھٹی رات کا واقعہ ہے، ہم تھیٹر کے شامیانے میں موجود تھے۔ پورا پنڈال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ موہنی کی رسیلی آواز کی دھوم اب امرتسر تک پہنچ رہی تھی۔ لوگ اس کی آواز سننے کے لیے کھچے چلے آتے تھے۔ موہنی اپنا دوسرا یا تیسرا گانا گا رہی تھی جب ایک ٹپے پر تماشائیوں نے حلق پھاڑ پھاڑ کر داد دی اور پھر کچھ نوجوان جوش میں بھنگڑا ڈالتے ہوئے لکڑی کے سٹیج پر چڑھ آئے۔ میلے میں لوگ شراب دل کھول کر پیتے تھے اور نشے میں ایسی اُلٹی سیدھی حرکتیں کرتے رہتے تھے۔ میرا خیال تھا یہ بھی کوئی ایسے ہی بدمست نوجوان ہیں اور تھوڑی دیر اچھل کود کر کے نیچے اُتر آئیں گے......

بھنگڑے کی "ہاہو" کے درمیان موہنی کا گانا بھی جاری تھا۔ اچانک پنڈال کے باہر سے چیخ و پکار کی آوازیں آئیں۔

پھر کسی شخص نے باہر سے چلا کر کہا۔ "موت کے کنویں میں آگ لگ گئی۔ بھاگو...... بھاگو۔"

ان چند الفاظ نے بم کے دھماکے کا کام کیا۔ موت کا کنواں تھیٹر کے بالکل ہی پاس تھا۔ لوگ اندھا دھند باہر کی طرف بھاگے۔ اس وقت مجھے بھی ایک دروازے سے بھڑکتے ہوئے شعلے نظر آئے۔ موت کا کنواں جو سارے کا سارا لکڑی کا بنا ہوتا ہے دھڑا دھڑ جل رہا تھا۔ میں بھی لوگوں کے ساتھ باہر کی طرف لپکا لیکن اچانک ایک خیال بجلی کی طرح میرے ذہن میں کوندگیا۔ میں نے اپنے قدم روک لیے اور لوگوں میں راستہ بناتا واپس سٹیج کی طرف بڑھا۔ اس وقت میری نگاہ سٹیج پر پڑی اور وہاں کا منظر دیکھ کر میرا جسم سنسنا اٹھا۔ زبردست چیخ و پکار اور بھگدڑ کے درمیان ایک اور ہی ڈرامہ کھیلا جا رہا تھا۔ تین آدمی موہنی کو بازوؤں سے کھینچتے ہوئے سٹیج کے عقبی دروازے کی طرف لے جا رہے تھے۔ وہ چیخ رہی تھی لیکن اس کی آواز سننے کا ہوش کسی کو نہیں تھا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ لوگ عقبی دروازے میں غائب ہو گئے۔

میں نے اپنا ریوالور نکالا اور لوگوں کو دھکیلتا اور کرسیاں پھلانگتا ہوا ایک بغلی دروازے کی طرف بھاگا۔ بغلی دروازے سے گزر کر جونہی میں تھیٹر کے عقب میں پہنچا مجھے موہنی نظر آئی۔ وہ ایک سیاہ چادر میں لپٹی ایک شخص کے کندھے پر پڑی تھی۔ یہ لمبا تڑنگا شخص گہرے تاریک دھوئیں میں راستہ بناتا ایک طرف بھاگا جا رہا تھا۔ اُس کے عقب میں دو رائفل بردار دیہاتی تھے۔ موہنی کے لٹکتے ہوئے بازو بتا رہے تھے کہ وہ بے ہوش ہو چکی ہے۔ پتہ نہیں وہ خوف کی وجہ سے بے ہوش ہوگئی تھی یا اسے بے ہوش کیا گیا تھا...... یہ لمحے میرے لیے بے حد قیمتی تھے۔ میں چند قدم آگے جا کر گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ پھر میں نے نشانہ باندھ کر لمبے شخص کی پنڈلی پر فائر کیا۔ دھماکہ ہوا اور 38 بور کی گولی سنسناتی ہوئی اُس کے ٹخنے میں گھس گئی۔ وہ لڑکھڑا کر گرا اور کندھے سے موہنی پھسل کر دور جا گری۔ دوسرا تیسرا اور چوتھا فائر میں نے ان دونوں رائفل برداروں پر کیا۔ ان میں سے ایک کی رائفل گر گئی اور دوسرا اپنا بازو پکڑ کر دوہرا ہو گیا۔ فائرنگ کی آواز سن کر میرے سفید پوشوں کو ہوش آیا اور وہ چاروں طرف سے لپکتے ہوئے موقع پر پہنچ گئے۔

جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا، سب کچھ ہماری توقع کے مطابق ہوا تھا۔ لمبا تڑنگا شخص

دوارکا سنگھ تھا اور اُس کے ساتھ پانچ آدمی تھے۔ انہوں نے یکایک خود کو سفید پوشوں کے گھیرے میں دیکھا تو مقابلے پر تیار ہو گئے لیکن ان کی بدقسمتی یہ تھی کہ اُن کا سردار زخمی ہو کر گر چکا تھا اور اُن کی ایک رائفل بھی اندھیرے میں کہیں کھو گئی تھی۔ پھر بھی انہوں نے بڑی بے خوفی سے لاٹھیوں اور برچھیوں سے سفید پوشوں پر حملہ کر دیا۔ اس دوران چوہدری کے مسلح کارندے بھی موقع پر پہنچ گئے۔ چند منٹ دونوں طرف سے خوب لاٹھی چلی۔ ریوالور اور تھری ناٹ تھری کے دس بارہ فائر بھی ہوئے۔ پھر دوارکا کے ساتھی گہرے دھوئیں اور تاریکی سے فائدہ اٹھا کر بھاگ نکلے۔ دوارکا زخمی ہونے کے باوجود بھاگنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن عین اُس وقت جب وہ آدھا گھوڑے پر سوار ہو چکا تھا میں نے اُسے پیچھے سے آدبوچا۔ اُس نے زور مار کر خود کو چھڑانا چاہا۔ میں نے اُسے پوری قوت کے ساتھ گھوڑے سے اٹھا کر زمین پر پٹخ دیا۔ وہ لڑائی کرنے کے موڈ میں تھا لیکن جب اسے میرے ہاتھوں میں ریوالور اور آنکھوں میں درندگی نظر آئی تو سمجھ گیا کہ اس کوشش میں جان جا سکتی ہے۔ اس کی آنکھوں سے چنگاریاں سی پھوٹ رہی تھیں۔ نہایت نفرت کے ساتھ اُس نے زمین پر تھوکا اور بے خوفی سے میری طرف دیکھنے لگا۔ اُس کی حالت کسی ایسے درندے کی تھی جسے آناً فاناً جال میں جکڑ لیا گیا ہو۔ موت کے کنویں سے اٹھنے والے شعلے اُس کے بالوں بھرے چہرے پر منعکس ہو رہے تھے۔

دوارکا کی مشکیں کسنے کے بعد اُسے اُسی وقت تھانے پہنچایا گیا۔ اُس کا ایک ساتھی موقع پر ہی ہلاک ہو گیا تھا جب کہ دوسرا زخمی ہو کر گرفتار ہوا تھا۔ دوارکا کی گرفتاری کی خبر آناً فاناً پورے علاقے میں پھیل گئی۔ میلے میں لگنے والی آگ بجھانے کے بعد پورا گاؤں تھانے کے سامنے جمع ہو گیا۔ یہ لوگ دوارکا اور اس کے مردہ ساتھی کی ایک جھلک دیکھنا چاہتے تھے۔ رات آخری پہر ہم نے بڑی مشکل سے ہجوم کو منتشر کیا اور ایک ٹریکٹر ٹرالی کا انتظام کر کے دوارکا کے زخمی ساتھی کو ہسپتال پہنچایا۔ موہنی اب ہوش میں آچکی تھی اسے تھیٹر سے باہر دوارکا کے ایک ساتھی نے بندوق کا کندا سر پر مار کر بے ہوش کیا تھا۔ سر کے پچھلے حصے پر ضرب آئی تھی۔ تاہم چوٹ خطرناک نہیں تھی۔

چند ہی گھنٹوں میں دوارکا کی گرفتاری کی خبر شہر تک پہنچ گئی اور صبح نو دس بجے تک امرتسر سے ڈی ایس پی اور ایس پی صاحب ہمارے تھانے میں تشریف لے آئے۔ دوارکا کی شناخت ہو گئی تو سب کے چہرے خوشی سے چمک اٹھے۔ ایس پی انگریز تھا۔ اُس نے مجھے دل کھول کر شاباش اور مبارک باد دی اور صاف لفظوں میں کہا کہ اس گرفتاری کا سارا کریڈٹ

صرف اور صرف مجھے جاتا ہے۔ پولیس لائن میں اکثر افسر لوگ اپنے ماتحتوں کی کارکردگی پر چھاپہ مارنے کی کوشش کرتے ہیں مگر انگریز اس معاملے میں بھی اصول پرستی کا مظاہرہ کیا کرتے تھے۔ انگریز ایس پی نے مجھ سے تفتیش و گرفتاری کا سارا احوال سنا اور میری منصوبہ بندی کی تعریف کی۔ میں چاہتا تھا کہ دوارکا کو شہر لے جا کر پوچھ گچھ کی جائے مگر ایس پی صاحب کا خیال مختلف تھا۔ انہوں نے مجھے کہا کہ مجرم کو اپنے پاس ہی رکھوں اور اگر مجھے کوئی خدشہ ہے تو وہ مجرم کی حفاظت کے لیے قریبی تھانے سے اور نفری بھجوا دیں گے۔ اُن کا خیال تھا کہ مجرم کا تعلق چونکہ اسی علاقے سے ہے اس لیے اُس کے خلاف گواہیاں اور ثبوت وغیرہ ڈھونڈنے میں آسانی رہے گی۔

میں نے ایس پی صاحب کی ہدایت پر عمل کیا۔ دوارکا سے پوچھ گچھ کا آغاز ہوا۔ دوارکا کی عمر کوئی اٹھائیس سال تھی عمر کے مقابلے میں وہ صحت مند اور جوان نظر آتا تھا۔ چہرے سے سخت گیری نمایاں تھی۔ اس کی ڈاڑھی نہایت گھنی تھی اور رخسار بھی بالوں میں چھپے ہوئے تھے۔ مفرور ڈاکوؤں جیسی اکڑفوں اس میں بھی تھی۔ یہ اکڑفوں مار پیٹ کے باوجود بھی برقرار رہی۔

دوارکا سنگھ کا منصوبہ اب پوری طرح کھل چکا تھا۔ وہ میلے کے پانچویں روز ہی گاؤں میں پہنچ گیا تھا۔ ظاہر ہے اس کا ارادہ موہنی کا اغوا کرنے کا تھا۔ اُس اغوا کا پروگرام اس نے بڑی ہوشیاری سے بنایا تھا۔ اُسے شک تھا کہ تھیٹر کے اندر چوہدری کے آدمی موہنی کی حفاظت کے لیے موجود ہوں گے اُن کی موجودگی میں اغوا کی یہ کوشش ناکام ہوسکتی تھی۔ لہٰذا اُن کی توجہ ہٹانے کے لیے اس نے عین موقعے پر موت کے کنویں میں آگ لگوادی۔ جب بھگدڑ مچی تو وہ اپنے باقی ساتھیوں کے ساتھ موہنی کو لے اُڑا۔ بعد کے واقعات آپ جانتے ہی ہیں۔

میری پہلی گولی دوارکا سنگھ کا ٹخنہ توڑتی ہوئی نکل گئی تھی۔ زخم گہرا تھا لیکن تیزی سے ٹھیک ہورہا تھا۔ گاؤں کا ڈاکٹر حوالات میں ہی آ کر اس کی پٹی کر جاتا تھا۔ دوارکا سنگھ کو اس زخم کی بالکل پرواہ نہیں تھی۔ ڈاکٹر پٹی کرنے آتا تو وہ اسے گالیاں دیتا۔ زبردستی پٹی بھی کر دی جاتی تو تھوڑی ہی دیر بعد اسے کھول کر پھینک دیتا۔ تھانے کے عملے میں سے بھی وہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتا تھا۔ اُن کے منہ پر انہیں ماں بہن کی گالیاں دیتا تھا اور مار کھا کر بھی باز نہیں آتا تھا۔

ایک روز حوالدار دیوی لال اسے بری طرح پیٹ رہا تھا کہ موہنی تھانے میں داخل

ہوئی۔ پتہ نہیں وہ دوارکا کی چیخ و پکار سن کر پہنچی تھی یا اتفاق سے ہی چلی آئی تھی۔ مجھ سے کہنے لگی۔ ''میں دوارکا کو مار پڑتے دیکھوں گی۔'' اُس کا مطالبہ بچگانہ تھا۔ ملزموں سے تفتیش کرتے وقت پوری رازداری برتی جاتی ہے اور میں خود بھی پسند نہیں کرتا تھا کہ ملزم کی مار پیٹ کا منظر کوئی غیر متعلقہ شخص دیکھے۔ بلکہ میں تو عام حالت میں بھی مار پیٹ کا قائل ہی نہیں تھا۔ موہنی کا مطالبہ میں کیسے پورا کرسکتا تھا۔ میں نے اُسے سمجھا بجھا کر واپس بھیجنا چاہا لیکن وہ اپنی بات پر اڑی رہی۔ میں محسوس کررہا تھا کہ اُس کے دل میں دوارکا کے لیے عداوت ہی عداوت ہے اور بات تھی بھی عداوت کی۔

اُن دونوں بہنوں نے دوارکا کی وجہ سے بہت دکھ جھیلے اور دھکے کھائے تھے۔ شاید اپنی بڑی بہن کی موت کا غم ابھی موہنی کے ذہن میں تازہ تھا اور وہ اپنے دشمن کو مصیبت میں دیکھ کر انتقام کے جذبے کو تسکین پہنچانا چاہتی تھی۔ جب موہنی کا اصرار بڑھا تو میں نے اُسے حوالات میں دوارکا کی ''ٹھکائی'' دیکھنے کی اجازت دے دی۔ وہ میرے ساتھ حوالات میں پہنچی اور دوارکا کو چیختے چلاتے دیکھ کر بچوں کی طرح خوش نظر آنے لگی۔ اُس کی آنکھوں میں عداوت کے ساتھ گہری دلچسپی بھی موجود تھی۔

کچھ دیر وہاں رکنے کے بعد وہ واپس چلی گئی لیکن یہ اُس کی آخری آمد نہیں تھی۔ اگلے چودہ پندرہ روز میں وہ کئی بار تھانے آئی اور دوارکا سنگھ سے پوچھ گچھ کا نظارہ کرتی رہی۔ میں اُسے سختی سے منع بھی نہیں کرسکتا تھا۔ درحقیقت دوارکا کی گرفتاری میں موہنی کی کوششوں کا بڑا دخل تھا۔ ایک طرح سے اُس نے دوارکا کو قانون کے جال میں لانے کے لیے خود کو قربانی کی ''گائے'' بنایا تھا اور نہایت دلیری سے میری ہدایات پر عمل کیا تھا۔

اب اگر وہ اپنے گرفتار کرائے ہوئے مجرم سے پولیس کی تفتیش کا منظر دیکھنا چاہتی تھی تو میں انکار کرکے اس کا دل کیوں توڑتا۔ اُس کی موجودگی سے مجھے ایک فائدہ بھی ہوتا تھا۔ دوارکا سنگھ بے حد اکھڑ مزاج شخص تھا۔ تاہم عورت ذات کی موجودگی میں اُسے اپنی بے عزتی کرانا پسند نہیں تھی اور موہنی کی موجودگی میں وہ کوشش کرتا تھا کہ حوالدار دیوی لال کے ساتھ زیادہ سے زیادہ تعاون کرے۔

ایک دن دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ حوالدار دیوی لال کے علاوہ ایک مسلمان حوالدار مبارک علی بھی تھانے میں موجود تھا۔ وہ دوارکا کے پیدائشی ضلع کا رہنے والا تھا۔ اس لیے اُسے دوارکا سے کچھ ہمدردی بھی تھی۔ اُسے حوالات میں پان سگریٹ بھی لا کر دیا کرتا تھا۔ ایک روز جب دوارکا سے اس کے ساتھیوں کی نشاندہی کرانے کے لیے حوالدار دیوی لال اسے چھتر

سے پیٹ رہا تھا۔ مبارک علی اس سے جھگڑ پڑا۔ اس نے کہا کہ ملزم بے ہوش ہوگیا ہے اس لیے اسے ''ٹارچر'' دینے کا کوئی فائدہ نہیں۔ دیوی لال نے کہا کہ بے ہوش نہیں ہوا، فریب کر رہا ہے۔ مکر کیے پڑا ہے اتفاقاً اس دن موہنی بھی آئی ہوئی تھی۔ اس نے دیوی لال کی حمایت کی تو مبارک علی اُس پر اُلٹ پڑا۔ غرا کر بولا۔

''تُو یہاں آم لینے آئی ہے۔ بھاگ یہاں سے۔ یہ مرگیا تو تیرا باپ بھرے گا اسے۔''

موہنی بھی کم نہیں تھی۔ اس نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

جھگڑے کی آواز سن کر میں حوالات میں پہنچا تو موہنی اور مبارک علی دونوں لال بھبھوکے ہو رہے تھے۔ میں نے بمشکل دونوں کو رام کیا اور مبارک علی کو ڈانٹ ڈپٹ کر باہر بھیج دیا۔

☆======☆======☆

آٹھ دس روز مزید گزر گئے۔ مختلف کیسوں کے سلسلے میں دوارکا سنگھ سے پوچھ گچھ جاری رہی۔ بعض مجبوریوں کے تحت ابھی تک ہم نے دوارکا کی گرفتاری کاغذوں میں نہیں دکھائی تھی۔

یہ تمام تفتیش بھی ریمانڈ وغیرہ کے بغیر ہی ہو رہی تھی۔ مگر اب اس معاملے کو مزید لٹکایا نہیں جاسکتا تھا۔ ملزم کو عدالت میں پیش کرنا ضروری تھا۔ ان آٹھ دس دنوں میں صرف ایک اہم واقعہ ہوا۔ دوارکا کا وہ ساتھی جو میلے والے واقعے میں زخمی ہوا تھا امرتسر ہسپتال میں چل بسا۔

ایک دوسرا واقعہ بھی پیش آیا جو اس کیس میں زیادہ اہم نہیں تھا لیکن اُس کا ذکر ضروری ہے۔ موت کے کنویں میں بھڑکنے والی آگ اردگرد کے شامیانوں تک بھی پھیل گئی تھی۔ لوگوں کا کافی نقصان ہوا۔ اسی افراتفری میں سرکس کے چڑیا گھر سے ہاتھی کا ایک کم سن بچہ غائب ہوگیا۔ سرکس والوں نے اس چوری کا الزام اپنے کاروباری رقیبوں پر لگایا۔ یوں راتوں رات دونوں پارٹیوں میں زبردست تصادم ہوا۔ پورا میلہ اجڑ کر رہ گیا اور کئی افراد زخمی ہوئے۔

اب میں اس واقعے کی طرف آتا ہوں جو دوارکا کی گرفتاری کے بیس پچیس روز بعد پیش آیا۔ میں تھانے ہی کے ایک حصے میں رہائش پذیر تھا۔ صبح سویرے حوالدار دیوی لال نے میرا دروازہ کھٹکھٹایا اور یہ پریشان کن خبر دی کہ دوارکا حوالات سے غائب ہے۔ میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی کپڑے بدل کر دیوی لال کے ساتھ بھاگم بھاگ حوالات میں پہنچا۔ خبر سو

فیصد درست تھی۔

حوالات کا پہریدار پریم چند منہ لٹکائے ایک طرف بیٹھا تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ ساری رات کھڑا ہو کر پہرہ دیتا رہا ہے۔ صبح چار بجے کے قریب وہ چند منٹ کے لیے پیشاب کرنے چھت پر گیا۔ واپس آیا تو تالا کھلا ہوا تھا اور دوارکا غائب تھا......دوارکا کا غائب ہونا ایک نہایت سنگین خبر تھی۔ چند لمحوں کے لیے مجھے یوں لگا جیسے کمر ٹوٹ گئی ہے۔ میں نے اسی وقت تھانے کے پورے عملے کو اپنے سامنے حاضر کرلیا۔ رات کو ایک اے ایس آئی کی ڈیوٹی ہوتی تھی۔ وہ مجھ سے بھی زیادہ گھبرایا ہوا تھا۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ ''چار ساڑھے چار کے درمیان وہ کہاں تھا؟'' اُس نے کہا۔

''نواز صاحب! میں اپنے کمرے میں تھا۔ گرمی زیادہ تھی اس لیے کھڑکیاں کھول رکھی تھیں۔ دونوں کانسٹیبل بھی باہر برآمدے میں بیٹھے تھے۔ سنتری گیٹ پر تھا۔ سمجھ نہیں آتی یہ سب کچھ ہوا کیسے ہے؟''

میں نے پوچھا۔ ''تھانے میں کوئی باہر کا آدمی تو موجود نہیں تھا؟''

اُس نے کہا۔ ''نہیں۔'' لیکن پھر فوراً چونک کر بولا۔ ''ہاں یاد آیا۔ تھوڑی دیر پہلے ایک شخص آیا تھا۔ جیون پور کا کوئی کاشتکار تھا۔ کہتا تھا مخالف پارٹی مجھے قتل کی دھمکیاں دے رہی ہے۔ میری حفاظت کی جائے......میں نے اُسے ٹرخا دیا......وہ شخص مجھے کچھ مشکوک سا لگا۔ لگتا تھا کسی چکر میں ہے۔''

میں نے سنتری سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ ''اُس نے مذکورہ شخص کو اے ایس آئی کے کمرے سے نکل کر گیٹ سے باہر جاتے دیکھا تھا۔ اُس نے گرمی میں بھی چادر کی بکل مار رکھی تھی۔''

اے ایس آئی کا کمرہ گیٹ سے نظر نہیں آتا تھا اس لیے مجھے شک ہوا کہ سنتری اپنی غفلت پر پردہ ڈال رہا ہے۔ بہرحال ابھی کچھ یقین سے نہیں کہا جاسکتا تھا۔ عین ممکن تھا کہ یہ حوالات کے پہریدار اور گیٹ کیپر کی کوئی ملی بھگت ہو۔ پیسہ بڑوں بڑوں کا ایمان خراب کردیتا ہے، یہ لوگ تو پھر سو پچاس کے ملازم تھے۔

سب سے اہم بات یہ تھی کہ حوالات کے تالے کو توڑا نہیں گیا تھا بلکہ چابی سے کھولا گیا تھا۔ جیسا کہ پہریدار نے بتایا وہ صرف تین منٹ کے لیے چھت پر گیا تھا۔ اس مختصر وقفے میں ایک مضبوط تالے کو اس کی صحیح چابی لگا کر کھولنا اور فرار ہونا سمجھ میں نہیں آتا تھا......اچانک میرا دھیان مبارک علی کی طرف چلا گیا۔ میں نے اے ایس آئی سے پوچھا۔ ''مبارک علی کہاں

ہے؟''

وہ بولا۔''میں نے اسے پچھلے پہر گشت پر بھیجا تھا......بس اب آنے ہی والا ہوگا۔''

مجھے یاد آیا کہ مبارک علی کے دل میں ملزم کے لیے ایک نرم گوشہ موجود تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ یہ کام مبارک علی کا ہو۔ یا اس کی ملی بھگت سے کیا گیا ہو......تھوڑی ہی دیر میں مبارک علی اور ایک کانسٹیبل گھوڑوں پر سوار پہنچ گئے۔ میں نے مبارک علی سے پوچھ گچھ شروع کی تو وہ کچھ گھبرا گیا۔ اُس کا صفائی پیش کرنے کا انداز ایسا تھا کہ مجھے شک ہونے لگا۔ میں نے سوچا کہ مجھے اپنی تمام تر توجہ مبارک علی پر مرکوز کر دینی چاہیے۔ میں اُسے لے کر ایک علیحدہ کمرے میں چلا گیا۔

☆======☆======☆

اگلے چند روز میرے لیے انتہائی پریشان کن اور اذیت ناک تھے۔ میرے دونوں کندھوں پر جیسے کسی نے دو پہاڑ رکھ دیئے تھے۔ میری حراست سے دوارکا سنگھ کا فرار ہونا کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ میری ساری عزت خاک میں مل رہی تھی۔ وہی ڈی ایس پی اور ایس پی صاحبان جو دو ہفتے پہلے میری تعریفوں کے پُل باندھ رہے تھے اور شاباش دیتے نہیں تھکتے تھے اب افسری کا ڈنڈا لے کر میرے پیچھے پڑے ہوئے تھے۔ کیسے فرار ہوا؟ کیوں فرار ہوا؟ کیسے پکڑا جائے گا؟ کب پکڑا جائے گا؟ ہر گھڑی یہ سوال تیروں کی طرح میرا دل چھید رہے تھے اور ایک لحاظ سے افسروں کا رویہ ٹھیک بھی تھا۔ دوارکا سنگھ جیسے مجرم قسمت سے ہاتھ آتے ہیں اور اُن کا ہاتھ میں آ کر نکل جانا بدقسمتی ہوتا ہے بلکہ بہت سی بدقسمتیوں کا آغاز بھی ہوتا ہے۔ جیسے چیتا شکاری کے وار سے جانبر ہو کر اور خطرناک ہو جاتا ہے ایسے ہی ''ڈاکو حضرات'' جیل توڑ کر اور نڈر ہو جاتے ہیں۔

اُن دنوں مجھے کھانے پینے کا ہوش تھا نہ آرام کا۔ اردگرد کے دیہات میں دن رات دوارکا کو ڈھونڈ رہا تھا۔ جہاں کسی مخبر نے تھوڑا سا بھی سراغ بتایا گھوڑی پکڑی اور پہنچ گیا۔ اپنے تھانے میں سے میرا شک دو افراد پر تھا یعنی حوالات کا پہریدار اور حوالدار مبارک علی۔ تیسرا شخص جیون پور گاؤں کا تھا۔ یہ وہی شخص تھا جو وقوعہ سے کچھ دیر پہلے ''سائل'' بن کر تھانے آیا تھا۔

ایک روز رات کو دیر تک نیند نہ آئی میں نہا دھو کر صبح سویرے تھانے پہنچ گیا۔ ڈیوٹی تبدیل ہو چکی تھی مگر صبح والا عملہ ابھی حاضر باش نہیں ہوا تھا۔ میں یونہی کمرے میں بیٹھ کر دوارکا کے بارے سوچ کے گھوڑے دوڑانے لگا۔ اچانک ایک مخبر بھاگتا ہوا اندر داخل

ہوا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ چوہدری شاہ مراد کے کھیتوں میں ایک آدمی پڑا سو رہا ہے۔ حلیے سے شک ہوتا ہے کہ وہ دوارکا کے ساتھیوں میں سے ہے۔ دوارکا کا ساتھی اور ہمارے گاؤں میں؟ ذہن نہیں مان رہا تھا مگر ملزم کی تلاش میں مارا مارا پھرنے پر ایک ایسا وقت بھی آتا ہے جب وہ معمولی معمولی شک پر بھی کارروائی کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ میرا حال بھی کچھ ایسا ہی ہو رہا تھا۔ میں نے اسی وقت سروس ریوالور لیا اور مخبر کے ساتھ چل پڑا۔

گاؤں سے نکل کر ہم کھیتوں میں پہنچے۔ سورج ابھی طلوع نہیں ہوا تھا۔ ہلکے سے کہرے اور تاریکی نے کھیتوں کے رنگ مدھم کر رکھے تھے۔ ہم پگڈنڈیوں پر چلتے اس جگہ پہنچ گئے جہاں چند ہفتے پہلے ایک شاندار میلہ شروع ہوا تھا۔ اب یہ جگہ ویران پڑی تھی۔ کہیں کہیں بھٹیوں کی کچی اینٹیں بکھری ہوئی تھیں اور مٹی کے ٹوٹے پھوٹے چبوترے نظر آ رہے تھے۔ ایک جانب کوئلے اور لکڑی کے ادھ جلے شہتیروں کا بہت بڑا ڈھیر تھا۔ زمین سے اُس کی اونچائی قریباً پندرہ فٹ تھی۔

یہی وہ موت کا کنواں تھا جس میں چند ہفتے پہلے موٹر سائیکلیں چلتی تھیں اور لوگ جس کے چبوترے پر کھڑے ہو کر تالیاں بجاتے تھے۔ اب وہاں کچھ نہیں تھا......صرف ایک شخص کے پاؤں نظر آ رہے تھے۔ یہ شخص دو شہتیروں پر بن جانے والے قدرتی سائبان کے نیچے سویا پڑا تھا۔ غالباً وہ کہیں سے بہت تھکا ہوا آیا تھا اور اس جگہ کو محفوظ جان کر لیٹ گیا تھا۔ اجالا ہونے کے باوجود ابھی یہ نیند ٹوٹی نہیں تھی۔

میں ملبے کے اندر احتیاط سے قدم رکھتا ہوا چند گز آگے گیا اور اُس شخص کے سرہانے کھڑا ہو کر غور سے اسے دیکھنے لگا۔ وہ شکل سے معمولی چور اچکا لگتا تھا......اچانک مجھے ایک غراہٹ سی سنائی دی۔ یوں لگا جیسے سوئے ہوئے شخص کے حلق سے نکلی ہے لیکن نہیں...... یہ کچھ اندر سے آ رہی تھی۔ ملبے کی گہری تاریکی میں ضرور کچھ تھا میرا ہاتھ خود بخود ریوالور تک پہنچا لیکن اس سے پہلے کہ میں اسے ہولسٹر سے کھینچتا، یکایک تیز آہٹیں سنائی دیں اور پھر خونخوار شکلوں والے دو قد آدم کتے مجھ پر جھپٹے۔ یہ حملہ اتنا اچانک تھا کہ میں پشت کے بل ادھ جلی لکڑیوں پر گرا۔ کتوں نے چند لمحوں میں مجھے بھنبھوڑ کر رکھ دیا۔ میں نے ایک کتے کے سر کا نشانہ لیا اور بے دریغ گولی چلا دی۔ بلڈاگ کے منہ سے ایک ناقابل فہم آواز نکلی اور وہ بل کھا کر ایک طرف لڑھک گیا۔ لکڑی کی ضرب کھانے والا کتا اب سنبھل کر تیار ہو رہا تھا۔ میں نے یکے بعد دیگرے تین گولیاں اُس کے جسم میں بھی اتار دیں اور نیم جان ہو کر زمین

پر لیٹ گیا۔

پشت کے بل گرنے سے میرے سر کے پچھلے حصے میں شدید چوٹ آئی تھی۔ ٹانگوں اور پیٹ پر بھی پنجوں کے زخم تھے۔ قمیص تار تار ہو چکی تھی میں نے لیٹے لیٹے اسے کھینچ کر پھینک دیا۔ دور کھیتوں کی طرف سے لاٹھی بردار دیہاتی بھاگے آ رہے تھے۔ غالباً انہوں نے فائرنگ کی آواز سن لی تھی۔ (بعد میں پتہ چلا کہ یہ کمک میرا بھگوڑا مخبر لے کر آیا تھا) یہ سب لوگ میرے گرد اکٹھے ہو گئے۔ میں اب اٹھ کر لکڑیوں کے سہارے بیٹھ چکا تھا لوگ کبھی میری طرف اور کبھی مُردہ کتوں کی طرف دیکھ رہے تھے۔ یکا یک مجمعے میں میری نگاہ موہنی پر پڑی۔ وہ بڑی عجیب نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں حیرت اور بے یقینی یکجا ہو گئی تھی۔ اس کی نگاہ میرے سینے پر تھی۔ دفعتاً ساری بات میری سمجھ میں آ گئی اور اُس کے ساتھ ہی جسم میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔ میرے جسم پر قمیص نہیں تھی اور گولی کا پرانا نشان نمایاں تھا۔ وہی نشان جو موہنی اُس سے پہلے بھی ایک بار دیکھ چکی تھی ...... چوہدری شاہ مراد کے فارم میں پیش آنے والا واقعہ اب موہنی کے لیے راز نہیں رہا تھا۔

کچھ ہی دیر بعد موہنی کا چہرہ میری نگاہوں سے اوجھل ہو گیا اور دوسرے لوگ میرے اردگرد جمع ہو گئے۔ اُن کی مزاج پُرسی میری تکلیف کو کم نہیں کر رہی تھی لیکن اُس سے ایک طرح کا اطمینان ضرور محسوس ہو رہا تھا وہی اطمینان جو محبت کرنے والے لوگوں کی موجودگی سے محسوس ہوتا ہے۔

جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا کتوں والا نامعلوم شخص ایک قریبی گاؤں ''سکھیا'' کا سانسی تھا۔ وہاں مار پیٹ کی ایک واردات کے بعد وہ یہاں بھاگ آیا تھا۔ اس کا دوارکا سنگھ یا اس کے گروہ سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ نہ ہی وہ جرائم پیشہ تھا۔ اس کا اتنا قصور ضرور تھا کہ وہ دو نہایت خطرناک کتوں کو آزاد لیے پھر رہا تھا۔ اور اس قصور کی اسے قرار واقعی سزا بھی مل گئی تھی۔ وہ دونوں کتوں سے محروم ہو گیا تھا۔ اُسے میرے آدمیوں نے ایک قریبی شمشان گھاٹ سے گرفتار کر لیا اور تھانے لے آئے۔ اُس پر کیس بن سکتا تھا لیکن میں نے پوچھ گچھ کے بعد اُسے معاف کر دیا۔

میرے جسم کے کئی حصے پٹیوں میں جکڑے ہوئے تھے۔ بہر حال میں چلنے پھرنے کے قابل تھا اور کوئی زخم بھی ایسا نہیں تھا کہ مجھے بستر پر لیٹنا پڑتا۔

وہ ایک بڑی سہانی رات تھی۔ آٹھ پہر کی مسلسل بارش کے بعد مطلع صاف تھا اور موسم

خوشگوار، ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ کئی ہفتوں کی سخت گرمی کے بعد موسم کی یہ کروٹ اچھی لگ رہی تھی۔ میں نے درد کم کرنے کے لیے اسپرین کی دو گولیاں نگلیں اور کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گیا۔

اُس وقت آہٹ ہوئی اور سنتری نے آ کر اطلاع دی کہ بی بی موہنی آپ سے ملنا چاہتی ہے۔ میں موہنی کی اس وقت کی آمد پر حیران ہوا۔ تاہم میں نے اُسے اندر بلا لیا۔ وہ ویل کی کڑھائی دار قمیص اور شلوار میں ملبوس تھی۔ جُوڑے میں موتیے کے پھول لگائے ہوئے تھے۔ لگتا تھا کہیں جانے کے لیے تیار ہو کر آئی ہے۔ اس نے میری طرف عجیب نظروں سے دیکھا پھر بولی۔ ''صیب جی! آپ کو مجھ سے چھپانے کی کیا ضرورت تھی...... آپ نے نیکی کا کام کیا تھا کوئی برائی تو نہیں کی تھی۔''

میں نے سوالیہ نظروں سے اُس کی طرف دیکھا۔ اُس نے میرا دیا ہوا کرتہ چادر کی اوٹ سے نکالا اور میری میز پر رکھ دیا۔ ''بہت بہت شکریہ جی۔'' اس نے عجیب معصومیت سے کہا۔ اُس فقرے میں وہ سارے جذبے موجود تھے جو اپنی عزت بچانے والے کے لیے ایک لڑکی کے دل میں موجود ہو سکتے ہیں۔ احسان مندی اور شکریئے کے اظہار کے لیے وہ گھنٹوں بھی بولتی رہتی تو مجھے اس ایک فقرے سے زیادہ متاثر نہ کر سکتی۔

میں نے اخلاقاً کہا۔ '' موہنی۔ اس میں شکریئے والی کون سی بات ہے۔ میں سرکار کی طرف سے محافظ بنایا گیا ہوں تم لوگوں کا۔''

اُس نے جیسے میری بات سنی ہی نہیں تھی۔ کھوئے ہوئے سے لہجے میں بولی۔

''تھانیدار صیب! دوارکا سنگھ کو پکڑو گے؟''

موہنی کے اس ڈرامائی جملے نے مجھے ششدر کر دیا۔ میں نے بے پناہ حیرت سے کہا۔

''کیا کہہ رہی ہو موہنی؟ دوارکا سنگھ کے بارے میں تجھے کیا پتہ؟''

وہ بولی۔ ''صیب جی! میں سب کچھ بتا دوں گی۔ اس وقت جلدی کرو۔ اگر اسے پکڑنا ہے تو میرے ساتھ آؤ۔''

مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی اور نہ ہی موہنی کچھ بتانا چاہتی تھی۔ مجھے اس کی ذہنی حالت پر شک ہو رہا تھا مگر اس کے ساتھ جانے کے سوا چارہ بھی نہیں تھا۔ میں نے دو ہیڈ کانسٹیبل ساتھ لیے اور موہنی کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ میں نے پوچھا۔ ''کہاں جانا ہے؟''

وہ بولی۔ ''نزدیک ہی۔'' وہ ہمیں گاؤں سے باہر لے گئی اور پگڈنڈیوں پر چلتی کوئی چار پانچ فرلانگ آگے آ گئی۔ میرے بار بار پوچھنے پر اس نے بتایا کہ دوارکا سنگھ آج

فردوسی کے مزار کے پچھواڑے بیلے میں کسی سے ملنے آئے گا۔ اُس کی یہ بات مجھے بری طرح چونکا گئی۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ دوارکا سنگھ موہنی سے ملنے آرہا ہو؟ اس سے پہلے کہ میں کسی نتیجے پر پہنچتا ہم فردوسی کے مزار پر پہنچ چکے تھے مزار کے پیچھے درختوں کے گھنے جھنڈ تھے۔

موہنی نے مجھے کہا کہ میں اپنے آدمیوں کو مزار کے پاس ہی چھپا دوں۔ میں نے اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ وہ مجھے ساتھ لے کر گھنے درختوں میں گھس گئی۔ چاروں طرف ہُو کا عالم طاری تھا بس کبھی کبھار ہوا شاخوں سے اٹھکیلیاں کر جاتی تھی۔ موہنی اب بڑی احتیاط سے دبے پاؤں آگے بڑھ رہی تھی۔ اس نے شلوار دونوں طرف سے چٹکیوں میں پکڑ کر اوپر اٹھا رکھی تھی۔ اس کی سفید ننگی پنڈلیاں مدھم چاندنی میں چمک رہی تھیں۔ موہنی کا محتاط انداز دیکھتے ہوئے میرا دل بھی ریوالور نکالنے کو چاہ رہا تھا۔

ایکا ایکی موہنی ٹھٹک گئی۔ میں نے اس کے عقب سے اُس کی نظر کا تعاقب کیا اور دل اچھل کر بے قابو ہو گیا۔ چند گز آگے کیکر کے درختوں تلے ایک سانڈنی کھڑی تھی۔ اُس کے پاس ہی ایک لمبا تڑنگا شخص درخت سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ اس کے ڈیل ڈول سے میں پہچان گیا۔ وہ دوارکا سنگھ ہی تھا۔ موہنی نے مڑ کر معنی خیز نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا اور بڑی احتیاط سے درختوں کا چکر کاٹ کر دوارکا سنگھ کے پہلو میں پہنچ گیا۔

وہ اپنے حال میں مست تھا اور کوئی دوہا گنگنا رہا تھا۔ اُس کا ہتھیار ایک دیسی بندوق تھی جو درخت کی جڑ میں پڑی ہوئی تھی۔ میں جانتا تھا دوارکا کے بندوق سنبھالتے سنبھالتے میرا ریوالور اس کی کنپٹی پر پہنچ جائے گا اور پھر میں نے ایسا ہی کیا۔ لپک کر میں دوارکا کے سامنے آیا۔ اُس نے حیرت سے مجھے دیکھا۔ پھر بے اختیار اپنی بندوق کی طرف بڑھا۔ میں نے ایک قدم بڑھا کر اس کی بندوق کو ٹھوکر ماری وہ برساتی پانی کے ایک چھوٹے سے گڑھے میں جا گری۔ دوارکا سٹپٹا کر میری طرف مڑا تو 38 بور ریوالور کی نال اس کی پیشانی کی طرف اٹھی ہوئی تھی۔ وہ ناچ کر رہ گیا۔ ''بس دوارکا سنگھ۔'' میں نے بے رحم لہجے میں کہا۔ ''آگے بڑھے تو کھوپڑی اُڑا دوں گا۔''

وہ میرے بازو پہلے بھی آزما چکا تھا۔ جب میں نے میلے میں اسے گھوڑے سے اٹھا کر زمین پر پٹخ دیا تھا میرے ریوالور کی گولی بھی اس نے کھائی ہوئی تھی لہٰذا وہ اپنی جگہ بت بنا رہ گیا۔ پھر اُس کی نگاہ درختوں کی طرف اٹھی اور جیسے جم کر رہ گئی۔ میں نے سر گھمائے بغیر نظر

پھیری۔ دوارکا کی نگاہوں کا مرکز موہنی تھی۔ وہ بھی یک ٹک دوارکا کو دیکھ رہی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو مدھم چاندنی میں قیمتی موتیوں کی طرح چمک رہے تھے۔

میں اب اتنا بھی انجان نہیں تھا۔ میں ان آنسوؤں کا مطلب سمجھ رہا تھا۔ بلکہ پوری صورتِ حال میری نظروں کے سامنے تھی۔ میں سوچ رہا تھا یہ عورت بھی کیا چیز ہے۔ اس کے دل کی گہرائی کوئی نہیں جان سکا اور شاید کبھی نہ جان سکے۔ وہ کیا سوچتی ہے اور کس طرح سوچتی ہے، صرف اسی کو معلوم ہوتا ہے ضروری نہیں کہ وہ جس سے نفرت کرتی ہو، جس کے خون کی پیاسی ہو، اس کے لیے دل میں بھی ایسے ہی جذبات رکھتی ہو۔ یا جس کے ساتھ ہنستی بولتی ہو جس سے محبت جتاتی ہو اور جسے زندگی کا ساتھی بنانے پر آمادہ ہو جائے اس سے واقعی محبت کرتی ہو...... ہم سب کا خیال تھا کہ موہنی دوارکا سے شدید نفرت کرتی ہے اور اُس کا تماشا دیکھنے کے لیے تھانے آتی ہے...... اور شاید شروع میں وہ اسی لیے آتی تھی...... لیکن کب اور کس گھڑی اس کے دل کا موسم بدل گیا تھا، ہمیں ہرگز معلوم نہیں ہوا تھا۔ وہ اپنے عاشق سے محبت کرنے لگی تھی۔ خود بھی اس کے رنگ میں رنگی گئی تھی۔ نفرت کے بیج سے محبت کا پودا پھوٹ نکلا تھا۔ بقول شاعر:-

دل کی بستی عجیب بستی ہے
لُوٹنے والے کو ترستی ہے

اب یہ بات بھی یقینی تھی کہ دوارکا کو حوالات سے بھگانے والی موہنی ہی تھی۔ جیسا کہ بعد کی تفتیش سے پتہ چلا اس روز علی الصبح موہنی کھیتوں میں جانے کے لیے نکلی تھی۔ تھانے کے قریب سے گزرتے ہوئے اُس نے ایک کھڑکی سے اندر جھانک کر دیکھا۔ حوالات کا پہریدار ستون سے ٹیک لگائے خراٹے لے رہا تھا۔

وہ کئی دنوں سے ایسے ہی موقع کی تلاش میں تھی۔ وہ چکر کاٹ کر تھانے کی عقبی چار دیواری سے اندر داخل ہوئی اور اے ایس آئی کی نگاہ بچاتی ہوئی حوالات کی طرف چلی گئی۔ پہریدار سے اس کی تھوڑی سی بے تکلفی بھی تھی۔ اس بے تکلفی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اُس نے اُس کی جیب میں ہاتھ ڈال دیا۔ تالے کی چابی اسی جیب میں موجود تھی۔ سوئے ہوئے پہریدار کو پتہ بھی نہ چلا اور موہنی نے چابی نکال کر بے آواز تالا کھول دیا۔ وہ موہنی جسے صرف شوخیاں کرنا آتی تھیں اور جس کی باتوں پر سارا تھانہ ہنستا تھا جب محبت میں گرفتار ہو کر سنجیدہ ہوئی تو کتنا خطرناک کام کر گزری۔

اس نے چند ہی لمحوں میں دوارکا سنگھ جیسے خطرناک مجرم کو قانون کی گرفت سے نکال کر

آزاد فضا میں پہنچا دیا لیکن بات پھر وہیں آتی ہے۔ عورت کا دل ایک گورکھ دھندا ہے کب کیا ہو جائے؟ کسی کو کیا معلوم۔ اس موہنی نے آج دوارکا سنگھ کو گرفتار کرا دیا تھا۔ کیوں؟ اس کا جواب مجھے اچھی طرح معلوم تھا۔ اُس کے دل کا موسم آج ایک بار پھر بدل گیا تھا۔ آج اُس کے دل میں میرے نام کی ہوا چل رہی تھی۔ میں، جس نے اس کی عزت بچائی تھی اور کبھی اس پر احسان نہیں جتایا تھا۔ وہ احسان کے اس بوجھ تلے دبی جا رہی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ میری پریشانیوں کی اصل وجہ کیا ہے؟ اور یہ ''وجہ'' اسی کی پیدا کی ہوئی تھی۔ آج اس نے اپنے محبوب کو گرفتار کرا کے میری پریشانیاں ختم کر دی تھیں اور وہ احسان اتار دیا تھا جو زندگی بھر کے لیے اس کے ضمیر کو بے قرار رکھ سکتا تھا۔

میں دیر تک موہنی اور دوارکا سنگھ کو دیکھتا رہا۔ موہنی آنسو بہا رہی تھی اور دوارکا ہارے ہوئے جواری کی طرح خاموش کھڑا تھا۔ شاید دل ہی دل میں موہنی سے شکوے کر رہا تھا اُن دونوں کے درمیان اب جدائی کی ابدی دیوار حائل ہونے والی تھی۔ اب اُن کے بچھڑے ہوئے ہاتھوں کو کبھی نہیں ملنا تھا۔ اب اُن کے ترسے ہوئے جسموں کو ہمیشہ ایک دوسرے سے دور رہنا تھا۔ محبت کا تیز رفتار سفر ''گرفتاری'' کے اس موڑ پر اچانک ختم ہو گیا تھا۔ موہنی کی ہچکیاں لیتی ہوئی آواز فضا میں ابھری۔ ''صیب جی! اپنے مجرم کو گرفتار کر لو پر میری ''کھاتر'' اسے جیادہ مارنا نہ۔ یہ خود نہیں بھاگا تھا اسے...... اسے میں نے بھگایا تھا۔ اس کے بھاگنے کی سجا مجھے ملنی چاہیے۔''

میں اُن دونوں کو دیکھ رہا تھا اور ذہن تیزی سے کسی فیصلے پر پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اُس گھڑی سب کچھ میرے بس میں تھا۔ میں دوارکا سنگھ کو گرفتار بھی کر سکتا تھا، اسے چھوڑ بھی سکتا تھا اور اسی جگہ گولی بھی مار سکتا تھا۔

نہ جانے کیوں میرا ذہن کہہ رہا تھا کہ دوارکا سنگھ بہت بدل چکا ہے اور اگر اُسے موہنی مل جائے تو اس کی زندگی کا رخ تبدیل ہو سکتا ہے اور اس کا ایک ثبوت یہ بھی تھا کہ پچھلے چھ مہینوں سے اس نے کوئی واردات نہیں کی تھی اور پچھلے دو سالوں سے اس کا نام بہت کم سنا گیا تھا۔ لیکن اگر میں اسے چھوڑ دیتا تو یہ قانون اور انصاف سے بہت زیادتی ہوتی۔ دوسری طرف موہنی کی ہچکیاں میرا دل ہلا رہی تھیں۔

ایک لمحے کے لیے میں نے سوچا۔ کاش میں قانون کا محافظ نہ ہوتا۔ ایک عام سا شخص ہوتا اور دوارکا سنگھ سے نیک چلنی کا وعدہ لے کر اُسے آزاد کر دیتا۔ اس سے کہتا۔ ''موہنی کو لے جاؤ اور اپنی اس سانڈنی پر بیٹھ کر جرم اور سزا کی دنیا سے بہت دور نکل جاؤ۔'' مگر یہ سب

کچھ کرنا میرے بس میں نہیں تھا۔ میں نے دو ہوائی فائر کیے چند ہی لمحوں میں رائفل بردار کانسٹیبل بھاگتے ہوئے موقع پر پہنچ گئے۔ انہوں نے دوارکا سنگھ کو ہتھکڑیاں لگا دیں۔ موہنی نے الوداعی نظروں سے اُس کی طرف دیکھا اور ہچکیاں لیتی ہوئی گاؤں کی طرف بھاگ گئی۔

کوئی ایک مہینہ بعد کی بات ہے دوارکا سنگھ جیل میں پہنچ چکا تھا۔ اُس کا چالان مکمل ہو کر سیشن میں چلا گیا تھا اور کیس کی سماعت شروع ہونے والی تھی۔

ایک روز میں شام کے وقت کھیتوں سے گزرتا ہوا فردوسی کے مزار کی طرف گیا۔ مزار کے پچھواڑے گھنے درختوں میں اچانک مجھے ایک زرد لباس کی جھلک نظر آئی۔ میں نے آگے جا کر دیکھا وہ موہنی تھی۔ ایک کیکر سے ٹیک لگائے وہ خاموش کھڑی تھی۔ اُس کی نظریں شہر کی طرف تھیں جیسے دور کسی کا راستہ دیکھ رہی ہو۔ میں اس کا چہرہ دیکھ کر حیران ہو گیا۔ وہ بہت ہی کمزور نظر آ رہی تھی۔ چہرہ لباس ہی کی طرح زرد ہو رہا تھا اور شوخ آنکھوں میں ویرانیوں نے ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ مجھے دیکھ کر وہ بُری طرح چونکی۔ پھر رخ موڑ کر تیز قدموں سے گاؤں کی طرف چل دی۔

''موہنی۔'' میں نے تحکمانہ لہجے میں آواز دے کر اُسے روکا۔ وہ ذرا سہم کر رک گئی۔ میں اُس کے سامنے پہنچا تو وہ اُلٹے ہاتھ سے اپنے آنسو پونچھ رہی تھی۔ میں نے کہا۔ ''موہنی مجھے معلوم ہے تجھے دوارکا کی گرفتاری کا دکھ ہے۔ شاید تو مجھ سے بھی ناراض ہے لیکن میں تیرے لیے اتنا برا ثابت نہیں ہوا جتنا تو سمجھتی ہے۔ دوارکا ایک ڈکیت تھا پھر بھی میں نے اُس کے لیے وہ سب کچھ کیا ہے جو کر سکتا تھا۔''

موہنی نے پلکیں اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ میں نے کہا۔ ''ہاں موہنی...... میں نے اپنی طرف سے پوری کوشش کی ہے۔ مجھے امید ہے دوارکا کو پھانسی نہیں ہو گی اور اگر اسے اچھے وکیل مل گئے تو ہو سکتا ہے قید بھی زیادہ نہ ہو۔ تو آٹھ دس سال اس کا انتظار کر سکتی ہے نا...... بول کر سکتی ہے نا؟''

موہنی نے پلکیں جھکا لیں۔ دو آنسو اس کے نوخیز رخساروں پر پھسلے اور پنجاب کی شرماں والی باوفا مٹی میں جذب ہو گئے۔ موہنی کے تاثرات نے خاموشی کی زبان میں پکار کر کہا۔

''صیب جی! میں نے اس سے پیار کیا ہے۔ میں زندگی بھر اُس کا انتظار کر سکتی ہوں۔''

میں نے پھر پوچھا۔ ''بول۔ انتظار کر سکتی ہے نا؟''

وہ معصومیت سے بولی۔ ''لیکن صیب جی! چوہدری صاحب تو کہتے ہیں وہ میری

برادری کا کوئی اچھا سالڑکا دیکھ کراسی سال میرا بیاہ کردیں گے۔"

میں نے دیکھا اُس کی ناک کی خوبصورت نتھ جیسے انجانے خوف سے لرز رہی تھی۔ یہی لرزش اُس کی رس بھری آواز میں بھی تھی۔ میٹھے گیت سنانے والی آواز آج روتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ میں نے پورے یقین اوراعتماد کے ساتھ کہا۔

"موہنی! یہ معاملہ تُو مجھ پر چھوڑ دے۔ میں چوہدری مراد سے بات کرلوں گا۔ وہ کبھی تجھے شادی پر مجبور نہیں کرے گا اور جب تک تُو اپنی مرضی سے بیاہ نہیں کرلیتی تجھے حویلی سے بھی نہیں نکالے گا......"

موہنی نے نظر بھر کر میری طرف دیکھا۔ اُس کے آنسوؤں میں احسان مندی کی جھلک بھی تھی۔ شاید وہ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن اسے الفاظ نہیں سوجھ رہے تھے۔ پھر اچانک اس نے رخ پھیرا اور کسی کم سن بچی کی طرح درختوں میں بھاگتی چلی گئی۔

☆======☆======☆

اُس کی گلی میں

ایک مجبور لڑکی کی داستانِ غم، حالات کے جبر نے اسے ایک ایسے شخص کی سیج پر پہنچا دیا تھا جو اس کے ملازموں سے بھی بدتر تھا۔ وہ اس شخص کے پاؤں دبانے جیسی ذلت پر مجبور تھی۔

ساتھ والے کمرے سے چیخ و پکار کی آواز آ رہی تھی۔ انسپکٹر بلراج آج پھر کسی کی کم بختی لے آیا تھا۔ ننگی پیٹھ پر چمڑے کا جوتا کھانے والا ذبح ہوتے ہوئے بکرے کی طرح چیخ رہا تھا۔

''خدا کا واسطہ تھانیدار صاحب! مجھے معاف کردو، آپ کے بچوں کا واسطہ مجھے بخش دو......میرا کوئی قصور نہیں۔''

بلراج نے بھاری بھرکم آواز میں ایک نہایت غلیظ گالی دی اور بولا۔''سیدھی طرح بک دے ورنہ میں تیرے مُردے پر بھی چھتر لگانے سے باز نہیں آؤں گا۔ بول کہاں رکھا ہے چوری کا مال؟''

ملزم کی گھگھیائی ہوئی آواز آئی۔''میرا رب جانتا ہے تھانیدار، میں بے قصور ہوں۔''

بلراج گرج کر کسی سپاہی سے بولا۔''لاؤ اس بد بخت کی ماں اور بہن کو بھی کمرے میں، وہ بھی اس کا حشر دیکھیں۔''

ملزم چیخا۔''خدا کا واسطہ تھانیدار صاحب یہ ظلم نہ کرو میری ماں مر جائے گی۔''

''مر جائے گی تو پھر بتاتا کیوں نہیں۔''

''اچھا بتاتا ہوں تھانیدار، بتاتا ہوں۔''

میں اپنے کمرے میں بیٹھا عموماً انسپکٹر بلراج کی قہر آلود آواز اور ملزموں کی چیخ و پکار سنتا رہتا تھا۔ یہ ایک شہری تھانہ تھا۔ انچارج ایک ڈی ایس پی تھا۔ میرے علاوہ جو دوسرا انسپکٹر یہاں تعینات تھا وہ بلراج تھا۔ بلراج موٹی توند والا اور نہایت سخت گیر چہرے والا ایک روایتی تھانیدار تھا۔ میں نے کئی بار اُس کے منہ سے نکلے ہوئے فقرے کے الفاظ گنے تھے۔ آٹھ الفاظ کا فقرہ ہوتا تھا تو یقین کریں اُس میں چار انتہائی ننگی گالیاں ہوتی تھیں۔ اُس کے نزدیک

ملزم سے پوچھ گچھ کا ایک ہی راستہ تھا۔ اُس کا نام پوچھو نہ کام۔ بس کپڑے اتارو اور فرش پر اوندھا لٹا دو۔ باقی کا کام اس دو فٹ لمبے چمڑے کے ٹکڑے کا ہے جسے لوگ چھتر کہتے ہیں۔ اُسے اذیت دینے کے ایسے ایسے طریقے آتے تھے کہ ہم جیسے پولیس والے بھی دیکھ اور سن کر دنگ رہ جاتے تھے۔ بعض ملزم تو بلراج کی شکل دیکھتے ہی جھوٹے سچے الزام اپنے سر لے لیتے تھے۔ تھا تو وہ میرا ہم پیشہ لیکن حقیقت میں وہ ایک برے پولیس والے کی تمام خصوصیات پر پورا اُترتا تھا۔ جوڑ توڑ کا ماہر، شراب اور عورت کا رسیا اور راشی۔ میرے ساتھ اُس کے تعلقات بس واجی سے تھے۔ مجھے وہ ''باؤ تھانیدار'' کہہ کر پکارتا تھا۔ میں جانتا تھا پیٹھ پیچھے وہ میرا مذاق اُڑانے سے بھی نہیں چُوکتا۔

میں اپنے کمرے میں بیٹھا دیوار کی دوسری طرف ہونے والی گفتگو سن رہا تھا۔ بلراج نے ملزم کو ماں بہن کے سامنے ذلیل کرنے کی دھمکی دی تھی اور وہ چوری بتانے پر تیار ہو گیا تھا۔ مجھے ملزم کے ہانپنے کی آواز اپنے کمرے میں بھی صاف سنائی دے رہی تھی۔

''جلدی بتا۔'' (ایک ننگی گالی) بلراج کی آواز آئی۔

''بتاتا ہوں حضور مجھے ذرا پیشاب کر لینے دیں۔''

''میں کہتا ہوں پہلے بکواس کر۔''

''حضور میں......میں......بہت سخت آیا ہے۔''

''اوئے کرم داد۔'' بلراج کی آواز آئی۔''جا اسے مُوت کرا کے لا۔''

میں بڑے غور سے یہ گفتگو سن رہا تھا۔ ملزم کے آخری فقرے میں نہ جانے کیا بات محسوس ہوئی کہ میں چونک سا گیا۔ کچھ عجیب سا پُر سکون سا لہجہ تھا اُس کا۔ پھر میں نے اپنے کمرے کی چق سے دیکھا، دو سپاہی ملزم کو سہارا دے کر پیشاب خانے کی طرف لے جا رہے تھے۔ بے چارے کی حالت بڑی پتلی دکھائی دیتی تھی۔ میں فارغ بیٹھا تھا۔ یونہی ٹہلتا ہوا باہر آ گیا۔ سردیوں کے دن تھے شام ہونے والی تھی۔ تھانے کا محرر میرے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ اچانک مجھے چھت پر دھما چوکڑی کی آوازیں آئیں، ابھی چند لمحے پہلے ملزم کو پیشاب کرانے چھت پر لے جایا گیا تھا اور اب یوں لگ رہا تھا جیسے اوپر کوئی کشتی ہو رہی ہے۔

مجھے کسی خطرے کا احساس ہوا اور میں سیڑھیوں کی طرف لپکا، تھانے کی عمارت کافی پرانی تھی، چھت کوئی بیس فٹ اونچی رہی ہوگی۔ میں دو دو سیڑھیاں پھلانگتا چھت پر آیا، محرر میرے پیچھے تھا۔ جونہی چھت پر پہنچا میں نے ملزم کو پرلی جانب بھاگتے دیکھا۔ ایک سپاہی زمین پر گرا تھا جب کہ دوسرا ملزم کے تعاقب میں تھا۔ میں فوراً سمجھ گیا کہ ملزم کیا چاہتا ہے وہ

چھت سے چھلانگ لگانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ میں پوری رفتار سے اُس کے پیچھے لپکا۔ ملزم منڈیر سے کوئی بیس گز کے فاصلے پر تھا میرا اور اُس کا درمیانی فاصلہ دس فٹ کے قریب تھا۔ عین اُس وقت جب وہ منڈیر پر پہنچ چکا تھا، میں نے اسے چھاپ لیا۔ ہم اوپر نیچے گرے اور تھوڑا سا لڑھک کر عین منڈیر کے اوپر پہنچ گئے۔ بیس فٹ نیچے سڑک پر آمدورفت جاری تھی کچھ لوگوں نے چونک کر اوپر دیکھا۔ میں ملزم کو گھسیٹتا ہوا منڈیر سے پیچھے لے آیا۔ وہ بری طرح چلا رہا تھا۔ ''چھوڑ دو مجھے چھوڑ دو، مرجانے دو مجھے۔''

اُس کے چہرے پر دیوانگی طاری تھی۔ میں نے اسے اڑنگا لگا کر چھت پر گرا دیا۔ محرر اور دونوں سپاہیوں نے اسے دبوچ لیا وہ خود کو چھڑانے کے لیے دیوانہ وار زور لگا رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے سڑک پر اور چھت پر مجمع لگ گیا۔ راہگیر بڑی دلچسپی سے تھانے کی چھت پر ہونے والا تماشا دیکھ رہے تھے۔ سپاہیوں نے چیختے چلاتے ملزم کی ٹانگیں اور بازو پکڑے اور اسے نیچے لے آئے۔

انسپکٹر بلراج ہمیشہ سے زیادہ آگ بگولہ نظر آرہا تھا۔ پہلے تو اُس نے ملزم کو لے جانے والے سپاہیوں کو تھپڑ مارے پھر ملزم پر پل پڑا۔ اپنی بیلٹ اتار کر اُس نے ملزم کو اتنی بے دردی سے پیٹا کہ اسے غش آگیا۔ ملزم کی بہن اور ماں جو بلراج کے دفتر میں بیٹھی تھیں شور سن کر باہر نکلیں۔ جب انہوں نے ملزم کی حالت دیکھی تو چیختی ہوئی بلراج کے قدموں میں گر پڑیں لیکن بلراج کے ہاتھ رکنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ وہ غش کھاتے ہوئے ملزم کو بھی مارے جا رہا تھا۔ اس وقت مجھ سے برداشت نہ ہوا۔ میں آگے بڑھا اور بلراج کا اٹھا ہوا ہاتھ تھام لیا۔ اُس نے سرخ آنکھوں سے مجھے گھورا۔

''پیچھے ہٹ جاؤ نواز۔''

''بس کر بلراج۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ''اسے قتل ہی کرنا ہے تو اندر لے جا۔ وہ دیکھ تھانے کے گیٹ پر لوگ اکٹھے ہو رہے ہیں۔''

''تھانے کو آگ نہیں لگا دیں گے لوگ۔'' وہ غصے سے پھنکارا۔ پھر لوگوں کی ماں بہن ایک کرتا اپنے کمرے میں چلا گیا۔

☆======☆======☆

ملزم کا نام ولایت علی تھا وہ اسی شہر کا رہنے والا تھا۔ اُس کی ماں اور بہن بار بار میرے سامنے ہاتھ جوڑ رہی تھیں۔ بڑھیا دہائی دے رہی تھی کہ اُس کا بیٹا بے گناہ ہے، اس طرح کا الزام اُس پر کبھی نہیں لگا، وغیرہ وغیرہ۔ بہرحال یہ عام باتیں تھیں، ملزم کے لواحقین تھانوں

میں ایسے ہی دعوے کیا کرتے ہیں۔ میں نے بڑھیا اور اُس کی بیٹی سے کہا کہ وہ میرے کمرے میں نہ بیٹھیں اس طرح ان کا کیس اور خراب ہو جائے گا لیکن وہ دونوں شاید مجھے ہی ''ڈی آئی جی'' سمجھے ہوئے تھیں۔ بڑھیا نے زاروقطار روتے ہوئے بتایا کہ وہ اور اُس کی بیٹی لوگوں کے گھروں میں برتن مانجھ کر گزارا کرتی ہیں۔ یہ لڑکا مڈل پاس ہے اور آج کل نوکری کی تلاش میں ہے اُس کے بڑے بھائی علیحدہ رہتے ہیں۔ بڑھیا نے کہا۔

''میرا خاوند ایک پاؤں سے معذور ہے اور بیمار رہتا ہے۔ وکیل نے اسے بتایا تھا کہ اگر 500 روپے کا بندوبست ہو جائے تو تمہارے بیٹے کی ضمانت ہو سکتی ہے۔ میں نے بیٹی کے بیاہ کے لیے بڑی مشکلوں سے تھوڑا سا زیور بنایا تھا۔ وہ بیچ کر بھی صرف 400 روپیہ اکٹھا ہو سکا۔ میرا خاوند تین روز تک مسلسل روڑی کوٹتا رہا۔ اُس کے اسے 50 روپے ملے۔ 50 روپے ایک خداترس سے ادھار لے کر ہم یہاں آئے لیکن پتہ چلا کہ ابھی ولایت کی ضمانت نہیں ہو سکتی۔ جو کچھ ہمارے پاس تھا، تھانیدار کو دے دیا لیکن وہ 500 روپیہ اور مانگتا ہے۔ بتاؤ بیٹا ہم اور پیسے کہاں سے لائیں۔ اب تو ہماری جانیں ہی ہیں کہیں بک سکتی ہیں تو بیچ دو۔''

بڑھیا بلک بلک کر رو رہی تھی اور دوسری طرف بلراج ایک بار پھر ولایت سے پوچھ گچھ کرنے کی تیاری کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے اُس کی ہدایت پر ولایت علی ولد محمد بوٹا کے خلاف حوالات سے فرار کی کوشش اور پولیس ملازمین کو زدوکوب کرنے کے الزام میں پرچہ درج ہو چکا تھا۔ حالانکہ میرے خیال میں اگر ملزم سے بہت سختی بھی کی جاتی تو اقدام خودکشی کا پرچہ درج ہونا چاہیے تھا۔ میں سب کچھ دیکھ اور سن رہا تھا لیکن جانتا تھا کہ اگر میری طرف سے اس معاملے میں مداخلت ہوئی اور بلراج آگ بگولہ ہو گیا تو جھگڑا ہو جائے گا۔

اب تک ولایت کی ماں اور بہن نے جو باتیں مجھے بتائی تھیں ان سے بظاہر یوں لگتا تھا کہ ولایت کو کسی چکر میں پھنسایا گیا تھا۔ ایسا چکر جس نے اسے زندگی تک سے بیزار کر دیا ہے۔ انسپکٹر بلراج یہی رٹ لگا رہا تھا کہ ملزم نے فرار ہونے کی کوشش کی ہے جب کہ ایک عام سوجھ بوجھ کا شخص بھی سمجھ سکتا تھا کہ بیس فٹ اونچی چھت سے پختہ سڑک پر گر کر ہاتھ پاؤں کا سلامت رہنا ہی بڑی بات تھی فرار ہونا تو دور کی چیز ہے۔ پھر میں نے ملزم کو خود چھت سے پکڑا تھا۔ اُس کا رویہ یقیناً ایک خودکشی کرنے والے کا تھا۔ ''مجھے مرجانے دو...... مرجانے دو۔'' اُس کے یہ الفاظ ابھی تک میرے کانوں میں گونج رہے تھے۔

عام طور پر پولیس والے خواہ مخواہ کے جھنجھٹ میں نہیں پڑتے، لیکن ولایت علی کا جھنجھٹ ایسا تھا جسے میں نے خود قبول کیا۔ ہوا یوں کہ جب ولایت علی کو پھر مار پڑنا شروع

ہوئی اور اُس کی ماں بہن نے میرے کمرے میں رونا چلانا شروع کیا تو میں اٹھ کر بلراج کے پاس گیا اُس نے ملزم کو چھت سے الٹا لٹکا رکھا تھا۔ میں نے بلراج کو ایک طرف لے جا کر کہا۔

''دیکھ یار! ابھی دو گھنٹے پہلے کتنا بڑا حادثہ ہونے والا تھا۔ اگر یہ مر جاتا تو ہم سب مصیبت میں پڑ جاتے۔ کہیں اب پھر یہ کوئی ایسی حرکت نہ کر دے میرا خیال ہے اسے آج کی رات سوچنے کا موقع دو۔''

وہ تنک کر بولا۔

''ایک تو باؤ یار! میں تجھ سے بڑا تنگ ہوں۔ ہر چور اُچکے کا ماما بن جاتا ہے تُو۔''

مجھے اُس کے لہجے پر اتنا طیش آیا کہ میرا ہاتھ اٹھتے اٹھتے رہ گیا۔ مجھے اس تھانے میں آئے ابھی مہینہ ڈیڑھ ہوا تھا اور بلراج میرے مزاج سے واقف نہیں تھا۔ یہاں صرف ایک شخص تھا جو مجھے اچھی طرح سمجھتا تھا اور وہ تھا یہاں کا انچارج ڈی ایس پی عطاء اللہ خان۔ میں ایک لفظ کہے بغیر بلراج کے پاس سے چلا آیا۔ اپنے کمرے میں پہنچا تو بڑھیا بے ہوش ہو چکی تھی۔ اُس کے دانت مضبوطی سے ایک دوسرے پر جمے ہوئے تھے اور ہاتھ پاؤں مڑ گئے تھے۔ پنجابی میں اسے ''دندن پڑنا'' کہتے ہیں۔ اُس کی جواں سال بیٹی ماں کا سر گود میں رکھے زاروقطار رو رہی تھی۔ اُس کے لمبے سیاہ بال ماں کے سفید بالوں سے چھو رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر وہ جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی اور ہچکیاں لیتے ہوئے بولی۔

''تھانیدار صاحب! میری ماں اور بھائی کو بچا لیجئے۔ آپ جو بھی کہیں میں کرنے کو تیار ہوں۔ مجھے جہاں کہیں میں چلی جاؤں گی۔''

میں ایک لمحے کے لیے سناٹے میں آ گیا۔ تو معاملہ یہاں تک پہنچا ہوا تھا۔ میں نے ایک نظر غور سے لڑکی کو دیکھا، بمشکل انیس بیس سال کی ہو گی۔ شکل گو زیادہ خوبصورت نہیں تھی لیکن جسم پُرکشش تھا۔ اُس نے نہایت بوسیدہ سے کپڑے پہن رکھے تھے، پاؤں سے ننگی تھی۔ میرے کانوں میں اُس کے الفاظ نشتر چبھو رہے تھے۔ ''تھانیدار صاحب! آپ جہاں بھی کہیں میں چلی جاؤں گی۔''

میں نے اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا کسی نے تم سے کہیں چلنے کو کہا تھا؟''

''جی ہاں...... کل اُس لمبے سپاہی نے کہا تھا کہ تھانیدار سے گھر چل کر بات کرو وہاں وہ تمہاری بات سن لے گا۔''

''پھر تم وہاں گئیں؟''

''جج...... جی ہاں!'' لڑکی کے منہ سے نکلا۔ میرا دماغ چکرا رہا تھا۔

''پھر کیا ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

لڑکی نے میلی کچیلی چادر سے آنسو پونچھے اور بولی۔

''میں اور ماں دونوں سپاہی کے ساتھ گئی تھیں لیکن وہ ہمیں تھانیدار صاحب کے بجائے اپنے گھر لے گیا۔ اُس نے ہمیں بہت ڈرایا دھمکایا اور کہا کہ تمہارے آدمی پر قتل کا کیس بھی پڑ جائے گا۔''

''پھر؟''

''پھر اُس نے کہا کہ میں تھانیدار صاحب سے کہہ کر ولایت کی ضمانت کرا سکتا ہوں...... دراصل...... دراصل اس کی نیت خراب تھی۔ وہ مجھے بڑی بری نظروں سے دیکھ رہا تھا پھر اُس نے میری ماں کو باہر بھیجنے کے لیے بہانہ بنایا۔ اسے ایک فارم دے کر کہنے لگا کہ ڈاکخانے سے اس پر ٹکٹیں لگوا لاؤ۔ میری ماں کو شک ہو گیا۔ جونہی وہ کسی کام سے دوسرے کمرے میں گیا، ماں مجھے ساتھ لے کر باہر نکل آئی۔ ہم نے کسی سے اس بات کا ذکر نہیں کیا پھر بھی آج میرے بھائی پر اتنی سختی ہوئی ہے اگر ہم بتا دیتیں تو پتہ نہیں کیا ہوتا۔''

لڑکی کی آنکھیں جو رونے سے اور بھی شفاف ہو چکی تھیں لگاتار آنسو بہا رہی تھیں۔ لمبے سپاہی کا اشارہ میں اچھی طرح سمجھ گیا تھا وہ بلراج کا ہیڈ کانسٹیبل عنایت مسیح تھا۔ میں نے بڑھیا کی طرف دیکھا اسے اب ہوش آ گیا تھا۔ میرے ہیڈ کانسٹیبل خوشی محمد نے اسے عقب سے سہارا دے رکھا تھا۔ وہ بار بار کہہ رہی تھی۔ ''ہائے میرا بچہ۔ وہ میرے بچے کو مار دے گا۔ خدا کے لیے کوئی اسے بچائے۔''

میں نے عورت کو تسلی و تشفی دے کر چپ کرایا۔ پھر میں نے ایک فیصلہ کیا اور تیز قدموں سے ڈی ایس پی صاحب کے کمرے کی طرف چل دیا۔ سیلوٹ کر کے میں نے ان کے سامنے کرسی سنبھالی۔ وہ چھت پر پیش آنے والے واقعے کے بارے میں تفصیلات معلوم کرنے لگے۔ میں نے بلراج کے خلاف کوئی بات نہیں کی جب گفتگو کا سلسلہ ختم ہوا تو میں نے عطاء صاحب سے کہا۔

''جناب میں چاہتا ہوں کہ اس لڑکے ولایت کا کیس میں ہینڈل کروں...... بلراج صاحب آج کل خاصے مصروف ہیں اور میرے خیال میں یہ کیس کافی وقت اور توجہ مانگتا ہے۔''

''تو تمہارا مطلب ہے بلراج پوری توجہ نہیں دیتا؟'' ڈی ایس پی کا لہجہ کچھ بدلا سا تھا۔

''نہیں جناب، میں نے توجہ کے ساتھ ''وقت'' کا لفظ بھی استعمال کیا ہے۔ ان کے پاس اتنا وقت نہیں، جو میں سمجھتا ہوں اس کیس کے لیے ضروری ہے۔''

''بھئی یہ تو ایک سیدھا سادا معاملہ ہے۔ تم خواہ مخواہ پریشان ہو رہے ہو، اس قسم کی باتوں سے سٹاف میں بددلی پھیلتی ہے۔''

مجھے ڈی ایس پی سے اس قسم کے جوابات کی توقع نہیں تھی۔ میرا شک یقین میں بدل گیا کہ جب میں ملزم کی بہن سے باتیں کر رہا تھا۔ بلراج آ کر ڈی ایس پی سے مل گیا تھا۔ دیرینہ ساتھ کی وجہ سے ان دونوں میں گہرے تعلقات تھے، لیکن ڈی ایس پی کا رویہ مجھ سے اب تک مہربانہ رہا تھا۔ وہ میرے سابقہ ریکارڈ سے بخوبی واقف تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ وہ بخوشی مجھے تفتیش کی اجازت دے دیں گے لیکن لگتا تھا بلراج اس معاملے کو انا کا مسئلہ بنا رہا ہے۔ اگر میں ڈی ایس پی سے بحث کرتا تو ممکن تھا وہ بھی ایسا ہی سمجھنے لگتے۔

ابھی میں اٹھنے کی تیاری کر ہی رہا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی، دوسری طرف یقیناً کوئی اعلیٰ افسر تھا۔ شاید ایس ایس پی صاحب تھے۔ ڈی ایس پی کا لہجہ مؤدبانہ ہو گیا۔ وہ قریباً دس منٹ تک گفتگو کرتے رہے۔ اس گفتگو سے میں نے جو اندازہ لگایا وہ یہ تھا جب چھت پر ملزم اور تھانے کے عملے کے درمیان کشمکش ہو رہی تھی سڑک پر بہت سے لوگ جمع ہو گئے تھے۔ لوگوں کے جمع ہونے سے کچھ دیر کے لیے ٹریفک بھی رک گئی تھی۔ اُس جام ٹریفک میں ایک گاڑی کسی صوبائی وزیر کی تھی۔ وزیر کی گاڑی کے ساتھ ایک جیپ میں پریس کے نمائندے بھی تھے۔ ان لوگوں نے جیپ کی چھت پر کھڑے ہو کر چھت پر ہونے والی ہاتھا پائی کی تصویریں بنائی تھیں۔ وزیر صاحب نے بھی سارا معاملہ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اب وہ متعلقہ حکام پر سخت برہم تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ اس تھانے میں پہلے بھی ایک دو واقعات ایسے ہو چکے ہیں۔ (بلکہ ایک واقعہ خود میری تعیناتی کے دوران ہوا تھا ایک حوالاتی نے بجلی کا بلب توڑ کر چبا لیا تھا بعد میں ہسپتال میں بمشکل اُس کی جان بچائی جا سکی تھی) انہوں نے پولیس کے اعلیٰ حکام کو ہدایت کی تھی کہ اس واقعے کے اسباب کا کھوج لگائیں اور اگر کسی پولیس اہلکار نے اختیارات سے تجاوز کیا ہے تو اُسے سزا دی جائے۔ اب ایس ایس پی صاحب نے ڈی ایس پی سے فوراً اس کیس کی تفصیلات مانگی تھیں۔ ٹیلی فون رکھ کر عطاء صاحب نے پیشانی سے پسینہ پونچھا اور مجھ سے کہنے لگے۔

''نواز خان! یہ کیس تم خود ہینڈل کرو۔ بلراج سے سارا ریکارڈ لے لو اور اسے فوراً میرے کمرے میں بھیجو...... میں ابھی تم سے پھر بات کرتا ہوں......''

میں سیلوٹ کر کے باہر چلا آیا۔ کافی دور ہی سے ملزم ولایت علی کی کراہیں سنائی دے رہی تھیں۔ بڑھیا اور لڑکی میرے کمرے میں موجود نہیں تھیں۔ میں نے اپنے ہیڈ کانسٹیبل سے پوچھا، اُس نے بتایا کہ بلراج صاحب نے ان دونوں کو گھر بھجوا دیا ہے۔ میں بلراج کے عقوبت خانے میں داخل ہوا، وہ کرسی پر ٹانگیں پسارے بیٹھا تھا۔ ایک حوالاتی اُس کے پاؤں دبا رہا تھا۔ ولایت اسی طرح لٹکا ہوا تھا۔ ہیڈ کانسٹیبل عنایت مسیح ہاتھ میں بال اکھاڑنے والا موچنا لیے کھڑا تھا۔ اُس نے ولایت کی مونچھوں کے چند بال موچنے میں جکڑ رکھے تھے اور آہستہ آہستہ انہیں کھینچ رہا تھا۔ ملزم کا بالائی ہونٹ کوئی دو انچ تک کھنچتا چلا گیا اور وہ بری طرح چلا رہا تھا۔ گردن سے بہنے والا پسینہ، آنکھوں سے بہنے والا پانی اور ناک کا لعاب سب مل جل کر قطرہ قطرہ اُس کی پیشانی سے ٹپک رہے تھے۔ مونچھوں کے بال کھینچنا ایک نہایت اذیت ناک سزا سمجھی جاتی ہے۔

''رک جاؤ۔'' میں نے غصے سے کہا۔ اُس نے بال چھوڑ دیئے۔ بلراج کڑی نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔ ''بلراج! عطاء صاحب بلا رہے ہیں۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ اُس کے چہرے پر حیرت کے آثار نظر آئے پھر کچھ کہے بغیر باہر نکل گیا۔ لمبا ہیڈ کانسٹیبل عنایت مسیح کبھی میری طرف اور کبھی ہاتھ میں پکڑے موچنے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر موچنا اُس کے ہاتھ سے لے لیا۔

''یہ موچنا مجھے دے دے عنایت! ہو سکتا ہے کل کلاں تیری مونچھیں اکھاڑنی پڑیں۔''

''میں سمجھا نہیں صاحب؟''

''جس بہن کو گھر لے گیا تھا وہ سب بتا دے گی اور سمجھا بھی دے گی۔'' میں نے کہا۔ عنایت مسیح کا تاریک چہرہ اور تاریک نظر آنے لگا۔

☆======☆======☆

ولایت علی کی حالت کافی خراب تھی۔ میں نے اسے چھت سے اتروایا ایک نزدیکی کلینک سے ڈاکٹر کو بلوایا۔ اُس نے بتایا کہ مریض کو اندرونی طور پر سخت چوٹیں آئی ہیں لیکن خطرے کی بات نہیں۔ گرم دودھ وغیرہ پلوا کر میں نے ہیڈ کانسٹیبل خوشی محمد کو کہا کہ اسے کمبل دے کر چارپائی پر لٹا دے۔ خوشی محمد کی ڈیوٹی رات کی تھی، ضروری ہدایات دے کر میں تھانے سے چلا آیا۔

اگلے روز منہ اندھیرے ایک سپاہی نے میرا دروازہ کھٹکھٹایا اور اطلاع دی کہ ملزم ولایت حوالات سے فرار ہو گیا ہے۔ میں ایک لمحے کے لیے ششدر رہ گیا۔ اُس کی حالت تو

ایسی نہیں تھی کہ بھاگ سکتا لیکن سپاہی جھوٹ تو نہیں بول سکتا۔ اچانک مجھے صورتِ حال کی سنگینی کا احساس ہوا۔ یہ معاملہ اعلیٰ افسران کے نوٹس میں تھا۔ اس کام کو اس طرح بگڑنا نہیں چاہئے تھا۔

میں نے اسی وقت کپڑے تبدیل کیے اور بھاگم بھاگ تھانے پہنچا۔ حوالاتیوں کو عام طور پر ایک بیرک کے اندر زمین پر بچھی ہوئی چاول کی چھال پر سلایا جاتا تھا لیکن میری ہدایت پر ولایت علی کو ایک دوسری کوٹھری میں چارپائی دی گئی تھی۔ میں نے جگہ کا معائنہ کیا۔ چارپائی، لحاف، تکیہ سب کچھ اسی طرح پڑا تھا۔ کمرے کی پکی دیوار میں کوئی ڈیڑھ مربع فٹ کا سوراخ نظر آرہا تھا اور مجرم غائب تھا۔ یہ کوٹھری عمارت کی بیرونی جانب تھی اور شاذ و نادر ہی یہاں کوئی حوالاتی رکھا جاتا تھا۔ بہرحال جیسے بھی ہوئی تھی غلطی ہو چکی تھی۔ میرے خیال میں سب سے زیادہ قصوروار ہیڈ کانسٹیبل خوشی محمد تھا۔ حوالاتیوں کی نگہداشت اُس کی ذمے داری تھی اور میں نے خاص طور پر اسے ولایت کا خیال رکھنے کی تاکید کی تھی لیکن لگتا تھا رات کسی پہر وہ سو گیا تھا اور ملزم کو نقب لگا کر فرار ہونے کا موقع مل گیا۔ بڑی شرم کی بات تھی کہ تھانے میں نقب لگائی گئی تھی یعنی چراغ تلے اندھیرے والا معاملہ ہو گیا تھا۔

میں نے کانسٹیبل خوشی محمد سے سوالات کیے وہ سخت پریشان نظر آتا تھا، شاید اسے اپنی نوکری کی فکر کھا رہی تھی۔ میں نے اُسے تسلی دی کہ جو کچھ ہونا تھا وہ ہو چکا اب ہمیں اس بگڑے ہوئے معاملے کو سنوارنا ہے۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ رات اُس کے ساتھ اور کون کون تھا۔ اُس نے چند ایک نام بتائے۔ ان میں کوئی شخص بھی ایسی حرکت نہیں کر سکتا تھا۔

بہرحال سب سے پہلا کام میں نے یہ کیا کہ ایک اے ایس آئی کو دو کانسٹیبلوں کے ساتھ ملزم کے متوقع ٹھکانوں پر بھیجا۔ ان میں اُس کے یار دوست اور ملنے والے شامل تھے۔ ایسے لوگوں کے پتے ملزم کی فائل میں موجود تھے۔ خود میں دو کانسٹیبلوں کے ساتھ اُس کے گھر روانہ ہوا وہ ایک کچی آبادی میں رہتا تھا۔ تنگ و تاریک گلیوں میں سے ہوتے ہوئے ہم اُس کے گھر پہنچے۔ ابھی اجالا پوری طرح نہیں پھیلا تھا۔ میں نے ٹاٹ کا پردہ اٹھا کر لکڑی کا بوسیدہ دروازہ کھٹکھٹایا۔

''کون ہے؟''

ایک عمر رسیدہ مردانہ آواز آئی اور ایک بوڑھے نے دروازہ کھولا۔ سامنے پولیس کو دیکھ کر اُس کی وہی حالت ہوئی جو غریب غرباء کی ہوا کرتی ہے، وہ تھر تھر کانپنے لگا۔ میں نے اسے کہا ''گھر میں پردہ کراؤ۔''

وہ بولا۔ ''مائی باپ آپ سے پردہ کرنے والا کون ہے آپ بادشاہ ہیں...... مالک ہیں۔'' اُس نے دروازہ کھول دیا۔ ہم اندر داخل ہوئے۔ بڑھیا اور اس کی بیٹی بھی جاگ گئی تھیں۔ بڑھیا کے بال بکھرے تھے اور لڑکی کا دوپٹہ پاؤں میں جھول رہا تھا۔ خوف کی بجائے وہ امید بھری نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھیں۔ ایک لمحے میں مَیں نے محسوس کر لیا کہ ملزم یہاں نہیں پہنچا یا کم از کم ان لوگوں کو اس کا پتہ نہیں۔ بڑھیا بولی۔ ''تھانیدار پتر! میرا ولایت ٹھیک ہے نا؟''

میں نے کانسٹیبلوں سے کہا کہ گھر کی تلاشی لیں۔ انہوں نے جلدی جلدی گھر کے کونے کھدرے دیکھے اور آکر نفی میں سر ہلا دیا۔ بوڑھے بڑھیا کی نگاہوں میں اب حیرت پائی جاتی تھی۔ بڑھیا ڈری ہوئی بولی۔

''پتر خیر تو ہے نا؟''

میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ''مائی تیرے پتر کو میری مہربانی راس نہیں آئی۔ وہ حوالات سے بھاگ گیا ہے...... اور مجھے یقین ہے کہ تم لوگوں نے ہی اسے چھپایا ہے سیدھی طرح اُس کا پتہ دو ورنہ برا حشر ہوگا۔''

میرے بدلے ہوئے تیور کو دیکھ کر بڑھیا کے ہاتھ کانپنے لگے، لڑکی بھی رونے لگی۔ بوڑھا بولا۔

''تھانیدار صاحب! رب جانتا ہے ہمیں اُس کے بارے کچھ پتہ نہیں۔ ہم تو امید لگائے بیٹھے تھے کہ آج اس کی رہائی ہو جائے گی۔ جنتے کا آپ کی تعریفیں کر کر کے منہ سوکھ رہا تھا۔ کہتی تھی اللہ نے میرے بچے کی مدد کے لیے فرشتہ بھیج دیا ہے۔ اب وہ ضرور گھر آجائے گا...... خدا کی قسم ہمیں اُس کے علاوہ کچھ پتہ نہیں۔''

میں نے کہا۔ ''بابا کچی باتیں نہ کر۔ وہ تیرا بیٹا ہے تجھے اُس کے بارے پتہ نہیں ہوگا تو کسے ہوگا۔ تم لوگ اسے بچا کر اور زیادہ مصیبت میں ڈالو گے۔ اگر اپنی اور اس کی خیریت چاہتے ہو تو اُس کا پتہ بتا دو۔''

میرا لہجہ اور رویہ دیکھ کر بڑھیا آگے بڑھی۔ پھر اپنی چادر اتار کر چارپائی پر بچھاتی ہوئی بولی۔ ''لے پتر! یہاں بیٹھ، میں تجھے بتاتی ہوں۔'' پھر اُس نے بازو سے پکڑ کر مجھے چارپائی پر بٹھا دیا۔

بوڑھا بولا۔ ''تھانیدار جی ہم بے قصور ہیں......''

بڑھیا نے اسے ڈانٹا ''تو چپ کر کے بیٹھ جا۔'' پھر میرے قریب بیٹھتی ہوئی بولی۔

"پتر! خدا کے بعد تو ہی ہمارا آسرا ہے۔ میں تجھ سے کچھ نہیں چھپاؤں گی۔" پھر اُس نے لڑکی کی طرف دیکھا۔ "جا رانی! ادھر کھڑی منہ کیا دیکھ رہی ہے۔" لڑکی اندر چلی گئی۔ بڑھیا بولی۔ "پتر! میرا ولایت برا نہیں تھا۔ جیسا بھی تھا شام کو چار پیسے لے کر ہی آتا تھا۔ ریڑھی پر قلفی لگا کر بیچتا تھا۔ اڑوس پڑوس والی کہتی تھیں جنتے کا پتر نیک اور کماؤ ہے۔ پھر اُسے ایک بدبخت گُڈی کی نظر کھا گئی۔ میں نے تو آج تک اس ڈائن کا نام بھی نہیں سنا، لیکن کہتے ہیں کہ کسی سکول میں پڑھاتی تھی۔ پگلا تو میرا بیٹا ہی تھا۔ کسی کو کیا کہوں۔ بھلا سوچتا کہاں وہ پڑھی لکھی نخرے والی ماسٹرانی اور کہاں یہ قلفیاں بیچنے والا لیکن یہ تو اس کے فریب میں ایسا آیا کہ ہر وقت اس کی لٹک میں رہتا۔ پتہ نہیں اس چڑیل نے کیسا جادو کر دیا میرے بیٹے پر۔

پھر وہی ہوا جو ہونا تھا۔ اس نے کسی اور سے بیاہ کر لیا اور یہ پاگل، ریڑھی چھوڑ چھاڑ فقیروں کے حال گلیوں میں پھرنے لگا۔ اب اسے پورے چار مہینے ہوئے ہیں کاروبار چھوڑے ہوئے صبح کا نکلا شام کو آتا ہے۔ میں نے سمجھایا باپ نے سمجھایا۔ بہن نے واسطے دیئے لیکن وہ تو جیسے اس دنیا میں ہی نہیں۔ میں روز کہتی تھی اس طرح آوارہ پھرے گا تو کسی دن شام کو تیری راہ دیکھتی رہ جاؤں گی......

پھر یہی ہوا۔ چار پانچ دن پہلے اسے پولیس نے پکڑ لیا۔ میں رات گئے تک دہلیز پر بیٹھی رہی۔ ساری رات ہم اس کا انتظار کرتے رہے۔ صبح ایک محلے دار نے بتایا کہ رات ولایت پکڑا گیا ہے۔ اس نے کسی گھر میں چوری کی ہے۔ تھانیدار پتر پتہ نہیں کس کرماں جلے نے ہم سے یہ بیر کمایا ہے۔ مجھے تو لگتا ہے یہ اسی ماسٹرانی کے کسی ہوتے سوتے کا کام ہے۔ میرا بیٹا لاکھ آوارہ سہی لیکن اللہ جانتا ہے......"

اس سے آگے بڑھیا نے بیٹے کی صفائی میں وہی تھانے والی تقریر شروع کرنی تھی۔ میں نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روکتے ہوئے کہا۔ "اماں، دیکھو، اگر تمہارا بیٹا یہاں آئے یا تمہیں اس کی کوئی اطلاع ملے تو فوراً تھانے اطلاع کرو۔ صرف یہی ایک صورت ہے اس کی مدد کی۔" یہ کہتا ہوا میں ولایت کے گھر سے باہر آ گیا اب میرا رخ اس ماسٹرانی کی طرف تھا جس کا ذکر ولایت کی ماں نے کیا تھا اور جس کے متعلق فائل میں بھی اندراج تھا۔ چوری کی رپورٹ کے ساتھ کوئی دس پندرہ شہادتیں موجود تھیں۔

ان شہادتوں سے پتہ چلتا تھا کہ بروز ہفتہ 9 دسمبر ولایت علی ولد محمد بوٹا لوہے کے معروف تاجر سیٹھ عبدالعزیز کے گھر آیا اور ان سے کہنے لگا کہ وہ قالینوں کی صفائی کرتا ہے۔ سیٹھ صاحب نے اسے کام بتا کر معاوضہ طے کر لیا اور خود دکان پر چلے گئے۔ گھر میں دو ملازم

اور دو عورتیں تھیں۔ صفائی کے دوران نظر بچا کر ولایت علی نے سیٹھ کی الماری سے ایک طلائی انگوٹھی، تین ہزار روپے نقد اور تقریباً اتنی ہی مالیت کی ایک دستی گھڑی چرا لی۔ اس چوری کا علم شام کو ہوا۔ پولیس نے ولایت علی کو ایک چائے خانے سے شراب کے نشے میں دھت گرفتار کر لیا تھا۔ ابتدائی رپورٹ سے پتہ چلتا تھا کہ ولایت علی اچھے کردار کا لڑکا نہیں، بے روزگار ہے۔ بس کبھی کہیں سفیدی کر لیتا ہے۔ کبھی دیواروں پر اشتہار لگاتا نظر آتا ہے اور کبھی قالینوں کی صفائی شروع کر دیتا ہے۔ نزدیکی آبادی جام نگر کی ایک شادی شدہ عورت سے اس کا چکر ہے عموماً اس کے گھر کے گرد منڈلاتا رہتا ہے۔ اس گلی میں ایک پان والے سے اس کی دوستی ہے اکثر اس کے ہاں بیٹھا نظر آتا ہے۔

یہ تمام معلومات میرے ذہن میں محفوظ تھیں۔ اب میرا رخ جام نگر کی طرف تھا۔ یہ ایک متوسط آبادی تھی۔ چھوٹی موٹی کوٹھیاں بھی نظر آتی تھیں۔ جس وقت ہم یہاں پہنچے دن کافی چڑھ آیا تھا۔ لوگ اپنے اپنے کاروبار سے جا رہے تھے۔ میں نے جیپ سیدھی پان شاپ پر رکوائی۔ پان والا ایک صحت مند نوجوان لڑکا تھا۔ جیپ دکان کے سامنے رکتے دیکھ کر وہ ٹھٹک گیا۔ میں نے اسے جیپ کے اندر بلا کر پوچھ گچھ شروع کی۔ حسبِ توقع اس نے ولایت کے فرار سے لاعلمی کا اظہار کیا۔ میں نے اس پر زیادہ سختی نہیں کی اور ولایت کے یارانے کے متعلق پوچھا پہلے تو وہ انکار کرتا رہا لیکن جب اسے پتہ چلا کہ پولیس کافی کچھ جانتی ہے تو اس نے تھوڑی دور ایک مکان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ اس مکان میں رہنے والی عورت سے ولایت کے تعلقات رہے ہیں۔ اس عورت نے ولایت کو بڑے بڑے سبز باغ دکھائے تھے لیکن پھر ایک دوسرے شخص سے شادی کر لی۔ میں نے اس کے شوہر کے بارے میں پوچھا تو لڑکا جس کا نام شاہد حنیف تھا بتانے لگا کہ عورت کا شوہر کسی دفتر میں چپڑاسی ہے۔

میں یہ انکشاف سن کر حیران رہ گیا۔ میں نے ایک نظر پھر اس مکان کی طرف دیکھا۔ مکان گو بہت اچھا نہیں تھا لیکن ایک چپڑاسی کی تنخواہ میں تو ایسے مکان کا صرف خواب ہی دیکھا جا سکتا تھا۔ بہرحال یہ کوئی ایسی عجیب بات بھی نہیں تھی بعض اوقات چپڑاسی بھی کافی لمبے ہاتھ مار لیتے ہیں۔ اگر ہم کلرک کو بادشاہ مانتے ہیں تو چپڑاسی کو کم از کم وزیر تو ماننا چاہیے اور یہ بھی ضروری نہیں کہ یہ چپڑاسی ویسا ہی ہو جیسا عام تصور پایا جاتا ہے۔ یعنی منحنی جسم، ڈھیلی ڈھالی پتلون اور سر پر سیکنڈ ہینڈ ٹوپی۔ چپڑاسی بھی تو جوان جہان اور خوبرو ہو سکتا ہے۔ یقیناً یہ بھی کوئی ایسا ہی چپڑاسی تھا۔

ابھی لڑکے سے گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ سامنے والے مکان کا دروازہ کھلا۔ میں چوکنا ہو کر دیکھنے لگا۔ ایک سائیکل کا پہیہ نظر آیا پھر سائیکل تھامنے والا شخص بھی دروازے کی اوٹ سے نکل آیا۔ اسے دیکھتے ہی میں پہچان گیا کہ یہ ولایت کی محبوبہ کا شوہر ہے۔ میرا دوسرا اندازہ بالکل غلط تھا۔ یعنی چپڑاسی کوئی خوبصورت شخص نہیں تھا۔ منحنی جسم، ڈھیلا ڈھالا لباس اور سانولا رنگ۔ عمر بھی پینتیس سال سے کم دکھائی نہیں دیتی تھی۔ اس کے عقب میں کوئی عورت دکھائی دی۔ میں نے عورت کی صرف ایک جھلک دیکھی لیکن یہ ایک جھلک بتانے کے لیے کافی تھی کہ عورت جوان اور خوبصورت ہے۔

میں نے حیرانگی سے پان فروش کی طرف دیکھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ یعنی یہی شخص دروازے میں کھڑی عورت کا شوہر تھا۔ میرے ذہن میں کئی شبے سر ابھارنے لگے۔ میں نے لڑکے سے کچھ اور باتیں پوچھیں جن سے پتہ چلا کہ چپڑاسی کا نام نذیر محمد ہے۔ یہ انکم ٹیکس کے دفتر میں کام کرتا ہے۔ کافی ہوشیار آدمی ہے۔ ایک بیوی پہلے مار چکا ہے اس میں سے کوئی بچہ نہیں تھا یہ مکان بھی تین چار ماہ پہلے مکمل ہوا ہے۔ اس سے پہلے وہ اس جگہ ایک کمرے کے خستہ گھر میں رہتا تھا۔ لڑکے نے بتایا کہ یہ شخص طبیعت کا بڑا غصیلا ہے۔ ذرا سی بات پر بھڑک اٹھتا ہے۔ بیوی پر بھی سختی کرتا ہے۔ اڑوس پڑوس والے کہتے ہیں کہ بیوی پر اس کا بڑا رعب ہے۔ اس کی اجازت کے بغیر وہ کسی سے بات بھی نہیں کر سکتی۔ لوگوں کو حیرانی ہوتی ہے کہ یہ عورت اس شخص کے ساتھ کیسے نباہ کر رہی ہے۔

میں نے پان فروش کا طویل بیان غور سے سنا۔ صورتِ حال کچھ الجھی ہوئی تھی۔ ایک حسین و جمیل لڑکی ایک پکی عمر کے چپڑاسی کی بیوی تھی اور وہ اس پر سختی بھی کرتا تھا۔ پان فروش سے پتہ چلا کہ نذیر بیوی کے ساتھ اکیلا رہتا ہے اس کے ماں باپ فوت ہو چکے ہیں لیکن اس کی ساس کبھی کبھی یہاں آتی ہے۔ ایک دفعہ نذیر نے اپنی ساس کو بھی مارا تھا۔ پتہ نہیں اس نے کیا چیز اسے اٹھا کر ماری تھی کہ بے چاری کا ماتھا پھٹ گیا تھا۔ بعد میں گلی کے کمپاؤنڈر سے ہمسائے کے لڑکے نے اس کی پٹی کروائی تھی۔ پان فروش نے بتایا کہ یہ دو تین ہفتے پہلے کی بات ہے۔

اتنے میں ایک شخص ہماری جیپ کے قریب آیا اور بھاری بھرکم آواز میں ''السلام علیکم'' کہہ کر ہاتھ میری طرف بڑھا دیئے۔ میں نے مصافحہ کیا۔ تھوڑی سی کوشش سے میں اسے پہچان گیا۔ یہ گنپت لال اچاریہ تھا۔ تھا تو ہندو لیکن بڑا خوش اخلاق شخص تھا۔ ایک دو بار میں نے اخبار میں بھی تصویر دیکھی تھی۔ سیاست میں دلچسپی رکھتا تھا لیکن میں اسے سماجی کاموں

کے حوالے سے جانتا تھا۔ ایک دو بار کسی کی ضمانت کے سلسلے میں تھانے بھی آیا تھا۔ اس کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

''جناب! یہ تو بڑی زیادتی ہے۔ آپ اس علاقے میں آئیں اور ہم آپ کے درشنوں سے محروم رہیں۔ چلئے میرے ساتھ گھر۔'' اس نے اپنی کار آگے بھجوا دی اور خود ہمارے ساتھ ہی جیپ میں بیٹھ گیا۔ اس کا اصرار دیکھ کر میں انکار نہ کر سکا۔ یوں بھی مجھے چپڑاسی اور اس کی بیوی کے بارے میں معلومات درکار تھیں اور گنپت لال سے زیادہ معلومات کوئی دوسرا نہیں دے سکتا تھا۔ چند فرلانگ دور اس کی کوٹھی تھی۔ ہمیں لے کر وہ ڈرائینگ روم میں چلا آیا۔ میں نے اسے کہا کہ مجھے اس وقت بہت جلدی ہے۔ میں صرف اس علاقے کے ایک گھر کے متعلق جاننا چاہتا ہوں۔ وہ ہمہ تن گوش ہو گیا۔ میں نے چپڑاسی نذیر محمد کا نام لیا تو اس کے چہرے پر الجھن کے آثار نظر آنے لگے۔ بولا۔

''خان صاحب! نذیر محمد کو میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ میرے پاس آتا جاتا رہتا ہے۔ انکم ٹیکس میں چپڑاسی ہے۔ میرا خیال ہے اس نے کہیں لمبا ہاتھ مارا ہے۔ بہر حال ان محکموں میں تو یہ سب کچھ چلتا ہے۔''

میں نے پوچھا۔ ''کوئی اور بات جو اس کے متعلق آپ کو معلوم ہو؟'' گنپت لال بولا۔

''خان صاحب! بیوی بڑی خوبصورت ہے اس کی اور جوان بھی۔ پتہ نہیں کیا چکر چلایا ہے بدمعاش نے۔''

میں نے کہا ''گنپت جی! میں بھی اس لڑکی کے متعلق ہی جاننا چاہتا ہوں۔ میرا خیال تھا آپ کو زیادہ پتہ ہوگا۔''

گنپت لال گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر انگلی اٹھا کر بولا۔

''میرا خیال ہے خان صاحب اس بارے میں لڑکی کی ماں آپ کو زیادہ بہتر طور پر بتا سکتی ہے۔ وہ یہاں سے کچھ دور ایک دوسرے محلے میں رہتی ہے۔ میرا ایک نوکر اس کے بارے میں جانتا ہے اگر ضرورت ہے تو اس عورت کو یہیں بلا لیتے ہیں...... بلکہ میرا خیال ہے یہی مناسب رہے گا۔''

میرے بولنے سے پہلے ہی گنپت لال اپنے کسی ملازم کو آوازیں دینے لگا۔ ملازم آیا تو گنپت لال نے اسے کچھ ہدایتیں دے کر روانہ کر دیا۔ مجھے لگ رہا تھا جیسے وہ بھی اس معاملے میں دلچسپی لے رہا ہے۔ ہم بیٹھے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ کوئی ایک گھنٹہ بعد گنپت لال کا ملازم ایک فربہ اندام عورت کو لئے اندر داخل ہوا۔ عورت کی عمر چالیس سال کے لگ

بھگ تھی۔ لباس اوسط درجے کا تھا۔ پان فروش کے بیان کے عین مطابق اس کے ماتھے پر زخم کا دو تین ہفتے پرانا نشان دکھائی دے رہا تھا۔ عورت بے حد خوفزدہ تھی۔ میں نے اسے کہا ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ میں صرف اس سے چند باتیں پوچھنا چاہتا ہوں۔ ظاہر ہے سب سے پہلے میں نے اس سے بیٹی کی شادی کے بارے پوچھا ہوگا۔ عورت نے بتایا کہ نذیر کو اس نے اپنی مرضی سے داماد بنایا ہے۔ اس سلسلے میں اس پر یا اس کی بیٹی پر کوئی دباؤ نہیں ڈالا گیا۔ اس نے کہا۔

''تھانیدار صاحب! اچھے رشتے کہاں ملتے ہیں۔ بیٹیوں کی عمر ڈھلتے دیر نہیں لگتی۔ ایک بار وقت ہاتھ سے نکل جائے تو ساری عمر پچھتانا پڑتا ہے۔ میں اکیلی جان بیٹی کی کہاں تک حفاظت کرتی بس جیسا اس کے مقدر میں تھا مل گیا۔ اللہ اسے اپنے گھر میں خوش رکھے۔''

عورت دانائی کی باتیں کر رہی تھی لیکن یہ باتیں مجھے ہضم نہیں ہو رہی تھیں۔ جیسا کہ میں نے بتایا ہے لڑکی نہ صرف جوان اور خوبصورت تھی بلکہ پڑھی لکھی اور برسرِ روزگار بھی تھی۔ ایک رنڈوے چپڑاسی سے اس کا بیاہے جانا کچھ عجیب سا لگتا تھا۔ پھر میرا دھیان ولایت علی کی طرف چلا گیا۔ ممکن تھا لڑکی کی بدنامی ہو چکی ہو اور مزید بدنامی کے خوف سے ماں نے اسے چپڑاسی نذیر کے کھونٹے سے باندھ دیا ہو۔

میں نے کہا۔ ''اماں! دراصل کل رات تھانے سے ایک مجرم بھاگا ہے میں اسی کی تلاش میں ہوں۔ اس کا نام ولایت علی ہے میری اطلاع کے مطابق ماضی میں تمہاری بیٹی کے ساتھ اس کا نام لیا جاتا رہا ہے۔''

عورت کے چہرے پر ایک سایہ سا آکر گزر گیا۔ کھنکار کر بولی۔ ''تھانیدار صاحب! اس لڑکے نے بھی ہم ماں بیٹیوں کو بڑا دکھ دیا ہے۔ نہ جانے وہ کہاں سے میری معصوم زلیخا کے پیچھے پڑ گیا تھا۔''

میں نے کہا۔ ''کیا تمہیں معلوم ہے وہ اب بھی تمہاری بیٹی کے پیچھے ہے۔ اسے اکثر چپڑاسی نذیر کے گھر کے سامنے دیکھا جاتا تھا۔ مجھے ایک اطلاع ملی ہے کہ وہ اب بھی ملتے ہیں۔''

میں نے اندھیرے میں تیر چھوڑا تھا۔ عورت کے ہونٹ کانپنے لگے۔ ''نہیں تھانیدار صاحب میری بیٹی بدکردار نہیں۔ وہ ایسا نہیں کر سکتی۔ کسی نے اس پر الزام دھرا ہے وہ تو اپنے میاں کے ساتھ بہت خوش ہے۔''

''اور تم بھی اپنے داماد سے خوش ہو؟''

''بالکل جی...... بالکل۔''

عورت کے ماتھے کا نشان اس کے جھوٹ کی چغلی کھا رہا تھا۔

☆======☆======☆

کوئی بارہ بجے میں گنپت لال کے ہاں سے واپس تھانے روانہ ہوا۔ عورت سے ولایت علی کے بارے کوئی پتہ نہیں چل سکا بہر حال اپنی بیٹی کے رشتے کے بارے میں اس نے جو صفائی پیش کی تھی اسے میرے ذہن نے قبول نہیں کیا۔ معاملہ کچھ الجھا ہوا تھا۔ گنپت لال نے اس سلسلے میں مجھے ہر قسم کے تعاون کا یقین دلایا۔

میں تھانے پہنچا تو فضا کچھ خراب دکھائی دے رہی تھی۔ سارے عملے کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ پتہ چلا کہ تھوڑی دیر پہلے ایس ایس پی صاحب خود تھانے تشریف لائے ہوئے تھے۔ وہ ڈی ایس پی صاحب پر بہت برہم تھے۔ اب ڈی ایس پی صاحب اپنے کمرے میں مجھ پر برہم ہونے کے لیے بے چین تھے۔ میں خود کو اس مصیبت کے لیے تیار کرتا ان کے کمرے میں داخل ہوا۔ وہ بے قراری سے کمر پر ہاتھ باندھے ٹہل رہے تھے۔ انسپکٹر بلراج منہ پھلائے ایک کونے میں کھڑا تھا۔ میں نے سیلوٹ کیا۔ عطاء صاحب نے قہر آلود نگاہوں سے مجھے گھورا پھر جیسے خود پر ضبط کرتے ہوئے بولے۔

''کیا رپورٹ ہے نواز؟''

''جناب! میں صبح کا تفتیش پر نکلا ہوا ہوں۔ کچھ پیش رفت ہوئی ہے۔''

''پیش رفت نہیں...... مجرم چاہیے مجرم۔'' وہ میز پر چھڑی مار کر چلائے۔ ''تمہیں پتہ ہے یہاں کیا ہوا ہے پتہ ہے تمہیں کچھ؟''

''نہیں سر!'' میں نے کہا۔

وہ ایک قدم چل کر آگے آئے۔ ''ابھی صرف آدھ گھنٹہ پہلے تھانے کے سامنے دو ہزار آدمی کھڑا تھا...... وہ مطالبہ کر رہے تھے۔ پتہ ہے کیا مطالبہ کر رہے تھے؟''

''کیا سر؟'' میرے منہ سے نکلا۔

''وہ کہہ رہے تھے پولیس تشدد سے ہلاک ہونے والے بے گناہ شہری کی لاش دو۔ ان اہلکاروں کو ہمارے حوالے کرو جو اس قتل کے ذمے دار ہیں۔ ورنہ ہم اس تھانے کو آگ لگا دیں گے...... بولو اب کہاں ہے وہ حوالاتی؟''

میں سکتے کے عالم میں کھڑا تھا۔ معاملہ یہ رنگ اختیار کر لے گا اس کی مجھے توقع نہیں تھی۔ اس کا مطلب تھا ملزم کے ''فرار'' کو اس کی موت سمجھا جا رہا تھا۔ لوگ سمجھ رہے تھے کہ

کل تھانے کی چھت پر نظر آنے والا ملزم پولیس تشدد سے مرگیا ہے اور اس کی لاش کو غائب کر کے اس کے فرار کی کہانی گھڑی گئی ہے۔صورتِ حال نہایت تشویش ناک تھی۔

بلراج بولا''یہ سارا تمہاری نرمی کا نتیجہ ہے نواز خان، اگر..........''

''خاموش رہو!''میں ڈی ایس پی کی موجودگی کی پرواہ کیے بغیر دہاڑا۔''یہ میری نرمی کا نہیں تمہاری سختی کا نتیجہ ہے۔تم نے اسے جانوروں کی طرح مارا۔تم نے اس سے پیسے وصول کیے۔تمہارے ماتحت نے اس کی ماں اور بہن کو تنگ کیا۔ وہ میری وجہ سے خودکشی کرنے چھت پر نہیں گیا تھا۔میں نے اسے صرف پکڑا تھا اور اگر نہ پکڑتا تو تمہاری پتلون پر اس وقت یہ پیٹی نہیں ہوتی۔''

میرا غصہ دیکھ کر بلراج چپ ہوگیا۔ڈی ایس پی عطاء قدرے نرمی سے بولے۔''یہ وقت ایک دوسرے پر انگلیاں اٹھانے کا نہیں کچھ کرنے کا ہے۔صورتِ حال ہماری توقع سے کہیں زیادہ خراب ہوسکتی ہے۔ کچھ لوگ اس معاملے کو ہوا دینے کی کوشش کررہے ہیں۔''

انہوں نے اپنی گھڑی پر نگاہ دوڑائی اور فیصلہ کن لہجے میں بولے۔''اس وقت ٹھیک ساڑھے بارہ بجے ہیں۔ ہمارے پاس کل 22 گھنٹے ہیں کل ساڑھے دس بجے سے پہلے پہلے ملزم اس تھانے میں پہنچنا چاہئے۔ یہ اب تم دونوں کی ذمہ داری ہے۔ وہ زمین کے سات پردوں میں بھی ہے تو اسے ڈھونڈنا ہوگا۔اس سلسلے میں جس مدد کی ضرورت ہو مل سکتی ہے۔ ایس ایس پی صاحب سے میرا مستقل رابطہ قائم ہے۔ مجھے یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہونی چاہئے کہ کل ساڑھے دس بجے تک ملزم برآمد نہ ہونے سے کیا صورتِ حال پیش آسکتی ہے۔''

اتنے میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجی اور ڈی ایس پی صاحب کسی اعلیٰ افسر کو تازہ صورتِ حال سے آگاہ کرنے لگے۔

☆======☆======☆

میں اپنے کمرے میں آیا تو اے ایس آئی نے مفرور ولایت علی کے چار دوستوں کو زمین پر بٹھا رکھا تھا۔ ان میں وہ پان فروش بھی شامل تھا جس سے کل میں نے بات کی تھی۔ باقی تینوں کی عمریں بھی بیس بائیس سال کے درمیان تھیں۔ان میں سے ایک قالینوں کا کام کرتا تھا جب کہ دو موٹر مکینک تھے۔ان سے میں نے دو گھنٹے پوچھ گچھ کی۔ وہ ولایت کے بارے کچھ نہ بتا سکے۔ان چاروں سے ولایت اور زلیخا کے چکر کے بارے جو کچھ پتہ چلا اس کا لبِ لباب یہ تھا۔

''ولایت ایک سکول کے سامنے اپنی قلفی کی ریڑھی لگاتا تھا ایک دفعہ یہ ہوا کہ چھٹی کے وقت زلیخا جو اس اسکول میں پڑھاتی تھی۔ برقعہ پہنے باہر نکلی اور گیٹ پر کھڑے ایک تانگے میں بیٹھ گئی۔کوچوان کچھ دوسرے بچوں کو لینے گیٹ پر کھڑا تھا اچانک گھوڑا بدکا اور بھاگ نکلا۔زلیخا کی چیخیں سن کر ولایت نے تانگے کے پیچھے دوڑ لگا دی،کوئی آدھ فرلانگ بھاگ کر وہ سرپٹ دوڑتے تانگے پر سوار ہوگیا۔ اس نے گھوڑے پر قابو پانے کی بڑی کوشش کی لیکن وہ ایک چھوٹی سی پُلی سے ٹکرایا اور تانگے سمیت نہر میں جا گرا۔نہر میں پانی کا بہاؤ بہت تیز تھا۔زلیخا ڈوبنے لگی لیکن ولایت نے یہاں بھی ہمت سے کام لیا اور اسے کھینچتا ہوا نہر سے باہر لے آیا۔کنارے پر پہنچتے ہی وہ بے ہوش ہوگیا۔اس کے سر پر گہری چوٹ آئی تھی۔

وہ ایک ہفتہ ہسپتال رہا اور زلیخا اسے باقاعدگی سے دیکھنے آتی رہی۔بس یہیں سے ان کی محبت کا آغاز ہوگیا۔اس کے دوست اکثر اسے سمجھاتے تھے کہ اس پیار کا انجام اچھا نہیں ہوگا لیکن وہ کسی کی نہیں سنتا تھا دن رات زلیخا کا دم بھرتا تھا۔ اکثر کہا کرتا تھا اگر وہ نہ ملی تو خودکشی کرلے گا......لیکن پانچ چھ مہینے پہلے لڑکی نے اچانک شادی رچالی۔اس وقت سے وہ نیم پاگل بنا پھرتا تھا۔بس کبھی کبھار نشے کی لت پوری کرنے کے لیے کوئی کام کرلیتا تھا۔

ان چاروں لڑکوں سے اپنی پوچھ گچھ کے دوران میں نے کئی اہم نکتے دریافت کیے۔ ایک بات یہ معلوم ہوئی کہ جس روز ولایت پر چوری کا الزام لگا اس روز ایک کوٹھی کا ملازم خود ولایت کو لے کر گیا تھا۔اس شخص کے مالک نے اس کے خلاف چوری کی رپورٹ درج کرائی۔ جب کہ اپنے بیان میں مدعی یعنی سیٹھ عبدالعزیز نے کہا تھا کہ ملزم خود اس کے دروازے پر آیا اور کام طلب کیا تھا۔رپورٹ میں لکھا تھا کہ ملزم صبح نو بجے کے قریب آیا جب کہ پان فروش اور ایک دوسرے لڑکے نے فرداً فرداً بیان دیا تھا کہ ساڑھے نو بجے تک ولایت ان دونوں کے پاس بیٹھا رہا تھا۔

ایک بات یہ بھی قابلِ غور تھی کہ آٹھ نو ہزار روپیہ چوری کرنے کے بعد بھی ملزم نے کہیں روپوش ہونے کی کوشش نہیں کی۔شام سات بجے چوری کا علم ہوا اور ٹھیک ایک گھنٹہ بعد آٹھ بجے اسے اس چائے خانے سے پکڑ لیا گیا جہاں وہ اکثر بیٹھا کرتا تھا لیکن سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ چوری کا کیس اگر جھوٹا بھی تھا تو اس سے ملزم کی برآمدگی میں کیا مدد مل سکتی تھی۔

وقت بہت کم تھا۔ ایس ایس پی صاحب کے دیئے ہوئے بائیس گھنٹوں میں سے بھی ڈھائی گھنٹے گزر چکے تھے۔ میں نے فوری طور پر سیٹھ عزیز اور چپڑاسی نذیر سے ملنے کا فیصلہ کیا۔ زیرِ تفتیش افراد کو سب انسپکٹر کے سپرد کر کے میں بلراج کے کمرے میں آیا۔ وہ کرسی سے ٹیک لگائے گہری سوچ میں گم تھا۔ یوں لگتا تھا وہ میز پر بیٹھے بیٹھے یہ کیس حل کرنا چاہتا ہے۔ میں نے کہا۔

''بلراج میرا خیال ہے ہم دونوں کو مل کر کام کرنا چاہیے۔ اگر تمہارے ذہن میں کوئی تجویز ہے تو مجھے بتاؤ''

اس نے ایک موٹی سی گالی ''ذہن'' کو اور ایک ''تجویز'' کو دی پھر ایک گالی اپنے آپ کو نکال کر ٹوپی سنبھالتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ ''نواز خان! تیرا میرا راستہ نہیں مل سکتا۔ تُو اپنے راستے جا مجھے اپنے راستے جانے دے۔'' یہ کہتا ہوا وہ باہر نکل گیا۔

میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس کا راستہ اتنی دور نکل جائے گا۔ وہ جیسا بھی تھا میرا ہم پیشہ اور ساتھی تھا...... وہ تیز قدموں سے چلتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا...... پھر میں نے اسے کبھی زندہ نہیں دیکھا۔

☆======☆======☆

میں کوئی سوا تین بجے تھانے سے نکلا۔ روانہ ہونے سے پہلے میں نے تھانے کی تقریباً نصف نفری کو مختلف ٹکڑیوں میں بانٹ کر ولایت کی تلاش میں لگا دیا۔ اس سلسلے میں دو تین نزدیکی تھانوں سے بھی مدد لی جا رہی تھی۔ میرا رخ اب سیٹھ عزیز کی دکان کی طرف تھا۔ سیٹھ ایک چالیس پینتالیس سالہ شخص تھا۔ وہ دراصل ترازو، فرنز لنڈے اور اس قسم کی دوسری چیزیں بیچنے کا کام کرتا تھا۔

جس وقت میں دکان پر پہنچا۔ اِردگرد کے دو تین ہم[illegible] ندار اس کے پاس بیٹھے تھے۔ سیٹھ کے متعلق ایک مخبر کی زبانی پتہ چلا تھا کہ وہ کچھ رنگیر[illegible] زاج بھی ہے، اس نے دفتری کام کے لیے ایک نوخیز اور خوبصورت لڑکی ملازم رکھی ہوئی ہے۔ مخبر کا کہنا تھا کہ یہ لڑکی اس کی ''رکھیل'' ہے۔ بہرحال میں سیٹھ سے ملا۔ وہ مجھے کچھ مغرور اور اکھڑا اکھڑا نظر آیا۔ میں نے اس سے کچھ سوالات کئے، اس نے وہی باتیں کیں جو اپنے بیان میں کر چکا تھا۔ میں نے اپنے ذہن میں اٹھنے والے سوالات سے اس کے بیان کی صحت جانچی اور مجھے اندازہ ہوا کہ کچھ گڑبڑ ضرور ہے۔ میں نے اٹھتے وقت سیٹھ کو سختی سے ہدایت کی کہ اگلے چوبیس گھنٹوں میں وہ گھر اور دکان کے علاوہ کہیں نہیں جائے گا کسی وقت بھی اس کی ضرورت

پڑ سکتی ہے۔

سیٹھ سے ملنے کے بعد میں نے نہایت رازداری سے ایک سادہ لباس والا اس کی دکان کی نگرانی پر لگا دیا۔ ایک دوسرے شخص کو اس کی کوٹھی پر نظر رکھنے کے لیے بھیج دیا۔ سیٹھ کے ہاں سے میں سیدھا چپڑاسی نذیر کے گھر پہنچا۔ ہیڈ کانسٹیبل نے اس کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ چپڑاسی نذیر کی گرفتاری اور اس کے گھر کی تلاشی کے وارنٹ میری جیب میں پڑے تھے۔ اسی عورت نے دروازہ کھولا۔ پولیس کو دیکھ کر اس کا حسین چہرہ زرد ہو گیا۔ میں ایک لمحہ ضائع کرنا نہیں چاہتا تھا۔ میں دندناتا ہوا اندر گھس گیا۔

''تیرا شوہر کہاں ہے لڑکی؟'' سب انسپکٹر نے پوچھا۔

''جی...... جی وہ...... ابھی دفتر سے نہیں آئے۔'' میں نے گھڑی دیکھی پانچ بج چکے تھے۔ سردیوں کا سورج شام کی چادر میں منہ چھپا چکا تھا۔ رات سر پر کھڑی تھی۔ اس رات کی صبح مفرور ملزم کو ہمارے درمیان ہونا چاہئے...... یہ نہایت ضروری تھا۔ میں نے گھبرائی ہوئی لڑکی پر ترس کھانے کی بجائے اس کچھ اور خوفزدہ کیا۔

''دیکھ لڑکی! اگر اپنی اور اپنی ماں کی عزت چاہتی ہے تو ولایت کے بارے میں سب کچھ بتا دے۔ ورنہ ایسا حشر ہوگا کہ زندگی بھر نہیں بھولے گی۔''

ایک لمحے میں لڑکی کے ہونٹ مرجھا گئے۔ وہ سخت خوفزدہ دکھائی دے رہی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ جب پولیس والوں پر اوپر سے سختی ہوتی ہے تو وہ آگے سختی کرتے ہیں اور یہ حقیقت ہے۔ شکوک کے ڈھیر سے حقائق کے تنکے چننا کوئی سہل کام نہیں۔ آدمی بری طرح جھنجھلا جاتا ہے اور پھر جب افسران کی طرف سے بھی دباؤ ہو تو بڑے بڑے ٹھنڈے مزاج کے پولیس افسر بھی چنگیز خان بن جاتے ہیں۔ جو درگت اس وقت ہماری بن رہی تھی اگر کوئی دوسرا پولیس والا ہوتا تو اب تک کئی افراد کی ''چھترول'' کر چکا ہوتا۔ میں بہت تحمل سے کام لے رہا تھا۔ لڑکی نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن ہونٹ کپکپا کر رہ گئے۔

''دیکھ لڑکی تیرے خلاف بہت سی گواہیاں ہیں۔ ہمیں پورا یقین ہے کہ ولایت کے ٹھکانے کا تجھے علم ہے۔'' اس نے چہرہ ہاتھوں میں چھپا لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ مَیں تپائی پر ہاتھ مار کر گرجا۔

''رونے دھونے سے کچھ نہیں ہوگا۔ جان چھڑانے کی ایک ہی صورت ہے سب کچھ صاف صاف بتا دے۔''

وہ ہچکیاں لیتے ہوئے بولی۔ ''وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔ جان سے مار دے گا۔''

''کوئی تجھے ہاتھ نہیں لگا سکتا۔'' میں گرجا۔ ''یہ قانونی معاملہ ہے ہم تیری پوری مدد کریں گے۔ آخر تک تیرے ساتھ چلیں گے۔ کون ہے جس کا تجھے ڈر ہے؟''

''وہ..........وہ۔'' لڑکی ہکلا کر رہ گئی۔

''شوہر سے ڈرتی ہے۔'' میں نے پوچھا۔

وہ پھر منہ چھپا کر رونے لگی۔ اتنے میں بیرونی دروازہ کھلا اور سائیکل کا اگلا پہیہ نظر آیا۔ کوئی غصیلے لہجے میں بولا۔ ''یہ سائیکل پکڑ ذرا۔'' میں نے لڑکی کی طرف دیکھا۔ ''کہاں مر گئی حرام خور......سائیکل پکڑ۔'' بولنے والے کا چہرہ دروازے کے پردے کی دوسری طرف تھا۔

ایک کانسٹیبل اٹھا اور اس نے سائیکل کا ہینڈل پکڑ لیا۔ سائیکل والے نے اس کے کیریئر سے کوئی چیز اتاری اور بولا۔

''چل لے جا اندر۔''

کانسٹیبل سائیکل کو اندر لے آیا۔ ذرا سی دیر میں صبح والا چپڑاسی کندھے پر جلانے کی لکڑیاں اٹھائے اندر داخل ہوا۔ اندر کا نقشہ دیکھ کر اس کے چہرے پر بے تحاشا حیرت برسنے لگی۔ لکڑیاں پھینک کر اس نے مجھے سلام کیا اور سوالیہ نظروں سے آنسو بہاتی ہوئی بیوی کی طرف دیکھنے لگا۔ ساتھ والے مکانوں پر کچھ عورتیں اور بچے کھڑے تماشا دیکھ رہے تھے۔ ہیڈ کانسٹیبل نے انہیں ڈرا دھمکا کر پیچھے ہٹا دیا۔ نذیر بار بار ہونٹوں پر زبان پھیر رہا تھا۔ میں نے بغیر کسی تمہید کے پوچھا۔

''کتنی تنخواہ ہے اوئے تیری؟''

''جی......وہ......سوا سو روپیہ۔''

''پھر سمگلنگ وغیرہ کرتا ہے تو۔'' میں نے اس کے مکان پر نظریں دوڑائیں۔

''جناب آپ کیا کہہ رہے ہیں میں عزت دار آدمی ہوں......'' ابھی فقرہ اس کے منہ میں تھا کہ میرا بھرپور تھپڑ اس کے گال پر پڑا۔ وہ اچھل کر اپنے سائیکل پر گرا۔ میں اسے پکڑ کر کمرے میں لے آیا۔ وہ بری طرح لرز رہا تھا۔ شاید بیوی کے سامنے ہونے والی بے عزتی نے اسے مشتعل کر دیا تھا۔ اچانک وہ تپائی کی طرف لپکا اور وہاں سے سبزی کاٹنے والی چھری اٹھا لی۔ یہ نوکدار چھری کوئی آٹھ انچ لمبی تھی۔ مجھے اس سے اس اقدام کی بالکل توقع نہیں تھی۔

میرے کانوں میں پان فروش کے الفاظ گونجے۔ اس نے کہا تھا کہ عورت کا شوہر نہایت غصیلا ہے......وہ نہایت تیزی سے گھوما اور مجھ پر حملہ کر دیا۔ چھری میرے پیٹ کو دو انچ کے فاصلے سے گزر گئی۔ یقیناً اس نے مجھے قتل کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ اگر میں ذرا سا چوک جاتا تو وار کارگر ہو گیا ہوتا۔ میں نے دونوں ہاتھ پھیلائے۔ دوسرا وار اس نے میرے سینے پر کیا تھا لیکن اس دفعہ میری نگاہیں چھری پر مرکوز تھیں۔ میں نے نہایت اطمینان سے وار بچایا اور نذیر کی کلائی تھام لی۔ اس نے نتائج سے بے پرواہ ہو کر میرے پیٹ میں لات جمانی چاہی لیکن اس دوران میں نے اس کا بازو مروڑ دیا اور وہ کراہ بھر کر گھوم گیا۔ چھری ہاتھ سے نکلتے ہی میں نے ایک بھرپور ٹانگ اس کی کمر پر جمائی وہ کراہتا ہوا ایک کرسی پر جا گرا۔ سب انسپکٹر نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اس پر مکوں اور لاتوں کی بارش کر دی۔ ایک منٹ کے اندر نذیر عرف نجے کی ساری اکڑفوں ختم ہو گئی......اب حالت یہ تھی کہ کمرے کی بیشتر چیزیں ٹوٹ چکی تھیں اور وہ فرش پر پڑا ہانپ رہا تھا۔ مجھے امید تھی کہ اب اس کی بیوی کے سر سے خوف کا بھوت بہت حد تک اُتر گیا ہو گا۔ میں اسے دوسرے کمرے میں لے گیا۔

''دیکھ لڑکی کسی سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ میں پھر کہتا ہوں کہ جو کچھ تیرے دل میں ہے بغیر کسی خوف کے بتا دے۔''

لڑکی نے اپنی سُرخ سُرخ آنکھیں اٹھا کر میری طرف دیکھا اور بولی۔ ''انسپکٹر صاحب! مجھے اور میری ماں کو کوئی نقصان تو نہیں پہنچے گا۔''

میں نے اسے یقین دلایا کہ ذاتی طور پر ہر طرح اس کی مدد کروں گا۔ وہ ایک دم جیسے پگھل گئی۔ آنسوؤں کی شفاف لڑیاں اس کے گلابی رخساروں پر بہہ نکلیں۔ یہ وہ آنسو نہیں تھے جو وہ کچھ دیر پہلے بہا رہی تھی۔ یہ تو خوف سے ٹھٹھرا ہوا وہ پانی تھا جو آج سورج کی تمازت پا کر جھرنوں کی طرح بہہ نکلا تھا۔ وہ کچھ دیر خود کو سنبھالنے کی کوشش کرتی رہی، پھر بولی۔

''انسپکٹر صاحب......مجھ پر بڑا ظلم ہوا ہے۔ مجھے بری طرح لوٹا گیا ہے۔ اتنا ظلم کسی پتھر پر بھی کیا جاتا تو وہ پھٹ جاتا لیکن میں نے یہ ظلم اپنی اور اپنی ماں کی زندگی کے لیے برداشت کیا ہے۔ آج سے کوئی 9 مہینے پہلے کی بات ہے میں مقامی سکول میں پڑھاتی تھی۔ سکول کے ایک ملازم نے عداوت کی وجہ سے میری کئی ماہ کی تنخواہ رکوا رکھی تھی۔ میری ایک سہیلی نے مجھے گنپت لال اچاریہ سے ملنے کا مشورہ دیا۔ شاید آپ جانتے ہوں یہ وہی گنپت ہے جو سماجی کارکن کے طور پر مشہور ہے اور دو سال پہلے الیکشن میں بھی کھڑا ہوا تھا۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ذہن مختلف اندازے لگا رہا تھا۔

لڑکی نے سلسلہ کلام جوڑا۔ ''میں اس شخص سے ملی۔ یہ بڑی مروت سے پیش آیا اور کام کروانے کا وعدہ کیا۔ میں وقفے وقفے سے اس کے پاس آتی جاتی رہی۔ مجھے پتہ ہی نہ چلا کہ وہ مجھ پر بری نظر رکھنے لگا ہے۔ یہ شخص نیتا کے روپ میں ڈاکو ہے۔ انسان کے بھیس میں شیطان ہے انسپکٹر صاحب۔ اس نے مجھے اپنے جال میں اس طرح پھنسایا کہ مجھے اپنی بربادی صاف نظر آنے لگی۔ جب اسے اندازہ ہوا کہ میں اس کے ہاتھ آسانی سے اپنی عزت نہیں گنواؤں گی تو اس نے پینترہ بدلا۔

ایک روز اس نے مجھ سے کہا۔ ''زلیخا میں تم سے بیاہ کرنا چاہتا ہوں۔''

میں نے ایک لمحہ سوچے بغیر انکار میں جواب دے دیا۔ وہ حیرت سے میرا منہ دیکھنے لگا۔ اس کا خیال تھا کہ اتنے مشہور و معروف اور امیر کبیر شخص کی پیشکش میں کبھی نہیں ٹھکرا سکوں گی۔ وہ سخت برہم ہوا اور بولا تُو نے میرا دوسرا روپ نہیں دیکھا۔ تجھے ایسی سزا دوں گا کہ ساری عمر یاد رکھے گی۔ میرا شوہر نذیر گنپت لال کی چلمیں بھرا کرتا تھا۔ ایک دفعہ اس نے مجھے کوئی مذاق کیا تھا اور میں نے گنپت لال کے سامنے اسے تھپڑ مارے تھے۔ گنپت لال نے کچھ روز بعد نذیر سے کہا کہ وہ میری ماں سے رشتہ مانگے۔ ایک نائن نذیر کے لیے میرا رشتہ مانگنے ہمارے گھر آئی تو ماں نے اسے سخت برا بھلا کہا۔ صاف ظاہر تھا کہ اس گنپت لال کی شرارت ہے۔ روز آتے جاتے نذیر مجھے تنگ کرتا تھا اور یہ سب گنپت لال کی شہ پر ہو رہا تھا۔

کچھ دن ٹھہر کر انہوں نے پھر رشتہ مانگا میری ماں نے پھر انکار کیا اور اس سے اگلے روز میرے چھوٹے بھائی کو جو اسکول کے ہوسٹل میں رہتا ہے کچھ لوگوں نے اغوا کر لیا۔ ہم نے گنپت لال کے خلاف رپورٹ درج کرانا چاہی لیکن کسی نے رپورٹ درج نہیں کی۔ الٹا ہمیں ڈرایا دھمکایا گیا کہ اتنے بڑے آدمی کے خلاف رپورٹ درج کرا کے ہم مصیبت میں پڑ جائیں گے۔ گنپت لال کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔

انسپکٹر صاحب! اسی رات ہمیں ایک رقعہ ملا۔ جس میں مجھے لکھا گیا تھا کہ تمہارا بھائی واپس ہوسٹل پہنچ گیا ہے لیکن اگلی دفعہ جب وہ غائب ہوگا تو ہسپتال کے مُردہ خانے سے ملے گا۔ اس رات میں اور میری ماں ایک دوسرے کے گلے لگ کر خوب روئیں...... اور پھر...... نذیر سے میری شادی ہوگئی۔''

لڑکی نے آخری الفاظ ادا کیے اور منہ پھیر کر پشیمانی کے آنسو بہانے لگی۔ میں اس کے

درد کو محسوس کر رہا تھا۔ اس کے کرب کی آنچ نہایت تیز تھی۔ جابر ہاتھوں نے اسے ایک ایسے شخص کی سیج پر بٹھا دیا تھا جو کسی طرح اس کے لائق نہیں تھا۔ اسکول میں جیسے ملازم اس کے لیے چائے لاتے تھے۔ وہ ایسے ملازم کے پاؤں دبانے پر مجبور کر دی گئی تھی۔ بہت بڑی ذلت تھی جو وہ سہہ رہی تھی۔ حوا کی مجبور بیٹی کا دکھ سن کر میں لرز گیا۔ وہ کہہ رہی تھی۔

''کبھی میری ماں مجھ سے ملنے آتی ہے تو نذیر اس کے ساتھ بھی بڑی سختی سے پیش آتا ہے۔ کچھ روز پہلے اس نے شیشے کا گلاس مار کر میری ماں کا ماتھا زخمی کر دیا تھا۔ شادی کے بعد پہلی بار میں نے اس سے احتجاج کیا۔ وہ سخت آگ بگولا ہو گیا۔ اس روز گنپت لال نے میری ماں کو اپنے گھر بلایا اور اسے دھمکی دی کہ اگر تیری بیٹی نے شوہر کی عزت نہ کی تو تم سب کا انجام برا ہوگا۔ کہنے لگا تیری بیٹی تو ایک قلفی والے سے شادی کرنے لگی تھی۔ چپڑاسی قلفی والے سے تو اچھا ہے۔'' روانی میں زلیخا خود ہی اصل موضوع کی طرف آ گئی تھی۔

''ہاں! یہ ولایت کا کیا معاملہ ہے۔'' میں نے پوچھا۔

زلیخا بولی۔ ''انسپکٹر صاحب میں نادان بچی نہیں۔ تھوڑا بہت پڑھی لکھی بھی ہوں۔ برا بھلا سمجھتی ہوں۔ ولایت سے میں نے کبھی شادی کا نہیں سوچا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ گنپت لال اجارہ سے بہتر انسان ہے۔ اس نے میری زندگی بچائی ہے۔ انسپکٹر صاحب میں یہ احسان تاحیات فراموش نہیں کر سکتی۔ میرے دل میں اس کی بڑی عزت ہے اور ہمیشہ رہے گی...... میں پورے یقین سے کہہ سکتی ہوں انسپکٹر صاحب کہ اس پر چوری کا جو مقدمہ بنا ہے وہ جھوٹا ہے یہ سب گنپت لال اور اس کے آدمیوں کی سازش ہے...... شاید آپ کو معلوم نہ ہو سیٹھ عزیز اور گنپت لال گہرے دوست ہیں۔''

یہ ایک اہم نقطہ تھا جو میں نے ذہن میں محفوظ کر لیا۔ آخر کے دس پندرہ منٹ میں میں نے لڑکی کو کریدنے کی بہت کوشش کی کہ وہ ولایت علی کے بارے میں [illegible] سکے لیکن لگتا تھا کہ اسے اس بارے میں کوئی علم نہیں۔ بہرحال وہ بار بار یہی کہہ رہی تھی کہ س[illegible] ماں اور بھائی کی زندگی بچائی جائے۔

دیکھا جائے تو لڑکی نے مجھ پر اعتماد کر کے ایک بہت بڑا رسک لیا تھا۔ ایک طرح سے اس نے چادر کا پلو جھاڑ کر اپنا سب کچھ مجھے سونپ دیا تھا۔ میں نے پورے خلوص سے اسے یقین دلایا کہ اس پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔ اس کی مصیبتوں کا دور گزر چکا ہے اب جو دن آئے گا پہلے سے اچھا ہوگا۔

☆======☆======☆

نذیر عرف نجے کو گرفتار کر کے میں نے ایک کانسٹیبل کو لڑکی کی حفاظت پر چھوڑا اور ا
دوسرے ہیڈ کانسٹیبل کو ہدایت کی کہ لڑکے کے ہوسٹل پہنچے اور نگران سے اجازت لے کر ا
یہاں بہن کے پاس لے آئے۔ اگر سکول کی انتظامیہ کوئی رکاوٹ ڈالے تو ڈائریکٹ ا
ایس صاحب سے رابطہ قائم کرے۔ اس کے بعد میں نے ملزم نجے کو جیپ میں بٹھایا ا
تھانے لے آیا۔ تھانے پہنچا تو بہت سے اہلکاروں کو بیرونی گیٹ پر کھڑے دیکھا۔ چہروں
پریشانی منڈلا رہی تھی۔ میں سمجھ گیا کوئی اور گڑبڑ ہوئی ہے۔ جیپ رکی ہی تھی کہ ایک کانسٹیبل
آیا اور بغیر سیلوٹ کے گلوگیر لہجے میں بولا۔

"بلراج صاحب کو گولی لگ گئی ہے...... کسی نے انہیں قتل کر دیا ہے۔"

ایک لمحے کے لیے میں بھونچکا سا رہ گیا۔ کانسٹیبل نہ جانے کیا کچھ کہہ رہا تھا میرا ذ
ماؤف ہو چکا تھا۔ پھر حواس بجا کر کے میں نے کانسٹیبل کو جیپ میں بیٹھنے کا حکم دیا اور ملزم
کو دو سپاہیوں کے حوالے کر کے موقعہ واردات کی طرف چل دیا۔ راستے میں کانسٹیبل نے
کہ بلراج صاحب کی لاش ایک بوری میں بند دریا کے کنارے سے ملی ہے۔ یوں لگتا ہے
لوگ لاش کو دریا بُرد کرنے کے لیے لائے تھے لیکن پھر کسی وجہ سے اسے کنارے کے قریب
چھوڑ کر بھاگ گئے۔

کوئی آدھ گھنٹے بعد ہم دریا کے کنارے پہنچ گئے۔ لاش وہیں موجود تھی۔ پولیس اہلکا
ضروری کارروائی کر رہے تھے۔ ڈی ایس پی صاحب بھی وہیں موجود تھے۔ میں نے لا
دیکھی اور یقین نہیں آیا کہ چند گھنٹے پہلے مجھ سے باتیں کرنے والا شخص ہمیشہ کے لیے خامو
ہو چکا ہے...... کاش میں اس وقت اسے جانے سے روک لیتا۔ وہ کنارے کی ریت پر چت
لیٹا تھا۔ گولی اس کے حلق میں لگی تھی اور گردن کے پچھلے حصے تک چلی گئی تھی۔ جسم پر در
موجود تھی اور اس کی حالت سے اندازہ ہوتا تھا کہ قاتل یا قاتلوں اور مقتول کے درمیان ہا
پائی ہوئی ہے۔

میں اس کی لاش دیکھ رہا تھا اور آنکھوں میں اس سے آخری ملاقات کا منظر گھوم
تھا۔ اچانک میرے ذہن میں ایک خیال آیا اور جسم میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ اس سے پ
اتنی مصروفیت رہی تھی کہ مجھے سوچنے کا بالکل موقع نہیں ملا تھا۔ بلراج چند گھنٹے پہلے تھا
سے بڑے اعتماد کے ساتھ روانہ ہوا تھا۔ یوں لگتا تھا اس کے ذہن میں کوئی خاص با
ہے جو اسے سیدھی مفرور ملزم کے ٹھکانے تک پہنچا دے گی۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ وہ م
کے متعلق جانتا ہو...... یا پھر اس نے ملزم کو فرار کرایا ہو۔ ذہن تیزی سے واقعات کی کڑ

جوڑ رہا تھا۔ ظاہر ہے کیس میرے پاس منتقل ہونے سے بلراج کی سبکی ہوئی تھی۔ اسے
معلوم تھا میں نے ملزم کو "لاک اَپ" کی بجائے علیحدہ کوٹھری میں سلایا ہے اور وہاں سے
با آسانی اسے نکالا جا سکتا ہے۔ ظاہر ہے ملزم کے غائب ہونے میں میری سخت بدنامی تھی۔
کیونکہ میں نے ہی اس کے ساتھ نرمی کا سلوک کیا تھا...... ذہن پکار اٹھا۔ یقیناً...... یہی
بات ہے ورنہ خود ملزم تو اس قابل تھا ہی نہیں کہ دیوار توڑ کر فرار ہو جاتا۔ بلراج نے اسے
سازش کے تحت فرار کرایا تھا لیکن پھر حالات غیر متوقع طور پر دوسرا رنگ اختیار کر گئے
لوگوں نے سمجھا کہ ملزم پولیس تشدد سے ہلاک ہو گیا ہے اور پولیس نے اس کے فرار کا
ڈرامہ کھیلا ہے۔ ظاہر ہے اس صورت میں مجھ سے زیادہ بلراج قصوروار ٹھہرتا تھا...... کیونکہ
ملزم پر تشدد اسی نے کیا تھا۔

میں دریا کے کنارے سب سے الگ ریت پر ٹہل رہا تھا اور ذہن جیسے گھڑ دوڑ کا میدان
بنا ہوا تھا۔ واقعات خود بخود ایک دوسرے سے پیوست ہو رہے تھے...... جب افسران بالا کا
دباؤ بڑھا اور بلراج کو گردن پھنستی نظر آئی تو اس نے ملزم کو واپس لانے کا فیصلہ کیا۔ ممکن تھا کہ
اسے ملزم کے ٹھکانے کا علم ہو...... بلکہ اس بات کا زیادہ امکان تھا کہ وہ بلراج کے کسی یار
دوست کی تحویل میں ہو...... وہ ملزم کو واپس لانے یا کہہ لیجیے کہ "برآمد کرنے" کے لیے تھانے
سے روانہ ہوا لیکن قتل ہو گیا۔

بظاہر یہی نظر آتا تھا کہ جب اس نے ملزم کو واپس لانا چاہا تو اس نے اسے گولی مار دی
لیکن اس مرحلے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ اگر میرا یہ مفروضہ درست تھا کہ ملزم از
خود فرار نہیں ہوا تو پھر اسے بلراج کے سوا اور کون فرار کرا سکتا تھا۔ جہاں تک گنپت لال، سیٹھ
عزیز اور نذیر وغیرہ کا تعلق تھا انہیں ولایت کے فرار سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ میں نے ابھی
گنپت لال اور سیٹھ عزیز پر ہاتھ نہیں ڈالا تھا۔ اس وقت مجھے صرف اور صرف ولایت علی کی
بازیابی سے کام تھا۔ ہاں میں نے سیٹھ عزیز کی طرح گنپت لال کے مکان پر بھی سفید کپڑوں
میں پولیس کا ایک آدمی تعینات کر دیا تھا۔ جیسا کہ زلیخا کے بیان سے ظاہر ہو چکا تھا گنپت
لال بھی ولایت کو گرفتار کروانے میں شریک تھا۔ اس لیے ممکن تھا کہ فرار کے بعد ملزم ان
دونوں کو نقصان پہنچانے کے لیے پہنچتا اور پکڑا جاتا۔

☆======☆======☆

ڈی ایس پی سمیت تھانے کا تمام عملہ ڈیوٹی پر تھا۔ جوں جوں رات بیت رہی تھی۔
ہماری بے چینی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ تفتیشی پارٹیاں سرگرمی سے کام کر رہی تھیں۔ پولیس

انسپکٹر کے قتل نے اس معاملے کو اور بھی سنگین بنا دیا تھا۔ ہمارے پاس صبح ساڑھے دس ب
تک کا وقت تھا۔ پولیس کے مخبروں کی یہ اطلاع بالکل درست ثابت ہوئی تھی کہ علاقے
صورتِ حال کشیدہ ہے۔ ایس ایس پی صاحب کی اطلاع کے مطابق کل ساڑھے دس ب
احتجاج کے لیے ایک اور بڑا جلوس نکالا جانے والا تھا۔ اندیشہ تھا کہ بپھرے ہوئے لوگ تش
پر اُتر آئیں گے۔ اگر جلوس کی روانگی سے پہلے پہلے ملزم برآمد ہو جاتا تو اس خطرے کو
جا سکتا تھا۔

گھڑی کی ٹِک ٹِک سارے دلوں کی دھڑکن میں اضافہ کر رہی تھی۔ اس وقت تقر
ڈھائی بجے تھے جب ڈی ایس پی صاحب نے مجھے اپنے کمرے میں بلایا۔ ان کے پا
ایک اہم اطلاع پہنچی تھی۔ میں اس وقت نذیر عرف نجے سے پوچھ گچھ کر رہا تھا۔ بے حد
کھانے کے بعد اس نے بتایا تھا کہ اس کے کہنے پر گنپت لال اچاریہ نے ولایت کو چور
کے جھوٹے کیس میں پھنسایا تھا لیکن اس کے فرار کے متعلق وہ کچھ نہیں جانتا تھا۔ میں اسے
چیختا چلاتا چھوڑ کر ڈی ایس پی صاحب کے کمرے میں پہنچا۔

وہاں وہ پولیس اہلکار موجود تھا جسے میں نے سیٹھ عزیز کی کوٹھی پر لگایا تھا۔ وہ سادہ
کپڑوں میں تھا۔ ڈی ایس پی کے کہنے پر اس نے میرے سامنے اپنی رپورٹ دہرائی۔
اس رپورٹ سے پتہ چلا کہ کل سہ پہر کوئی پونے چار بجے انسپکٹر بلراج سیٹھ عزیز کے گھر گ
تھا۔ پھر چند منٹ بعد وہ دونوں ایک کار میں بیٹھ کر کہیں چلے گئے۔ اس کے ٹھیک ڈیڑھ
گھنٹہ بعد بلراج کی لاش ملی۔ پولیس اہلکار اپنی رپورٹ کی اہمیت سے واقف نہیں تھا اس
نے سمجھا انسپکٹر صاحب معمول کی تفتیش پر آئے ہیں۔ اس لیے اس نے اتنی دیر سے اطلا
دی تھی۔

اس رپورٹ میں یہ نکتہ بہت اہم تھا کہ بلراج پونے چار بجے سیٹھ عزیز کے ہاں پہنچا،
اس کا مطلب تھا۔ تھانے سے روانہ ہو کر وہ سیدھا سیٹھ عزیز کے پاس گیا۔ اگر میرا اندازہ
درست تھا کہ انسپکٹر بلراج ملزم کے فرار کا ذمے دار ہے تو پھر سیٹھ عزیز کو بھی اس میں ملوث سمجھ
جا سکتا تھا۔ ڈی ایس پی سے مشورے کے بعد میں اسی وقت روانہ ہوا اور جب صبح کی اذانیں
ہو رہی تھیں ہم سیٹھ عزیز کو گرفتار کیے تھانے میں داخل ہوئے۔
سیٹھ نے اپنی گرفتاری پر بہت شور مچایا تھا اور مسلسل سنگین نتائج کی دھمکیاں دے ر
تھا۔ ہم نے سیٹھ کی کوٹھی کی اچھی طرح تلاشی لی تھی لیکن ملزم وہاں نہیں تھا۔ سیٹھ کے تھانے
پہنچتے ہی وقفے وقفے سے ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ آدھ گھنٹے کے اندر اندر کوئی دس سفارشیں

آئیں جن میں گنپت لال کی سفارش بھی تھی۔ پھر تھانے میں کاروں کی آمد کا سلسلہ شروع
ہوا۔ علاقے کے تین چار نہایت بااثر افراد نے سیٹھ کی ضمانت دینی چاہی لیکن ایس ایس پی
صاحب خود تھانے پہنچ چکے تھے۔ انہوں نے اس دباؤ کو خاطر میں لائے بغیر ہمیں تفتیش کا حکم
دیا۔ ڈی ایس پی صاحب خود سیٹھ عزیز سے پوچھ گچھ کر رہے تھے۔ صبح ساڑھے آٹھ بجے تک
اس نے کچھ نہیں بتایا۔ اب ہمارے پاس صرف دو گھنٹے تھے۔ میں تھانے کے برآمدے میں
ٹہل رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ سیٹھ عزیز کو ولایت علی کے فرار سے کیا فائدہ ہو سکتا
تھا...... اچانک ذہن میں ایک ایسی بات آئی کہ میں اچھل پڑا۔ تقریباً بھاگتا ہوا میں ایس ایس
پی صاحب کے پاس پہنچا۔ بغیر کسی تمہید کے میں نے پوچھا۔
''سر! یہ جلوس جو نکل رہا ہے اس کے پیچھے کس کا ہاتھ ہے؟''
ایس ایس پی چند لمحے مجھے گھورتے رہے پھر بولے۔ ''بھئی کئی لوگ ہیں لیکن...... وہ
کیا نام ہے اس کا گنپت اچاریہ...... اسے کچھ زیادہ تکلیف ہو رہی ہے۔''
ایک لمحے میں میرا دماغ جیسے روشنی سے بھر گیا۔ سب کچھ صاف صاف نظر آنے لگا
تھا۔ میں بغیر کچھ کہے واپس مڑا اور چند سپاہیوں کو لے کر عطاء صاحب کی جیپ کی طرف
بڑھا۔

☆======☆======☆

ٹھیک ڈیڑھ گھنٹے بعد میں جب تھانے جانے والی سڑک کی طرف مڑا۔ ٹریفک پولیس
والوں نے بتایا کہ راستہ بند ہے، ایک جلوس تھانے کی طرف گیا ہے۔ میں نے گھڑی کی
طرف نگاہ دوڑائی گیارہ بجنے والے تھے۔ ملزم ولایت علی دو سپاہیوں کے درمیان پچھلی
نشست پر بیٹھا تھا۔ میں نے جیپ کو ایک دوسری سڑک پر ڈالا اور لمبا چکر کاٹ کر تھانے پہنچ
گیا۔ اس وقت میں نے دیکھا کہ ایک ہجوم جس کے شرکاء کی تعداد کم از کم چار ہزار ہے تھانے
کے قریب پہنچ چکا ہے۔ پولیس والوں نے ہجوم کو قریباً پچاس گز دور روک رکھا تھا۔ مجھے کبھی
اس قسم کی صورتِ حال سے واسطہ نہیں پڑا تھا۔ نہ ہی مجھے معلوم تھا کہ ہجوم سے کس طرح بات
کی جاتی ہے۔ بپھرے ہوئے لوگوں کو کیسے کنٹرول کیا جاتا ہے لیکن نیک نیتی اور سچائی کا جذبہ
تھا جو مجھے سیدھا جلوس کے روبرو لے گیا۔ جیپ کے بریک چرچرائے، میں لاٹھی بردار
پولیس کی دیوار میں راستہ بنا کر آگے بڑھا۔
حسبِ توقع ہجوم میں سب سے آگے مجھے گنپت لال نظر آیا۔ اس کے گرد بپھرے
ہوئے نوجوانوں نے گھیرا ڈال رکھا تھا۔ وہ سب نعرے لگا رہے تھے۔ میں نے ڈی ایس پی

صاحب سے میگا فون طلب کیا۔ (ان دنوں یہ آلہ نیا نیا آیا تھا) میں نے گنپت لال کا نام پکارا تو ہجوم کی نعرہ زنی ماند پڑ گئی۔ میں نے کہا۔

''گنپت لال، کیا مطالبہ ہے تمہارا۔ کیا چاہتے ہو؟''

گنپت لال نے مجھے گھورا پھر بھڑک کر دو قدم آگے آیا۔ ''آگ لگانا چاہتے ہیں ہم اس ظلم کے گڑھ کو...... جہاں سے بے گناہ جنتا پر ظلم ہوتا ہے۔ اگر ہمارا مطالبہ مان سکتے ہو تو بے گناہ ولایت علی ہمیں دے دو، جسے تم نے اپنے تشدد کی بھینٹ چڑھایا ہے...... خون کیا ہے جس کا۔'' گنپت لال نہایت جذباتی ہو رہا تھا۔ لوگ ایک بار پھر فلک شگاف نعرے لگانے لگے۔

''ٹھہرو۔'' میں نے چلا کر کہا۔ ''گنپت لال تمہارا مطالبہ ہم پورا کرتے ہیں۔'' میں نے سب انسپکٹر کو اشارہ کیا اور وہ ولایت علی کو تھامے ہجوم کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ میں نے دیکھا۔ گنپت لال کا چہرہ سیاہ رات کی طرح تاریک ہو گیا ہے۔ وہ پھٹی ہوئی نگاہوں سے ولایت کو دیکھ رہا تھا۔ ہجوم میں ولایت کے کچھ رشتے دار بھی موجود تھے۔ دو آدمی دوڑ کر آگے آئے اور ولایت کو گلے سے لگا لیا۔ میں نے بلند آواز سے پوچھا ''بتاؤ ولایت علی تم کس کی قید میں تھے؟''

ولایت علی کی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ اس نے کمزور سی آواز میں گنپت لال کا نام لیا۔ ولایت علی کے ایک رشتے دار نے میگا فون اس کے ہاتھ سے لے لیا اور عجیب جوش سے بولا ''بھراؤ! پلس دا کوئی قصور نئیں جے سارا کم ایس گنپت لال دا جے......''

مجمع میں سرگوشیاں ابھریں۔ میں گنپت لال کی طرف دیکھ رہا تھا اچانک وہ لڑکھڑایا۔ پھر چند قدم چلا اور اوندھے منہ لوگوں پر گرا۔ اسے دل کا دورہ پڑ گیا تھا۔ پولیس والے تیزی سے اس کی طرف لپکے لوگوں کے ہجوم میں راستہ بنا کر اسے بمشکل پولیس کی گاڑی تک پہنچایا گیا جس وقت گنپت لال ہسپتال روانہ ہو رہا تھا۔ لوگ اس طرح ولایت علی کو دیکھنے کے لیے اُمڈ رہے تھے جیسے وہ مچھلی کے پیٹ سے برآمد ہوا ہو۔

میرا وہ اندازہ درست ثابت ہوا تھا کہ سورگ باشی بلراج نے ہی گنپت لال اور سیٹھ عزیز کے ساتھ مل کر ولایت کو حوالات سے نکلوایا تھا۔ بلراج کے ساتھ دونوں بڑے مجرموں کے گہرے تعلقات تھے۔ اس طرح ان لوگوں نے ایک تیر سے دو شکار کیے تھے۔ بلراج نے مجھ سے بدلہ لینا تھا اور گنپت لال کو وہ شخص مل گیا تھا جسے وہ قتل کرنا چاہتا تھا۔ وہ اسے قتل کر کے چپڑاسی نذیر کی دیرینہ خواہش پوری کرنا چاہتا تھا لیکن پھر حالات بدل

ہوئے کہ لوگ مقامی پولیس سے بدظن ہو گئے اور انہوں نے تھانے کے سامنے احتجاج کیا۔

یہی وہ موقع تھا جب گنپت لال نے ایک تیر سے تیسرے شکار کی ٹھانی۔ وہ مقامی انتظامیہ کو بدنام کرنے کا موقع ہاتھ سے نہیں گنوانا چاہتا تھا۔ اس نے لوگوں کو بھڑکایا کہ ولایت علی پولیس تشدد سے مر گیا ہے لیکن اس مقام پر آ کر انسپکٹر بلراج اور گنپت لال میں اختلاف پیدا ہو گیا۔ انسپکٹر بلراج کی نوکری خطرے میں تھی اور گنپت لال اپنی سیاست چمکا رہا تھا۔ وہ سیٹھ عزیز کو ساتھ لے کر گنپت لال کے گھر گیا اور اسے حوالاتی واپس کرنے کو کہا۔ اس مسئلے پر دونوں میں تلخ کلامی ہوئی جو بعد میں ہاتھا پائی کا رنگ اختیار کر گئی۔ ہاتھا پائی میں انسپکٹر بلراج نے پستول نکالا جس کی گولی اسی کو لگ گئی۔

جب مجھے ایس ایس پی صاحب سے معلوم ہوا کہ اس جلوس کے پیچھے گنپت لال کا ہاتھ ہے تو میں فوراً سمجھ گیا کہ اصل معاملہ کیا ہے۔ میں نے گنپت لال کے گھر چھاپہ مارا اور ولایت علی کو ایک تاریک کمرے سے برآمد کر لیا۔

بعد میں ولایت علی کا کیا ہوا، زلیخا کا کیا بنا۔ اس بارے میں آپ یقیناً جاننا چاہیں گے۔ ملزم نذیر عرف نجا بڑے مجرموں کا ساتھی ثابت ہوا۔ اس پر غبن کا بھی ایک مقدمہ بنا۔ میں نے اس کا چالان تیار کرنے میں کوئی رعایت نہیں برتی۔ مختلف دفعات کے تحت اسے سات سال کی سزا ہوئی۔ دونوں بڑے مجرموں یعنی سیٹھ عزیز اور گنپت لال کو سیشن کورٹ سے موت کی سزا ہوئی جو بعد ازاں ہائی کورٹ نے عمر قید میں تبدیل کر دی۔ زلیخا نے کیس لڑ کر اپنے خاوند سے طلاق بلکہ نجات حاصل کر لی۔ اس کے بعد مجھے ان کے بارے میں کچھ پتہ نہیں چلا۔

ایک دن مقامی ہسپتال سے اطلاع آئی کہ ایک خودکشی کا کیس ہے۔ خودکشی کرنے والی عورت تھی اور اس کا نام زلیخا تھا۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ بہرحال میں بیان لینے کے لیے ہسپتال پہنچا۔ بیڈ پر لیٹی ہوئی عورت کو میں فوراً پہچان گیا وہ زلیخا ہی تھی۔ اس کے قریب کھڑا نوجوان ولایت تھا۔ وہ صاف ستھرے کپڑوں میں ملبوس تھا اور خوشی جیسے اس کے چہرے پر پھوٹی پڑ رہی تھی۔ مجھے اس افسوس ناک واقعے پر نوجوان کی خوشی پر حیرت ہوئی۔ وہ مجھے دیکھتے ہی اٹھ کھڑا ہوا اور ایک جانب لے گیا۔ اس نے انتہائی جوش و خروش سے مجھے بتایا کہ زلیخا بچ گئی ہے...... اور وہ مجھ سے شادی کرنے پر بھی تیار ہو گئی ہے۔

بغیر میرے پوچھے وہ بے تکان بولتا چلا گیا۔ اس کی باتوں سے پتہ چلا کہ دو ڈھائی

سالوں میں اس نے حیرت انگیز ترقی کی ہے اور آج کل ایک برف خانے میں حصے دار ہے۔ وہ زلیخا سے محبت کرتا تھا اور اس سے شادی کرنا چاہتا تھا لیکن وہ کہتی تھی میں اب کبھی شادی نہیں کروں گی۔ اس طویل کشمکش کا انجام زلیخا کے اقدام خودکشی کی صورت میں ہوا تھا......لیکن وہ بچ گئی تھی اور ابھی چند منٹ پہلے اس کہانی کا انجام یہ ہوا تھا کہ اس نے ولایت کی بات مان لی تھی۔ میں نے بستر کی طرف دیکھا۔ اس وقت زلیخا کی نیم وا آنکھیں ولایت کی آنکھوں سے ٹکرائیں اور اس کے زرد چہرے پر دھیمی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ میں نے اس خوش و خرم جوڑے کو پریشان کرنا مناسب نہیں سمجھا اور کیس درج کئے بغیر واپس چلا آیا۔

☆======☆======☆

بُرقع اور جرم

ایک عورت کے لیے کڑا امتحان تھا۔ ایک طرف اس کا مجرم بھائی تھا جس کے پسینے پر وہ خون بہانے کو تیار تھی، دوسری طرف اس کا شوہر تھا جسے صرف اپنے فرض سے غرض تھی اور جو اس کے بھائی کو پھانسی کے تختے تک پہنچانا چاہتا تھا۔

حجام کی دکان پر ہونے والی لڑائی عموماً خطرناک ثابت ہوتی ہے۔ یہ بھی ایک ایسی ہی لڑائی تھی۔ ایک نوجوان لڑکا ڈاڑھی منڈوا رہا تھا۔ ساتھ ساتھ وہ اپنے ایک دوست سے باتیں بھی کرتا جا رہا تھا۔ دونوں کے درمیان گفتگو کچھ اس قسم کی ہو رہی تھی کہ بال کٹوانے کے انتظار میں بیٹھا ہوا ایک ادھیڑ عمر شخص مشتعل ہو گیا۔ دراصل دونوں نوجوان جس لڑکی کے بارے بات کر رہے تھے وہ اُس ادھیڑ عمر شخص کی کچھ لگتی تھی۔ اُس نے طیش میں آکر ڈاڑھی منڈوانے والے لڑکے کا گریبان پکڑ لیا اور دو تین تھپڑ لگائے۔ بات بڑھ گئی۔ لڑکا بھی گرمی کھا گیا اُس نے سامنے ٹیبل پر رکھا ہوا اُسترا پکڑا اور ادھیڑ عمر شخص پر پل پڑا۔ چھڑانے کی کوشش میں نائی اور اُس کا ایک ملازم زخمی ہو گئے۔ لڑکے نے اُسترے کا ایک وار ادھیڑ عمر شخص پر کیا لیکن خوش قسمتی سے اُس نے کوٹ پہن رکھا تھا۔ کندھے پر معمولی زخم آنے کے علاوہ کوئی نقصان نہیں ہوا۔ ہاں بے چارے نائی کی دو انگلیاں کٹ گئیں۔

یہ ایک شہری تھانے کا واقعہ ہے۔ اُن دنوں میں نیا نیا انسپکٹر ہوا تھا۔ سہ پہر کا وقت تھا۔ میں روانگی لکھوا کر ایک تفتیش پر جانے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ چار پانچ افراد تھانے میں داخل ہوئے۔ اُن کی صورتیں اور پھٹے ہوئے لباس یہ بتانے کے لیے کافی تھے کہ وہ لڑ جھگڑ کر آئے ہیں۔ پہلے تو میں نے سوچا کہ یہ معاملہ سب انسپکٹر کے حوالے کر کے اپنے کام پر چلا جاؤں لیکن پھر مجھے اُن میں ایک ایسی صورت نظر آئی جسے دیکھ کر میں رک گیا۔

میں نے فریقین کی بات سنی۔ لڑکا جس نے اُسترا چلایا تھا درزیوں کا کام کرتا تھا۔ شہر کے ایک کاروباری علاقے میں اُس کے باپ کی دکان تھی۔ اُس کا نام غفور تھا۔ لڑکے کا چال چلن کچھ مشکوک تھا۔ صحبت بھی اچھی نہیں تھی۔ میں یہ باتیں اس لیے یقین سے کہہ رہا ہوں کہ یہ لڑکا اسی محلے میں رہتا تھا جہاں میری رہائش تھی۔ میں نے اکثر اُسے گلی کے موڑ پر کھڑے

دیکھا تھا۔ اسی لڑکے کو دیکھ کر میں تھانے سے جاتے جاتے رک گیا تھا۔

مجھے کوئی ایک ماہ پہلے کی بات یاد آ رہی تھی۔ میری بیوی نے بتایا تھا کہ یہ لڑکا ہمارے مالک مکان کی بیٹی پر نظر رکھتا ہے۔ دراصل اُن دنوں میں کرائے کے مکان میں رہتا تھا۔ مکان کچھ اس طرح کا تھا کہ مالک مکان کا اور ہمارا صحن ایک ہی تھا۔ ایک دوسرے کے گھر میں عام آنا جانا رہتا تھا۔ تعلقات کافی قریبی ہو گئے تھے۔ مالک مکان کی چار بیٹیاں تھیں۔ بڑی لڑکی فرزانہ کی عمر کوئی پندرہ سال رہی ہو گی۔ وہ دسویں یا نویں میں پڑھتی تھی۔

میری بیوی نے بتایا تھا کہ یہ لڑکا فرزانہ کے چکر میں دکھائی دیتا ہے۔ اُن کا گھر چند گھر چھوڑ کر تھا لیکن اتنا اونچا تھا کہ وہاں سے باآسانی ہمارے صحن میں نظر پڑ سکتی تھی۔ میری بیوی کا کہنا تھا کہ لڑکا اکثر چھت پر کھڑا ادھر دیکھتا رہتا ہے۔ گلی میں بھی ہمارے گھر کے سامنے گھومتا ہے۔ بہر حال مجھے اس سلسلے میں تردد کی ضرورت نہیں تھی۔ یہ مالک مکان کا معاملہ تھا اور جب اُس نے مجھ سے کچھ نہیں کہا تھا تو میں اس پھڈے میں ٹانگ کیوں اڑاتا۔ تاہم اب اُس لڑکے کو تھانے میں دیکھ کر میں نے اندازہ لگایا کہ ہو نہ ہو یہ اسی لڑکی کا معاملہ ہے۔

تھوڑی ہی دیر میں بات کھل گئی۔ ادھیڑ عمر شخص (جس کا نام شریف تھا) نے بتایا کہ یہ لڑکا نائی کی دکان میں اُس کی بھتیجی کے خلاف نازیبا کلمات ادا کر رہا تھا۔ پہلے تو وہ برداشت کرتا رہا پھر اُس نے لڑکے کو منع کیا جس پر مشتعل ہو کر اُس نے اُسترا پکڑ لیا اور بے دریغ گھمانے لگا۔ یہ شخص جس بھتیجی کا ذکر کر رہا تھا وہ میرے مالک مکان کی بیٹی ہی تھی۔

لڑکے نے کہا۔ ”تھانیدار صاحب! یہ شخص بات بدل رہا ہے۔ اسے صرف اس بات پر غصہ تھا کہ میں پہلے کیوں ڈاڑھی منڈوانے لگا ہوں۔ باقی ساری باتیں اس نے اپنی طرف سے گھڑی ہیں۔“

میں نے نائی، اُس کے ملازم اور ساتھ آنے والے دو آدمیوں سے پوچھ گچھ کی۔ انہوں نے بھی لڑکے کے بیان کی تصدیق کی۔ انہوں نے کہا کہ جھگڑا باری کا تھا۔ بہر حال مجھے جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ نائی اور اُس کے دونوں گاہک دراصل غفورے کے دوست ہیں۔ اس لیے اُس کی تائید کر رہے ہیں۔ ورنہ اُس سمجھدار شخص کو کیا ضرورت تھی اپنی بھتیجی کے بارے میں ایسی بات اچھالنے کی۔

اسی دوران میرا مالک مکان بھی تھانے پہنچ گیا۔ وہ چھوٹی چھوٹی ڈاڑھی والا ایک دبلا پتلا شخص تھا۔ اُسے سب حاجی کہتے تھے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اُس نے حج نہیں کیا تھا۔ حاجی کا لقب پیدائش کے پہلے روز سے اُس کے ساتھ تھا۔ دراصل وہ حج کے دن پیدا ہوا تھا۔ ماں

باپ اُسے ''حاجی'' کہنے لگے۔ اب یہ لقب اتنا پرانا ہو چکا تھا کہ کسی کو اُس کا نام بھی یاد نہیں تھا۔ شہر کے معروف بازار میں اُس کی سلے سلائے کپڑوں کی دکان تھی۔ کافی کھاتا پیتا شخص تھا لیکن ایک کھٹارہ سائیکل پر سفر کرتا تھا۔ فطرتاً وہ خاموش طبع اور امن پسند شخص تھا۔ شاید بیٹیوں کی کثرت نے اُس کے مزاج میں عاجزی پیدا کر دی تھی۔ میں نے اٹھ کر اُس کا استقبال کیا۔ وہ اس مصیبت میں خاصا پریشان دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے علیحدہ کمرے میں اُس سے اس جھگڑے کی بابت پوچھا۔ اُس نے بتایا کہ شریف اُس کا دور کا عزیز ہے اور یہیں قریب ہی رہتا ہے۔ اُس نے جو کچھ کہا ہے درست ہے۔

میں نے کہا۔ ''آپ کا مطلب ہے یہ لڑکا واقعی فرزانہ پر......''

''ہاں...... ہاں۔'' حاجی امین نے بے چینی سے کہا۔ ''میں ایک دفعہ اُسے سختی سے منع بھی کر چکا ہوں لیکن یہ باز نہیں آیا۔ کچھ عرصہ پہلے فرزانہ نے بھی شکایت کی تھی کہ یہ اسکول جاتے وقت اُس کا پیچھا کرتا ہے۔''

حاجی امین یہ بات کہتے کہتے بری طرح لرز رہا تھا۔ شریف آدمی کے دل پر ایسے موقعوں پر جو بیتتی ہے وہی جانتا ہے۔ اُس کا رنگ ہلدی کی طرح زرد ہو رہا تھا۔ میں نے اُسے تسلی دی اور کہا۔ ''حاجی صاحب! آپ بے فکر رہیں۔ اس لڑکے کے کس بل اب میں نکالوں گا۔ یا تو محلہ چھوڑ جائے گا یا انسان کا بچہ بن جائے گا۔''

میں نے حاجی امین اور اُس کے عزیز کو واپس بھیج دیا۔ غفورا اور اُس کے دوست جن میں نائی بھی شامل تھا رحم طلب نظروں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ میں نے غفورے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سب انسپکٹر کو کہا کہ اس ''رانجھے'' کو الٹا لٹکا کر ایسی مرلی پھیرو کہ سارے سُر ٹھیک ہو جائیں۔ سب انسپکٹر میرا اشارہ سمجھ رہا تھا۔ اُس نے غفورے کو پکڑا اور برآمدے میں لے گیا۔ یہاں چھت سے ایک رسہ لٹک رہا تھا۔ اُس نے غفورے کو الٹا لٹکایا اور بید کی چھڑی سے شروع ہو گیا۔

ابھی تین چار چیخیں ہی میرے کانوں تک پہنچی تھیں کہ میں باہر آ گیا۔ میں نے ہیڈ کانسٹیبل کو ہاتھ سے رکنے کا اشارہ کیا۔ الٹا لٹکنے سے غفورے کی پنڈلیوں پر سے شلوار کھسک گئی تھی اور وہاں بیدوں کے سرخ نشان نظر آ رہے تھے۔ ہیڈ کانسٹیبل چھڑی سونتے میرے اگلے حکم کا منتظر تھا لیکن میں نے اُسے غفورے کو اتارنے کی ہدایت کی۔ نہ جانے کیوں مجھے اُس پر ترس آ گیا تھا۔ وہ سترہ اٹھارہ سال عمر کا تھا۔ یہ عمر ہوتی ہی بڑی ظالم ہے۔ ذہن ناپختہ، جذبات کی فراوانی اور اندھی خواہشیں، یہ سب کچھ مل کر نوجوانوں کو عجیب و غریب حرکات پر

اکساتا رہتا ہے۔

تھوڑی ہی دیر کے بعد غفورے کے وارث بھی پہنچ گئے۔ وہ میری منتیں سماجتیں کرنے لگے۔ میں نے حاجی امین وغیرہ کو بھی بلا لیا۔ لڑکے نے معافی مانگی۔ اُس کے وارثوں نے اُس کے آئندہ چال چلن کی ضمانت دی۔ قصہ مختصر فریقین میں صلح نامہ ہو گیا۔

یہ واقعہ چوتھے یا پانچویں روز کا ہے۔ میں صبح کے وقت اٹھا۔ میری بیوی چارپائی پر نظر نہیں آئی۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ گھبرائی ہوئی اندر داخل ہوئی۔

''کچھ سنا آپ نے؟'' اُس نے ہراساں لہجے میں کہا۔ ''درزیوں کا لڑکا غفورا مر گیا...... اُس کی لاش ملی ہے۔''

''کیا کہہ رہی ہو؟'' میں نے حیرت سے کہا۔

اس دوران شکیل بھی اندر گیا۔ شکیل میری بیوی کا چھوٹا بھائی تھا اور اُن دنوں ہمارے پاس ہی رہتا تھا۔ اُس نے بھی گھبرائے ہوئے انداز میں اس خبر کی تصدیق کی۔ وہ بولا۔ ''میں کالج جانے کے لیے نکلا تھا۔ غفورے کے گھر کے سامنے لوگوں کا ہجوم ہے اور عورتیں بَین کر رہی ہیں۔''

اب شبے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ میں نے جلدی جلدی لباس تبدیل کیا اور موقع کی طرف چل دیا۔

☆======☆======☆

غفور کی لاش ایک چھوٹے سے کمرے میں پڑی تھی۔ یہ الگ تھلگ کمرہ محلے کے منچلے لڑکوں کی آماجگاہ تھا۔ وہ اکثر رات گئے تک یہاں بیٹھے گپیں ہانکتے اور تاش کھیلتے تھے۔ فرش پر دری بچھی ہوئی تھی کونے میں ایک چارپائی پڑی ہوئی تھی۔ لاش اسی چارپائی پر تھی۔ ایک دو معزز افراد کمرے کے اندر تھے۔ باہر لوگوں کا ہجوم تھا۔ پولیس کو باضابطہ طور پر اطلاع نہیں دی گئی تھی۔ میں نے احتیاط سے موقعہ کا معائنہ کیا۔ دری شکن شکن تھی۔ سگریٹوں کے ٹوٹے، خالی پیکٹ، پان کی پچکاریاں جابجا دکھائی دے رہی تھیں۔ لاش اکڑ چکی تھی اور رنگ سیاہی مائل نیلا تھا۔ ہونٹوں سے خون کی ایک پتلی لکیر نکل کر کان کے اندر چلی گئی تھی۔ بظاہر ایسا لگ رہا تھا کہ متوفی کو زہر دیا گیا ہے۔ میں نے موقع پر موجود افراد سے پوچھ گچھ کی۔ معلوم ہوا کہ یہ کمرہ ''شاہ'' نامی ایک نوجوان کا ہے۔

وہ یہاں شہر میں ملازمت کرتا ہے۔ پچھلے ایک ہفتے سے وہ گاؤں گیا ہوا ہے۔ اُس کی غیر موجودگی میں اُس کے دوست اس کمرے میں محفل جماتے تھے۔ کمرے کی چابی متوفی کے

پاس ہی ہوتی تھی۔ معلوم ہوا کہ کل رات بھی یہاں چار پانچ لڑکے موجود تھے۔

متوفی کے والد نے روتے ہوئے کہا۔ ''صبح مجھے اُس کی ماں نے کہا کہ غفورا رات بھر گھر نہیں آیا۔ اُس سے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ زیادہ سے زیادہ رات نو بجے تک گھر آ جاتا تھا۔ میں نے پہلے اُس کے چھوٹے بھائی کو بھیجا پھر خود تلاش کرنے نکلا۔ یہاں بیٹھک میں پہنچا تو دروازہ بند تھا لیکن میں نے دباؤ ڈالا تو کھل گیا۔ میرا بیٹا چارپائی پر مردہ پڑا تھا۔ اُس کا آدھا دھڑ چارپائی سے نیچے لٹک رہا تھا۔ میں یہ منظر برداشت نہ کر سکا اور بے ہوش ہو کر دہلیز ہی میں گر گیا۔ ہوش آئی تو دوسرے لوگ جمع ہو چکے تھے۔''

موقع کے معائنے کے دوران ہی میرا اسب انسپکٹر سپاہیوں کے ساتھ پہنچ گیا۔ میں نے اُسے ضروری ہدایات دیں اور تھانے چل دیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد سب انسپکٹر متوفی کے تین دوستوں کو لے کر تھانے پہنچ گیا۔ یہ تینوں بیس سال سے کم عمر تھے۔ ایک پڑھتا تھا اور دو کام کرتے تھے۔ میں نے اُن تینوں کو ایک ساتھ کھڑا کر کے کہا۔

''دیکھو! میں تم سے علیحدہ علیحدہ سوال کروں گا۔ کوشش کرنا کہ جھوٹ نہ بولو۔ اگر تمہارے جوابات ایک دوسرے سے نہ ملے تو تینوں کو اندر کر دوں گا۔'' لڑکے کم عمر تھے اس لیے کافی خوفزدہ دکھائی دیتے تھے۔ اُن میں سب سے چھوٹا بمشکل پندرہ سولہ سال کا رہا ہوگا۔ میں نے اُسے اپنے کمرے میں چلنے کا اشارہ کیا۔ میں نے کہا۔ ''غفورے کی موت سے قبل تم تینوں اُس کے ساتھ موجود تھے۔ ظاہر ہے تم تینوں میں سے ہی کسی نے اُسے زہر دیا ہے۔ اب اگر تم مجھے صاف صاف بتا دو گے تو میرا کام آسان ہو جائے گا۔ ہو سکتا ہے اس سے تمہاری مشکل بھی آسان ہو جائے۔ دوسری صورت میں قاتل کا پتہ تو مجھے چلانا ہی ہے۔''

لڑکے نے کہا۔ ''تھانیدار صاحب! میرا اس قتل سے کوئی تعلق نہیں۔ جو کچھ مجھے معلوم ہے میں سچ سچ بتا دیتا ہوں۔ میں کل رات ساڑھے سات بجے کے قریب بیٹھک میں گیا تھا۔ یونس اور منظور پہلے سے وہاں موجود تھے۔ تینوں تاش کی بازی لگا رہے تھے۔ میں بھی شریک ہو گیا۔ اس دوران کوئی خاص بات نہیں ہوئی سوائے اس کے کہ غفورے نے ایک دفعہ اٹھ کر پانی پیا۔''

میں نے کہا۔ ''مجھے یہ بتاؤ اُس دوران تم میں سے کسی نے اُسے کوئی چیز کھلائی؟''

لڑکے نے فوراً نفی میں جواب دیا لیکن پھر کچھ سوچ کر بولا۔ ''ہاں...... یاد آیا، یونس ایک دفعہ اٹھ کر گیا تھا اور گلی کے پان والے سے سگریٹ اور پان لے کر آیا تھا۔''

''غفورے نے بھی پان کھایا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''ج ج جی ہاں۔'' وہ ہکلا کر بولا۔

''تم کہتے ہو کہ تاش کھیلنے کے دوران دو تین دفعہ اٹھ کر پانی پینے گیا تھا۔ ایسا پان کھانے سے پہلے ہوا تھا یا بعد میں؟''

لڑکا ذہن پر زور دیتا ہوا بولا۔ ''جناب میرا خیال ہے پان کھانے کے بعد ایسا ہوا تھا...... اور ہاں، مجھے لگ رہا تھا کہ کھیل میں بھی اُسے مزہ نہیں آ رہا۔''

لڑکے کی آنکھیں حیرت سے پھیل رہی تھیں۔ شاید اُسے بھی یونس کے کردار پر شبہ ہو رہا تھا۔ میں نے ایک دو باتیں کر کے اُس کے شبے کو ابھارا۔ میں نے پوچھا۔ ''کیا اس سے پہلے یونس اور غفورے میں کوئی تنازعہ موجود تھا؟''

لڑکے نے ذہن پر زور دیا لیکن کوئی ایسی بڑی وجہ دریافت نہ کر سکا جو غفورے کے قتل کا سبب بن سکتی تھی۔

میں نے اُس سے کہا۔ ''جو سوال میں اب پوچھ رہا ہوں اُس کا جواب نہایت سوچ سمجھ کر دینا۔ مجھے یہ بتاؤ فرزانہ والے چکر کا غفورے کے قتل سے کوئی تعلق ہو سکتا ہے؟''

لڑکے نے پریشانی سے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور بولا۔ ''مجھے اس بارے میں زیادہ کچھ معلوم نہیں جناب...... لیکن اگر یہ کام یونس کا ہے تو...... یہ کوئی اور ہی چکر ہوگا۔'' میں غور سے لڑکے کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ دفعتاً اُس کے چہرے کا رنگ تبدیل ہو گیا اور آنکھوں میں سخت حیرت دکھائی دینے لگی۔ اُس نے غور سے میری طرف دیکھا پھر بولا۔ ''جناب! مجھے جو کچھ معلوم ہے میں آپ کو بتا دیتا ہوں...... لیکن آپ وعدہ کریں کہ مجھے چھوڑ دیں گے۔''

میں بھانپ چکا تھا کہ لڑکا کسی اہم نتیجے پر پہنچا ہے۔ میں نے اُس کا حوصلہ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''برخوردار! میں کہہ چکا ہوں کہ اگر میرے لیے آسانی پیدا کرو گے تو تمہارے لیے بھی آسانی ہوگی۔ اگر تم بے قصور ہو تو تم پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔''

لڑکا بولا۔ ''تھانیدار صاحب! ابھی ابھی میرے ذہن میں ایک بات آئی ہے۔ ہو سکتا ہے آپ کی بات درست ہی ہو۔ غفورے کا قتل...... اس لڑکی کی وجہ سے بھی ہو سکتا ہے۔ آپ کو پتہ ہوگا کہ اُس لڑکی کے چچا سے غفورے کا کچھ روز پہلے جھگڑا ہوا تھا۔ اب مجھے یاد آ رہا ہے کہ یونس کا اُس شخص کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا ہے۔ پرسوں ہی میں نے اُن دونوں کو اکٹھے سائیکل پر جاتے دیکھا تھا۔ میں نے سوچا بھی تھا کہ یونس سے اُس بارے میں پوچھوں گا لیکن پھر مجھے یاد ہی نہیں رہا۔ اب مجھے یاد آ رہا ہے کہ اُس وقت یونس مجھے دیکھ کر گھبرا سا گیا تھا۔ اُس سے پہلے بھی ایک دفعہ میں نے اُن دونوں کو سینما ہال میں دیکھا تھا۔''

میں نے کہا۔ ''تمہارا مطلب ہے کہ یونس اُس شخص کے کہنے پر غفورے کو زہر کھلا سکتا

ہے؟''

لڑکا گڑبڑا کر بولا۔''میں یہ نہیں کہہ رہا لیکن......لیکن ہوسکتا ہے کہ غفورے کی موت اِس لڑکی کی وجہ سے ہوئی ہو۔''

میری اگلی گفتگو یونس عرف یونی سے ہوئی۔ وہ بھی درزیوں کا کام کرتا تھا۔ غفورے کے ساتھ اُس کی دوستی پرانی تھی۔ میں نے شکل وشباہت سے اندازہ لگایا کہ وہ ہوشیار اور گہرا لڑکا ہے۔ اُس نے بھی کم وبیش وہی باتیں دہرائیں۔ اُس نے تسلیم کیا کہ وہ گلی کی دکان سے چار الائچی سپاری پان لے کر آیا تھا۔ اُس سے فرزانہ کے بارے میں بھی کچھ مزید باتیں معلوم ہوئیں۔ اُس نے بتایا کہ غفورا اُس کا دیوانہ تھا، تھانے کی ہوا کھا کر اُس کا عشق کچھ اور بھڑک گیا تھا۔ پچھلے دوتین دن سے وہ بہت زیادہ پریشان تھا اور اس پریشانی کا سبب فرزانہ ہی تھی۔

اُس نے مزید بتایا کہ فرزانہ کے بارے میں اُس کی زیادہ گفتگو منظور سے ہوا کرتی تھی۔ وہ اُس سے فرزانہ کو خط بھی لکھوایا کرتا تھا۔ یونس نے جو ایک نئی بات بتائی وہ یہ تھی کہ فرزانہ نے غفورے کو خطوط بھی لکھے تھے۔ میں نے یونس عرف یونی پر پولیس والوں کا مخصوص داؤ آزمانے کی کوشش کی۔ میں نے اُسے کہا کہ فدا حسین (اس کے پہلے دوست) نے مجھے بہت کچھ بتا دیا ہے اور اگر وہ ساری بات سچ سچ نہیں بتائے گا تو اُس کا کیس اور خراب ہو جائے گا۔ وہ خوفزدہ ہو کر قسمیں کھانے لگا کہ اُس معاملے میں اُس کا کوئی ہاتھ نہیں ہے۔

میں نے اُسے کہا کہ وہ پچھلے دوتین روز سے فرزانہ کے چچا سے ملاقاتیں کر رہا ہے آخر کیوں؟ وہ پہلے تو گھبرایا پھر بولا۔

''جناب! چاچے شریف سے میری پرانی سلام دعا ہے ہمارے گھر قریب قریب ہی ہیں۔ راہ میں آتے جاتے آمنا سامنا ہو جاتا ہے۔''

غرض میں نے اُسے کئی طرح سے گھیرنے کی کوشش کی لیکن وہ میرے ڈھب پر نہیں آیا۔ میں نے اُسے باہر بھیج کر منظور کو اندر بلایا۔ یہ ایک دبلا پتلا نوجوان تھا۔ عمر کوئی اٹھارہ سال رہی ہوگی۔ دونوں رخسار غیر معمولی طور پر ابھرے ہوئے تھے۔ میٹرک پاس تھا اور اب پرائیویٹ امتحان کی تیاری کر رہا تھا۔ اُس نے تسلیم کیا کہ وہ غفورے کا رازداں تھا اور غفورے نے ایک دوبار اُس سے فرزانہ کو خط بھی لکھوائے تھے۔ اُس نے اپنے پہلے دوساتھیوں کے بیانات کی تصدیق کرتے ہوئے بتایا کہ رات قریباً سات بجے تک وہ تینوں غفورے کے ساتھ موجود تھے۔ پھر نو ساڑھے نو کے درمیان فدا حسین اور یونس گھروں کو چلے گئے اور وہ غفورے کے ساتھ رہا لیکن دس پندرہ منٹ بعد وہ بھی اپنے گھر کو روانہ ہو گیا۔ اُس نے کہا۔

''انسپکٹر صاحب! میں آپ کو ایک اہم بات بتانا چاہتا ہوں۔ ایسی بات جو فدا حسین اور یونس کو بالکل معلوم نہیں۔'' پھر کچھ دیر سوچ کر بولا۔''انسپکٹر صاحب! میں ڈرتا ہوں کہ آپ اس بات پر یقین نہیں کریں گے......اور ہوسکتا ہے آپ کو مجھ پر غصہ آ جائے......''

میں نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔''دیکھو لڑکے! میرے پاس پہیلیاں بوجھنے کا وقت نہیں جو کچھ معلوم ہے صاف صاف بتا دو۔ ہوسکتا ہے جو تم بتانے جا رہے ہو مجھے پہلے سے معلوم ہو۔''

منظور نے تھوک نگلا اور ڈرامائی لہجے میں بولا۔''انسپکٹر صاحب! کل رات مُنا، غفورے سے ملنے آیا تھا۔''

یہ اطلاع میری سماعت کے لیے بم کے دھماکے سے کم نہیں تھی۔ جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا ہے اُن دنوں بیوی کا چھوٹا بھائی یعنی میرا سالا میرے گھر میں رہ رہا تھا اُس کا نام شکیل تھا لیکن سب مُنا مُنا کہتے تھے۔ اُس نے مقامی کالج میں داخلہ لے رکھا تھا۔ کافی ہونہار لڑکا تھا۔ مجھے اُس میں کبھی کوئی برائی نظر نہیں آئی۔ میری بیوی تو اُس پر جان چھڑکتی تھی۔ یوں بھی اُس کا اکلوتا بھائی تھا۔ میری شادی کو قریباً دوسال ہوئے تھے۔ اُن دوسالوں میں وہ ہمارے پاس ہی رہا تھا۔ مجھے بہنوئی سے زیادہ وہ بڑے بھائی کی طرح سمجھتا تھا اور اسی طرح عزت کرتا تھا...... چند لمحے میں سکتے کے عالم میں بیٹھا رہا۔ پھر میرا ہاتھ بڑھا اور میں نے منظور کا گریبان پکڑ لیا۔''کیا بکتے ہو؟'' میں زور سے دھاڑا۔

منظور نے اپنے حواس درست کیے اور بولا۔''جناب! میں بالکل سچ کہتا ہوں۔ اگر میری بات جھوٹ نکلے تو جو جی چاہے سزا دیں۔''

میں نے کہا۔''کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ غفورے کے قتل میں مُنے کا ہاتھ ہے......لیکن کیوں۔ وہ کیوں قتل کرنے لگا اُسے؟''

منظور نے خوفزدہ نظروں سے میری طرف دیکھا اور جھجک کر بولا۔''انسپکٹر صاحب! وہ......وہ بھی فرزانہ سے......محبت کرتا ہے۔'' یہ میرے لیے دوسرا ذہنی جھٹکا تھا۔ میرے گھر کے اندر یہ کھیل ہو رہا تھا اور مجھے معلوم ہی نہیں تھا......نہیں یقیناً یہ لڑکا جھوٹ بول رہا ہے۔ میں نے اُسے گریبان سے جھنجھوڑا۔

''دیکھو! اگر تمہارے یہ الزامات غلط ثابت ہوئے تو برا حشر ہوگا تمہارا۔''

''جناب! میں آپ کو ثبوت پیش کرسکتا ہوں میرے پاس فرزانہ کے خطوط ہیں جو اُس نے غفورے کو لکھے تھے اور جن میں مُنے کا ذکر بھی ہے۔''

میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا لیکن ایک بات یقینی تھی کہ منظور جو کچھ کہہ رہا تھا اُس میں

کچھ نہ کچھ حقیقت ضرور تھی۔ میں نے اُس کا گریبان چھوڑتے ہوئے خود پر قابو پایا اور اُسے اپنے الزامات کی وضاحت کرنے کو کہا۔ اُس نے کہا۔

”جناب! یہ چکر کوئی ایک سال سے چل رہا ہے۔ پہلے مُنے اور فرزانہ کا چکر شروع ہوا۔ یہ دونوں کافی عرصہ چپکے چپکے ایک دوسرے کو خط لکھتے رہے۔ پھر غفورا بھی فرزانہ سے دل لگا بیٹھا۔ مُنا شروع شروع میں ذرا خاموش طبع اور شرمیلا تھا۔ اُس کے مقابلے میں غفور ذرا تیز طرار اور بے باک تھا۔ دونوں جانتے تھے کہ وہ ایک ہی لڑکی سے محبت کر رہے ہیں اور وہ اُن دونوں کو دھوکا دے رہی ہے اُس کے باوجود دونوں مجبور تھے۔ جہاں تک فرزانہ کا تعلق ہے وہ دونوں کی محبت کا جواب محبت سے دے رہی تھی لیکن ملتی کسی سے بھی نہیں تھی۔ اپنے خطوں میں اُس نے غفورے کی حوصلہ افزائی کی ہے اور ظاہر ہے مُنے کی بھی کی ہوگی۔ دونوں اُس کے عشق میں دیوانے تھے۔

جہاں تک میں جانتا ہوں مُنے کو یہ بات بالکل پسند نہیں تھی کہ فرزانہ اُس کے ساتھ ساتھ غفورے سے بھی تعلق رکھے۔ کوئی ایک ماہ پہلے وہ غفورے سے ملا بھی تھا۔ دونوں نے اس معاملے میں کھل کر بات کی تھی۔ اس ملاقات کے بعد وہ اکثر ایک دوسرے سے ملتے تھے۔ میں نے دو تین بار انہیں اکٹھے دیکھا لیکن کبھی مجھے یہ محسوس نہیں ہوا کہ وہ ایک دوسرے کے دشمن یا رقیب ہیں...... کل رات بھی مُنا غفورے سے ملنے آ رہا تھا۔ غفورے نے مجھے بتایا تھا کہ وہ کوئی اہم بات کرنا چاہتا ہے۔ میں نے غفورے سے کہا تھا کہ میں تمہارے ساتھ رہتا ہوں لیکن وہ کہنے لگا کہ نہیں ہم تنہائی میں بات کرنا چاہتے ہیں۔ ویسے بھی مُنا پسند نہیں کرتا تھا کہ اُن دونوں کی گفتگو میں کوئی تیسرا شخص شریک ہو۔ میں نے غفورے کو محتاط رہنے کا مشورہ دیا اور ساڑھے نو بجے کے قریب بیٹھک سے گھر چلا آیا۔ اُس کے بعد کیا پیش آیا، مجھے کچھ معلوم نہیں۔“

میں نے کہا۔ ”تمہارے خیال میں وہ کیا بات ہو سکتی ہے جو مُنا اُس سے کرنا چاہتا تھا۔“

منظور نے تھوڑی دیر توقف کیا پھر بولا۔ ”انسپکٹر صاحب! وہ تینوں...... میرا مطلب ہے غفورا، مُنا اور فرزانہ عجیب و غریب حرکتیں کرتے رہتے تھے۔ پچھلے دنوں مجھے غفورے نے بتایا تھا کہ کشمکش کا فیصلہ ہونے والا ہے۔ میں نے پوچھا کہ کون سی کشمکش کا کیا فیصلہ ہونے والا ہے۔ غفورے نے بتایا کہ اگلے ہفتے فرزانہ ہم دونوں میں سے کسی ایک کو گھر سے باہر ملے گی۔ جو بھی اُس سے ملاقات کرنے میں کامیاب ہوا وہ دوسرے کو لڈو کھلائے گا اور لڈو کھلانے والا ہمیشہ کے لیے فرزانہ کے راستے سے ہٹ جائے گا۔ میرا خیال ہے کہ یہ کوئی ایسا ہی معاملہ تھا۔

ہوسکتا ہے مُنا، فرزانہ سے ملاقات میں کامیاب ہو گیا ہو اور وہ کامیابی کے لڈو لے کر غفورے کے پاس آیا ہو۔ میں اس بارے جاننے کے لیے بہت بے چین تھا لیکن صبح ہوئی تو غفورا مجھے یہ سب کچھ بتانے کے لیے زندہ نہیں تھا۔“

منظور کی باتیں بظاہر عجیب سی تھیں لیکن مجھے یہ ناقابلِ یقین اس لیے نہیں لگیں کہ مُنا اور غفورا وغیرہ جس عمر سے تعلق رکھتے تھے اس میں ایسی بے وقوفیاں عام سرزد ہوتی ہیں۔ اوائل شباب میں کسی پر عشق کا بھوت سوار ہو جائے تو بڑی مضحکہ خیز حرکات دیکھنے میں آتی ہیں...... لیکن یہاں جو حرکت سرزد ہوئی تھی وہ مضحکہ خیز نہیں، نہایت سنگین تھی۔ ایک نوجوان ہلاک ہو چکا تھا اور مجھے اُس کی موت کا سبب ڈھونڈنا تھا۔ اگر اُسے کسی نے قتل کیا تھا تو قاتل کی تلاش ضروری تھی۔ یہ سوچ کر میں لرز گیا کہ اس قتل کا ذمے دار اگر واقعی مُنا ہوا تو؟

ابتدائی تفتیش اور رپورٹ کے بعد لاش پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوا دی گئی۔ دوپہر کے وقت میں تھانے سے گھر پہنچا۔ مُنا گھر ہی میں تھا۔ وہ چارپائی پر بیٹھا کھانا کھا رہا تھا اور میری بیوی دوپٹے کا پلو ہلا ہلا کر مکھیاں دور ہٹا رہی تھی۔ میرے تیور دیکھ کر وہ کچھ چونکا اور لقمہ اُس کے حلق میں اٹکنے لگا۔

”بسم اللہ بسم اللہ“ میری بیوی نے جلدی سے پانی کا گلاس اُس کی طرف بڑھایا۔ اُس نے پانی کے دو گھونٹ بھرے اور سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ میری بیوی اب میرا چہرہ تک رہی تھی۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ میرے سامنے بیٹھا ہوا یہ لڑکا قاتل ہے...... لیکن حالات کی انگلی دھیرے دھیرے جس شخص کی طرف اٹھ رہی تھی وہ یہی تھا۔ میں نے گھمبیر لہجے میں اُسے کہا کہ وہ کھانا کھا کر فوراً میرے کمرے میں آئے۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر میں بے چینی سے ٹہلنے لگا۔ ذرا دیر بعد میری بیوی اندر داخل ہوئی۔ وہ کچھ ڈری ہوئی تھی۔ کہنے لگی۔ ”کیا بات ہے۔ آپ کچھ غصے میں ہیں۔ مُنے سے کوئی غلطی ہوئی ہے۔“

میں نے کہا۔ ”تم باہر جاؤ اور اسے میرے پاس بھیجو۔ ابھی تمہیں سب کچھ پتہ چل جائے گا۔“ بیوی میرے لہجے پر اور بھی ڈر گئی۔ اس دوران مُنا کپڑے سے ہاتھ پونچھتا اندر آ گیا۔ میں نے بیوی کو باہر بھیج کر دروازہ بند کر لیا۔ جب وہ میری ہدایت پر چارپائی پر بیٹھ گیا تو میں نے کہا۔ ”کل رات ساڑھے نو اور گیارہ بجے کے درمیان تُو کہاں تھا؟“

اُس کا چہرہ تاریک ہو گیا۔ ہکلا کر بولا۔ ”میں اپنے کمرے میں پڑھ رہا تھا۔“

”بکواس بند کر۔“ میں دھاڑا۔ ”تُو اپنے کمرے میں پڑھ نہیں رہا تھا بلکہ شاہ کی بیٹھک

میں غفورے کے پاس تھا۔''

''یہ..... یہ غلط ہے بھائی صاحب۔'' میرا ایک زوردار تھپڑ اُس کے منہ پر پڑا اور وہ چکرا کر رہ گیا۔ میں نے غصے سے کہا۔

''اور یہ بھی غلط ہے کہ تُو نے حاجی صاحب کی لڑکی سے یارانہ لگا رکھا ہے..... اور یہ بھی غلط ہے کہ تُو اسے خط لکھتا ہے اور ملاقاتیں کرتا ہے..... دیکھ مجھے ٹھیک ٹھیک بتا دے کل رات تُو کہاں تھا اور کیا گل کھلایا ہے۔''

وہ قدرے تیزی سے بولا۔ ''تو آپ کا خیال ہے کہ غفورے کو میں نے مارا ہے۔ حیرانگی ہے آپ اتنی آسانی سے مجھ پر یہ الزام لگا رہے ہیں۔''

میں نے چلا کر کہا۔ ''اگر یہ الزام ہے تو بتا کل رات کہاں تھا تُو۔ میں نے خود اِن آنکھوں سے تجھے کمرے سے نکلتے دیکھا تھا۔''

''میں صرف ایک بار پیشاب کرنے باہر نکلا تھا۔''

''پھر وہی جھوٹ۔'' مجھے طیش آ گیا۔ میں نے اُس پر تھپڑوں اور مکوں کی بارش کر دی۔ اس دوران میری بیوی دروازہ پیٹنے لگی۔ میں نے دروازہ کھولا۔ وہ ''ہائے میرا لال'' کہتی ہوئی بھائی سے لپٹ گئی۔ میں نے کہا۔ ''اسے اچھی طرح گلے سے لگا کر چوم چاٹ لے۔ ہوسکتا ہے کل تک یہ سلاخوں کے پیچھے چلا جائے۔''

''کیوں کیا کیا ہے اس نے؟'' وہ ڈر کر بولی۔

''اللہ کرے اس نے کچھ نہ کیا ہو..... لیکن مجھے ایسا لگتا نہیں۔'' میں یہ کہتا ہوا تیز قدموں سے باہر نکل گیا۔

تھانے میں پہنچ کر میں نے اپنا کمرہ بند کیا اور نہایت پریشانی کے عالم میں سوچ بچار کرنے لگا۔ حالات و واقعات سے ظاہر ہوتا تھا کہ تفتیش صرف تین راستوں پر چل سکتی ہے۔ پہلا راستہ اس واقعے سے نکلتا ہے جو چند روز پہلے نائی کی دکان پر پیش آیا تھا جس میں غفور نے اُسترے کے وار سے شریف نامی شخص کو زخمی کیا تھا۔ دوسرا راستہ خود میرے اپنے گھر سے شروع ہوتا تھا اور اگر یہ راستہ درست تھا تو اس کے دوسرے سرے پر میں اپنے سالے کو پھانسی کے تختے پر لٹکتا ہوا دیکھ سکتا تھا۔ تیسری صورت یہ ہوسکتی تھی کہ متوفی نے کسی واقعے سے دل برداشتہ ہو کر خودکشی کی ہو، لیکن اس کا فیصلہ پوسٹ مارٹم رپورٹ اور دوسری شہادتوں کے بعد ہی ہوسکتا تھا۔

غیر ارادی طور پر میرا دل چاہ رہا تھا کہ تفتیش کا پہلا راستہ ہی درست ثابت ہو اور میں

اُس طوفان سے بچ جاؤں جو میرے گھر کے دروازے پر دستک دے رہا تھا..... لیکن ایسا ہوا نہیں۔ اوپر تلے ایسے واقعات ہوئے جنہوں نے میرے گھر کا سکون درہم برہم کر دیا۔

موجودہ حالات میں فرزانہ سے پوچھ گچھ ضروری ہو چکی تھی۔ اگلے روز میں نے اُس کے باپ کو بلایا اور تمام صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ وہ بھلا مانس شخص پیش آنے والے حالات کے تصور سے تھر تھر کانپ رہا تھا۔ میں نے حتی المقدور اُس کی ڈھارس بندھائی اور اپنے پورے تعاون کا یقین دلایا۔ تھوڑی دیر بعد فرزانہ میرے کمرے میں بیٹھی تھی۔ وہ کافی پُرکشش اور شوخ لڑکی تھی لیکن اُس وقت بے حد سہمی ہوئی تھی۔ چہرے پر نیل پڑے ہوئے تھے لگتا تھا باپ نے اسے میرے پاس بھیجنے سے پہلے بری طرح پیٹا ہے۔ وہ مجھے چچا کہہ کر بلاتی تھی۔ میں نے بڑے پیار محبت سے اُس کا خوف دور کیا اور دھیرے دھیرے اسے بولنے کے لیے تیار کر لیا۔ مشکل میں اُس کو ڈھارس بندھانے والا ملا تو وہ زار و قطار رونے لگی۔ میں آہستہ آہستہ اس کے سر پر ہاتھ پھیرتا رہا۔

کچھ بھی تھا وہ ایک نیم پختہ ذہن کی بچی تھی۔ اُس سے غلطیاں ہوئی تھیں اور نہایت سنگین ہوئی تھیں، لیکن اس میں جہاں وہ قصوروار تھی وہاں اُس کے اردگرد کا ماحول اور والدین بھی قصوروار تھے۔ اُس کا باپ صبح کا گیا رات گئے گھر آتا تھا، ماں کو گھومنے پھرنے سے فرصت نہیں تھی۔ نہ مناسب روک ٹوک اور نہ ضروری آزادی۔ ایسے میں کچا ذہن اِدھر اُدھر نہیں بھٹکے گا تو کیا ہوگا۔ بہرحال میں نے لڑکی کا ہمدرد بن کر اُس کے دل کی بات جاننے کی کوشش کی۔ پہلے تو وہ جھجکتی رہی لیکن جب میں نے اُسے اپنی معلومات سے آگاہ کیا تو وہ آہستہ آہستہ ذہن کی گرہیں کھولنے لگی۔ اُس کی طویل گفتگو کا لبِ لباب یہ ہے۔

منظور کی کہی ہوئی زیادہ تر باتیں درست تھیں۔ لڑکی مُنے اور غفورے دونوں کی حوصلہ افزائی کر رہی تھی۔ یہ سب کچھ اُس نے شغل کے طور پر شروع کیا تھا لیکن آہستہ آہستہ معاملہ سنجیدہ ہوتا گیا تھا۔ وہ دونوں اُسے اپنی طرف راغب کرنے کی کوشش میں لگے رہتے تھے۔ پچھلے چند دنوں سے یہ دوڑ اور بھی شدید ہوگئی تھی۔ مُنے اور غفور نے اسے کئی خط لکھے تھے جن میں اسے گھر سے باہر ملنے کی درخواست کی گئی تھی۔ فرزانہ یہ سمجھتی تھی کہ اب وہ مرحلہ آ گیا ہے جہاں اسے دونوں ''دوستوں'' میں سے ایک کا انتخاب کر لینا چاہیے۔ کئی روز فیصلے کی سُولی پر لٹکنے کے بعد اُس نے دو دن پیشتر مُنے سے ملاقات کی تھی۔ یہ ملاقات ایک معروف تاریخی سیرگاہ میں ہوئی تھی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ لڑکی کو اس معاہدے کا کوئی علم نہیں تھا جس میں دونوں لڑکوں نے اپنے طور پر فیصلہ کیا تھا کہ جو فرزانہ سے ملنے میں کامیاب ہوا وہ اس کھیل کا

تنہا کھلاڑی تسلیم ہوگا۔

فرزانہ سے پوچھ گچھ کے بعد مُنے کے متعلق میرے شبہات کو تقویت ملی...... ذہن پر تھوڑا سا زور ڈالا تو بہت سی کڑیاں آپس میں مربوط ہونے لگیں۔ اگر فرزانہ چندروز پہلے مُنے سے ملی تھی تو منظور کا لگایا ہوا اندازہ درست ثابت ہوتا تھا۔ فرزانہ سے ملنے کے بعد مُنا اُس رات غفورے سے ملا تھا...... وہ شرط جیت گیا تھا اور شرط کے مطابق اُس کے پاس لڈوؤں کا لفافہ تھا لیکن یہ لڈو دراصل قتل کے ہتھیار تھے۔ مُنے نے زہریلے لڈو کھلا کر غفورے کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا لیکن یہاں سوچنے کی بات تھی اگر مُنا شرط جیت گیا تھا تو پھر اسے زہریلے لڈو کھلانے کی کیا ضرورت تھی۔ اُس کے راستے کی رکاوٹ تو خود بخود دور ہو رہی تھی۔ غفورا ان دونوں کے درمیان سے نکل رہا تھا۔

پھر ایک اور خیال میرے ذہن میں آیا اور امید کی ایک روشن کرن دکھائی دی۔ اگر مُنا اس کھیل میں کامیاب رہا تھا تو زیادہ امکان اس بات کا تھا کہ غفورے نے دل برداشتہ ہو کر خودکشی کی کوشش کی ہو...... میں نے اس پہلو سے غور کیا تو گتھی سلجھی ہوئی محسوس ہوئی۔ غفورا یقیناً خودکشی کا مرتکب ہوا تھا۔ مُنے نے اُسے اپنی کامیابی کی اطلاع دی تھی اور یہ اطلاع اُس کی تمام امیدوں پر پانی پھیر گئی تھی۔ مُنے کے جانے کے بعد وہ گھر نہیں گیا تھا۔ اُس نے بیٹھک کا دروازہ بند کر کے زہر کھایا تھا اور وہیں چارپائی پر لیٹ رہا تھا۔

اُسی روز شام کے وقت پوسٹ مارٹم رپورٹ بھی آگئی۔ رپورٹ میں موت کی وجہ زہر خورانی بتائی گئی تھی۔ زہر رات دس اور گیارہ کے درمیان دیا گیا تھا۔ موت کوئی بارہ بجے ہوئی تھی۔ معدے سے ملنے والے مواد میں پان، لڈو اور چائے کے اجزاء موجود تھے۔ میری سابقہ معلومات کی روشنی میں یہ بات ثابت ہو جاتی تھی کہ مُنا اُس رات متوفی سے ملا تھا اور اُس نے اسے لڈو کھلائے تھے۔ کیمیکل ایگزامینر کی رپورٹ یہ بات بتانے سے قاصر نظر آتی تھی کہ متوفی کے معدے اور انتڑیوں میں پایا جانے والا زہر کس چیز میں ملا کر کھلایا گیا تھا۔

☆======☆======☆

میں چونکہ خودکشی کی لائن پر سوچ رہا تھا اس لیے میں نے اگلے روز غفورے کے دوستوں اور ملنے جلنے والوں سے ملاقات کی اور مذکورہ شک ذہن میں رکھتے ہوئے ان سے سوالات کیے۔ اس مغز کھپائی سے پتہ چلا کہ غفورا اُس سے پہلے بھی خودکشی کی ایک کوشش کر چکا تھا۔ یہ واقعہ جس طرح میرے کانوں تک پہنچا میں من وعن آپ کو بتا دیتا ہوں۔

پتہ چلا کہ کچھ عرصہ پہلے غفورے نے اپنے بڑے بھائی کی بیوی سے ناجائز تعلق

قائم کرنے کی کوشش کی تھی۔ اُس کا بڑا بھائی دوسرے شہر میں کام کرتا تھا۔ اس کی غیر موجودگی میں یہ شاخسانہ شروع ہو گیا۔ ایک رات غفورے نے مبینہ طور پر گھر کے تمام افراد کو کوئی نشہ آور چیز پلا دی۔ رات گئے جب وہ بری نیت سے بھائی کی بیوی کے پاس پہنچا تو اُس نے غفورے کو بری طرح پیٹ ڈالا۔ شور سن کر گھر کے کچھ اور افراد بھی جاگ گئے۔ اس واقعے کی خبر گھر سے باہر بھی نکلی اور محلے میں خوب چرچا ہوا تھا۔ غفورے کو سخت سرزنش کا سامنا کرنا پڑا۔ یقیناً اسی واقعہ سے متاثر ہو کر اس نے خودکشی کی کوشش کی تھی۔ اُس نے نیلا تھوتھا کھا لیا تھا لیکن بروقت طبی امداد سے جان بچ گئی۔ اس شہادت سے دو باتیں سامنے آئیں۔ غفورا ڈھیلے کردار کا لڑکا تھا اور اس سے پہلے بھی اُس نے خودکشی کی کوشش کی تھی۔

میں نے مُنے سے ایک بار پھر تفصیلی بات چیت کی۔ اُس روز میں نے اُسے تھانے ہی بلا لیا۔ وہ اب تک سخت خوفزدہ تھا۔ ایک روز پہلے اُس نے اپنی بہن کے سامنے اعتراف کر لیا تھا کہ وہ رات کو غفورے کے پاس گیا تھا اور اسے لڈو بھی کھلائے تھے لیکن اس سے زیادہ اُس نے کچھ نہیں کہا تھا۔ اُس کی بہن یعنی میری بیوی بھی بڑی بڑی قسمیں کھا رہی تھی کہ اُس کا بھائی ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں نے مُنے سے کہا کہ اگر غفورے کی ہلاکت میں اُس کا ہاتھ نہیں تو پھر اُس کی موت کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔ مُنے نے جو جواب دیا وہ میری توقع کے عین مطابق تھا اور اُس سے میری کافی تسلی بھی ہوئی۔ اُس نے کہا۔

''بھائی صاحب! میں سوچتا ہوں اُس نے خودکشی کی ہے۔ مجھ سے ملنے کے بعد وہ سخت پریشان ہو گیا تھا۔ اُس وقت مجھے امید نہیں تھی کہ وہ اپنی جان لینے کی کوشش کرے گا۔ کاش مجھے اُس وقت اُس کے ارادے کا علم ہو جاتا۔'' مُنے نے یہ بھی بتایا کہ اُس کے آنے کے بعد غفورا بیٹھک ہی میں رہا تھا اور اُس نے اندر سے کنڈی لگا لی تھی۔

بہرحال غفورے کی ہلاکت کے بعد چوتھے دن کی شام تک میں اس نتیجے پر پہنچ چکا تھا کہ یہ خودکشی کا کیس ہے لیکن پھر جیسا کہ میں نے بتایا ہے، اوپر تلے چند واقعات ایسے ہوئے جنہوں نے میری تفتیش کی عمارت دھڑام سے نیچے گرا دی اور ایک بار پھر میری نظریں مُنے پر جم گئیں۔ اُس روز شام کے وقت تھانے کے پتے پر ایک خط موصول ہوا۔ پتے کے ساتھ میرا نام بھی لکھا ہوا تھا۔ میں نے لفافہ چاک کیا۔ یہ ایک گمنام خط تھا، لیکن مفصل اور حیرت انگیز حد تک مدلل۔ لکھنے والے نے اپنے خیالات نہایت مؤثر طریقے سے بیان کیے تھے۔ مضمون کچھ یوں تھا۔

''انسپکٹر صاحب! غفورے کو قتل کیا گیا ہے۔ قاتل آپ کے گھر میں ہے۔

میں آپ کو اس بات کا ثبوت فراہم کرسکتی ہوں۔ بدھ کی دوپہر یعنی غفورے کے قتل سے ایک روز پہلے ایک برقعہ پوش عورت شہر سے باہر کچی آبادی میں پہنچی تھی۔ وہاں ''راول'' نامی ایک جوگی سے اُس نے زہر خریدا تھا۔ یہ برقعہ پوش دراصل آپ کا برادرِ نسبتی شکیل عرف مُنا تھا۔ اُس نے جو زہر خریدا تھا اُس کا کچھ حصہ اب بھی اُس کے پاس موجود ہے۔ اگر آپ کوشش کریں گے تو مُنے کے سائیکل کی گدی کے نیچے ایک چھوٹی سی پُڑیا آپ کو مل جائے گی لیکن ہوسکتا ہے وہ پڑیا آپ کو نہ ملے۔ میں ایک دوسرا ثبوت فراہم کرتی ہوں۔ وہی برقعہ پوش عورت آپ کے محلے میں مختار نامی حلوائی کے پاس بھی گئی تھی۔ اُس نے کہا تھا کہ اُسے لڈو چاہئیں۔ حلوائی کے پاس بوندی کے سخت لڈو تھے۔ اس عورت نے کہا تھا کہ اسے موتی چُور کے نرم لڈو چاہئیں۔ حلوائی نے کہا تھا کہ وہ موتی چُور لڈو نہیں بناتا لیکن موٹی بوندی کے تازہ لڈو بننے والے ہیں۔ عورت تازہ لڈوؤں کے انتظار میں آدھ گھنٹہ دکان پر کھڑی رہی تھی۔ تازہ لڈو نرم ہوتے ہیں اور توڑ کر باآسانی بنائے جاسکتے ہیں۔ آپ میری بات سمجھ رہے ہوں گے۔ ایک تیسرا ثبوت اب میں آپ کو فراہم کرتی ہوں اور آپ اسے جھٹلا نہیں سکیں گے۔ آپ ایک ذہین پولیس والے ہیں لیکن یہ بات آپ کی سمجھ میں نہیں آئی۔ ظاہر ہے آپ کا برادرِ نسبتی دو یا تین لڈو لے کر تو مقتول کے پاس نہیں گیا تھا۔ اس کے پاس کم از کم ایک آدھ سیر لڈو ہوں گے۔ مقتول نے تمام لڈو تو نہیں کھائے ہوں گے۔ پھر باقی لڈو کدھر گئے۔ جی ہاں...... وہ لڈو موقعہ سے اٹھا لیے گئے تھے اس لیے کہ وہ زہریلے تھے۔ اب آپ سوچ رہے ہوں گے وہ لڈو کہاں ہیں۔ میں آپ کو بتاتی ہوں...... آپ کے گھر کے پچھواڑے کوڑے کرکٹ سے بھرا ہوا ایک چھوٹا سا گڑھا ہے۔ یہ لڈو لفافے میں بند اسی کوڑے میں پڑے ہیں۔ اب ایک ایسا ثبوت آپ کو فراہم کرتی ہوں جو اس قتل کا معمہ صاف صاف حل کردے گا۔ محلہ ''سادھو نگر'' میں ایک دوائیوں کی دکان ہے ڈاکٹر مہتا وہاں بیٹھتے ہیں۔ قتل کی رات وہ آپ کے محلے میں ایک مریض کو دیکھ کر سائیکل پر سوار واپس جارہے تھے۔ انہوں نے شکیل عرف مُنے کو دیکھا۔ وہ ایک گلی سے نکلا اور گھبراہٹ میں ان کی سائیکل سے آٹکرایا۔ ڈاکٹر مہتا سے ایک دوبار اس نے دوائی لی تھی۔ وہ اسے پہچان گئے۔ انہوں نے اس سے پریشانی کی وجہ پوچھی وہ کچھ نہ بتا سکا۔ اس کے ہاتھ میں وہی لفافہ تھا جو

اس وقت آپ کے گھر کے پچھواڑے پڑا ہے اور جس میں سے اس نے غفور کو زہریلے لڈو کھلائے تھے۔ سائیکل سے ٹکرانے کے بعد یہ لڈو گر گئے تھے اور ڈاکٹر مہتا نے اپنے ہاتھوں سے دوبارہ لفافے میں ڈالے تھے۔ وہ اس لفافے اور ان لڈوؤں کو باآسانی پہچان سکتے ہیں۔ میرے خیال میں یہ شہادتیں جرم کو بے نقاب کرنے کے لیے کافی ہوں گی۔

آپ سوچتے ہوں گے میں کون ہوں اور مجھے یہ سب باتیں کیسے معلوم ہیں۔ آپ یہ بھی سوچتے ہوں کہ میں یہ سب کچھ مُنے کو پھنسوانے کے لیے کسی کی ایماء پر لکھ رہی ہوں۔ یقین جانیے میں نے جو کچھ لکھا ہے اپنی مرضی سے لکھا ہے۔ آپ کے ذہن میں اٹھنے والے پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ مُنے سے میرا قریبی تعلق رہا ہے......اور میں ایک مظلوم لڑکی ہوں اور یہی مظلومیت میرے قلم اٹھانے کا سبب بنی ہے۔''

یہ خط ایک دھماکے سے کم نہیں تھا۔ میں فوراً تھانے سے اٹھا اور خط کے الزامات کی تصدیق کے لیے چل دیا۔ مختصراً سب سے پہلے میں کچی آبادی میں پہنچا۔ وہاں سے حلوائی مختار کی دکان پر آیا اور وہاں سے اپنے گھر کا پچھواڑہ دیکھا۔ تینوں اطلاعات بالترتیب درست ثابت ہوئیں۔ یقیناً چوتھی اطلاع بھی درست تھی۔ مُنے کی سائیکل کی گدی کے نیچے ایک پُڑیا موجود تھی لیکن وہ پھٹ گئی تھی اور اسپرنگوں میں کاغذ کا ایک ٹکڑا اٹکا رہ گیا تھا۔ آخری ثبوت کے لیے میں قریبی محلے سادھو نگر گیا۔ ڈاکٹر مہتا کھچڑی ڈاڑھی والا ایک شریف النفس سکھ تھا۔ وہ محض ایک کمپاؤنڈر تھا مگر خاصا قابلِ معالج تھا۔ اس لیے گاؤں والے اسے ڈاکٹر ہی کہتے تھے۔ میں نے اسے کوڑے سے برآمد ہونے والا لفافہ دکھایا اور تفصیلی گفتگو کی۔ جب میں اس کی دکان سے نکلا میرے ذہن سے مُنے کے قاتل نہ ہونے کا ہر شبہ دور ہو چکا تھا۔

تھانے آکر میں بے دم سا ہو کر کرسی پر گر گیا۔ میرا اسب انسپکٹر میری ہدایات کے مطابق غفورے کے تمام خطوط جمع کرچکا تھا۔ ان میں سے کچھ خطوط منظور کے پاس تھے اور کچھ اس کے اپنے سامان میں۔ میں خالی خالی نظروں سے یہ خطوط دیکھتا رہا۔ آخر میں ایک ایسا خط نظر سے گزرا جس سے یہ بات مزید یقینی ہوگئی کہ غفورے نے خودکشی نہیں کی۔ یہ خط غفورے نے اپنی موت کے روز صبح کے وقت لکھا تھا۔ یہ خط اس کی اپنی لکھائی میں تھا۔ غفورا خود بھی لکھ سکتا تھا لیکن شکستہ ہینڈ رائٹنگ کے علاوہ اردو بھی واجی سی آتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ فرزانہ کے خط اپنے دوست منظور سے لکھواتا تھا۔ مذکورہ خط اس نے اپنے جگری یار ''شاہ'' کو لکھا تھا۔ یہ وہی

شاہ ہے جس کے کمرے میں وہ مُردہ پایا گیا۔ خط کا مفہوم یہ تھا۔

"فرزانہ کا قصہ انجام کی طرف بڑھ رہا ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ مُنے سے ملی ہے۔ آج رات مُنا مجھ سے ملنے آرہا ہے بہرحال کچھ بھی ہے میں ہار ماننے والا نہیں۔ شرط ہار بھی گیا تو فرزانہ کو نہیں ہاروں گا......"

موت سے چند گھنٹے قبل لکھا گیا یہ خط صاف بتا رہا تھا کہ غفورے کا ارادہ خودکشی کا بالکل نہیں تھا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ مُنا فرزانہ سے ملا ہے۔ لہٰذا اس کے دل برداشتہ ہونے کی بھی کوئی وجہ نہیں تھی۔ اس خط سے اس سوال کا جواب بھی مل جاتا تھا کہ فرزانہ کی محبت جیت کر بھی مُنے نے غفورے کو قتل کیوں کیا۔ درحقیقت وہ جان چکا تھا کہ غفورا ان دونوں کا پیچھا نہیں چھوڑے گا۔ شدید رقیبانہ جذبات کے تحت اس نے اسے قتل کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

اب انتظار فضول تھا۔ شواہد چلا چلا کر کہہ رہے تھے کہ مُنا مجرم ہے۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ جس لڑکی نے مُنے کا بھانڈا پھوڑا ہے وہ نہ صرف اس کی گہری رازداں تھی بلکہ دلی طور پر اس سے متنفر بھی تھی۔ اس نے اپنے خط میں واضح طور پر اشارہ دیا تھا کہ اگر میں نے اپنی بیوی کے بھائی کے خلاف کارروائی سے دریغ کیا تو وہ اس خط کی ایک نقل میرے اعلیٰ افسران کو بھیجے گی۔ اگر اس کے خط میں یہ دھمکی نہ بھی ہوتی تو بھی میں مجرم کو چھوڑنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ یہ میرے کردار کی کڑی آزمائش تھی اور مجھے اس آزمائش سے گزرنا تھا۔

میں تھانے سے فوراً گھر کی طرف روانہ ہوا۔ گھر پہنچا تو پتہ چلا کہ مُنا غائب ہے۔ میری بیوی نے بتایا کہ وہ سہ پہر کا گیا واپس نہیں آیا، لیکن میں جانتا تھا کہ وہ واپس آیا ہوگا۔ دراصل میری بیوی بھانپ چکی تھی کہ میں اس کے بھائی کے خلاف کوئی کارروائی کرنے والا ہوں۔ اس نے اسے مطلع کر دیا تھا اور وہ بھاگ گیا تھا۔ میرے غصے کی کوئی انتہا نہ رہی۔ نہ جانے میرے منہ سے کیا کیا نکلا۔ وہ سنتی رہی اور آنسو بہاتی رہی۔ میں اس کی مجبوری سمجھ رہا تھا۔ وہ ایک اکلوتے بھائی کی بہن تھی لیکن وہ جذبات میں اپنا دوسرا رشتہ فراموش کر رہی تھی۔ اس کا یہ رشتہ ایک ذمے دار پولیس اہلکار سے تھا۔

یہ میرا خانگی جھگڑا تھا اور شاید قارئین کو اس سے دلچسپی بھی نہ ہو۔ لہٰذا میں تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔ بہرحال میرے سسرال والے اس معاملے میں کود پڑے اور انہوں نے جھگڑے کو سنگین تر بنا دیا۔ ایک سسرالی رشتہ دار جو خود پولیس میں تھا اور میرا اہم منصب بھی، اس معاملے کو بگاڑنے کا خاص سبب بنا۔ اس نے کہا کہ نواز خان جان بوجھ کر کیس خراب کر رہا ہے۔ وہ باآسانی مُنے کو مشکوک افراد کی فہرست سے خارج کر سکتا ہے......اس پر صرف

دیانتداری کا بھوت سوار ہے۔ اس نے کچھ ایسے نکتے بیان کیے جن سے مُنا بالکل بری الذمہ ہو جاتا تھا۔

اسی دوران اس گمنام لڑکی نے حسبِ تنبیہہ ایک خط افسرانِ بالا تک پہنچا دیا۔ جیسا کہ میں بتا چکا ہوں گمنام ہونے کے باوجود وہ ایسا مدلل خط تھا کہ اگر کسی اور انسپکٹر کے خلاف ہوتا تو اسے صفائی کا موقع دیئے بغیر لائن حاضر کر دیا جاتا لیکن افسرانِ بالا میرے بارے میں بڑے اچھے خیالات رکھتے تھے۔ ایس پی صاحب نے مجھے ہیڈکوارٹر بلایا اور بڑی نرمی سے بتایا کہ بھئی تمہارے خلاف ایک چٹھی آئی ہے۔ میرا ہندو سب انسپکٹر بھی وہیں موجود تھا۔ میری آمد سے قبل اس سے بھی پوچھ گچھ کی گئی تھی۔ وہ ایک کینہ پرور شخص تھا۔ مجھے توقع تھی کہ اس نے میرا دفاع کرنے کی بجائے ایک آدھ بات زیادہ ہی لگائی ہوگی۔ وہاں جو گفتگو ہوئی وہ تکنیکی بحث کے زُمرے میں آتی ہے۔ میں اس کی تفصیل بیان کر کے واقع کو طول نہیں دوں گا۔ مختصر یہ کہ ایس پی صاحب نے کہا۔

"انسپکٹر نواز! مجھے تم پر مکمل بھروسہ ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ملزم کے رشتے دار ہونے یا نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تم اپنا فرض پوری دیانتداری اور مہارت سے انجام دو گے۔ بہرحال میں تمہیں بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ اس معاملے کی بھنک "اوپر" تک پہنچ چکی ہے۔"

میں ایس پی صاحب کی بات سمجھ رہا تھا۔ ہر پیشے اور شعبے میں خیرخواہ اور بدخواہ موجود ہوتے ہیں۔ میرے وہ ساتھی جو میری فرض شناسی کا ذکر تلخ الفاظ میں کیا کرتے ہیں۔ افواہ سازی کے اس سنہری موقع کو ہاتھ سے گنوانا نہیں چاہتے تھے۔ ان کی عنایات سے یہ خبر افسرانِ بالا کے کانوں تک پہنچ چکی تھی اور اب......ایس پی صاحب مجھے تنبیہہ کر رہے تھے کہ "نواز خان! ذرا سنبھل کے۔"

میں ایک طویل سانس لے کر اٹھا اور ایس پی صاحب سے کہا۔ "سر! آپ کو یہ وردی کبھی دھوکا نہیں دے گی۔" پھر سیلوٹ کر کے میں تیز قدموں سے باہر نکل آیا۔

☆======☆======☆

میری بیوی میرے سامنے بیٹھی تھی۔ رو رو کر اس کی آنکھیں سُرخ ہو رہی تھیں۔ وہ جانتی تھی میں اس کے پاس کیوں آیا ہوں۔ میں اس سے شکیل عرف مُنے کا پتہ پوچھنے آیا تھا۔ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ مُنے کو اس نے بھیجا ہے اور وہی اس کے ٹھکانے سے آگاہ ہے۔ ایک عورت کے لیے یہ ایک بہت بڑا امتحان تھا ایک طرف اس کا بھائی تھا جو مجرم تھا لیکن جسے وہ اپنے بچوں کی طرح چاہتی تھی، جس کے پسینے پر وہ خون بہانے کو تیار رہتی تھی اور دوسری طرف

اس کا شوہر تھا۔ جس کے چہرے پر ہمدردی اور رحم کا شائبہ تک نہیں تھا۔ جسے صرف اپنے فرض سے غرض تھی...... اور جو اس کے بھائی کو پھانسی کے تختے تک پہنچانا چاہتا تھا۔

ہم دونوں کے درمیان کافی دیر ایک بوجھل خاموشی حائل رہی۔ پھر میں نے سنبھل سنبھل کر کہا۔ ''منے کا ملنا بہت ضروری ہے۔ میں تم سے صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ تم میری مدد کرو گی یا مجھے اپنے طور پر اس کا پتہ چلانا ہوگا۔''

''کیا کوئی تیسرا راستہ نہیں؟'' میری بیوی نے پوچھا۔

''نہیں۔'' میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

میری بیوی نے اس وقت مُنے کے بارے میں کچھ نہایت جذباتی باتیں کیں لیکن میرے پایۂ استقامت میں لغزش نہیں آئی۔ میں نے اسے کہا۔ ''یوں آنسو بہانے اور گریہ زاری سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ وہ ملزم ہے اور اگر مجرم ثابت ہوتا ہے تو اسے کیے کی سزا ملے گی۔''

''چاہے وہ پھانسی ہو۔'' میری بیوی نے پوچھا۔

''ہاں چاہے وہ پھانسی ہو۔'' میں نے کہا۔

اس نے عجیب نظروں سے مجھے دیکھا۔ ان نظروں میں دنیا جہاں کی عورتوں کا دکھ سمٹ آیا تھا۔ ان تمام عورتوں کا دکھ جو مردوں سے پیار کرتی ہیں۔ سخت گیر باپوں سے، خودغرض بھائیوں سے، پیٹنے والے شوہروں سے اور...... رات دیر سے لوٹنے والے بیٹوں سے۔ وہ سب انہیں دکھ دیتے ہیں کوئی کسی طرح اور کوئی کسی طرح۔ ہاں ان تمام عورتوں کا دکھ اس کی آنکھوں میں تھا۔ پھر اس نے کہا۔

''میں آپ کو اس کا پتہ دیتی ہوں...... لیکن اس کے بعد میں کبھی آپ کو اپنی شکل نہیں دکھاؤں گی۔''

میں نے بیوی سے اس کے بھائی کا پتہ پوچھا اور ایک چھاپہ مار پارٹی کے ساتھ روانہ ہو گیا۔

☆======☆======☆

ملزم کو ایک گاؤں سے گرفتار کیا گیا۔ میری بیوی نے اسے اپنی ایک منہ بولی بہن کے پاس بھیج دیا تھا۔ گرفتاری کے دوران کوئی اہم واقعہ پیش نہیں آیا سوائے اس کے کہ جب ہم مُنے کو گرفتار کرنے گھر میں داخل ہوئے تو ایک پہلوان نما شخص نے پولیس پارٹی پر حملہ کر دیا۔ بہرحال تھوڑی سی کوشش سے اسے قابو کر لیا گیا۔ یہ شخص اس عورت کا خاوند تھا جس نے مُنے کو پناہ دے رکھی تھی۔

مُنے کو عدالت میں پیش کر کے میں نے ریمانڈ لے لیا۔ بعد ازاں تین چار روز میں چالان مکمل کر کے عدالت میں پیش کر دیا۔ اپنی طرف سے میں نے فرض نبھانے میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔ ملزم کے خلاف شہادتیں کافی مضبوط تھیں۔ سیشن سے اسے سزائے موت ہوئی۔ ان لوگوں نے ہائی کورٹ میں اپیل کر دی۔ مقتول پارٹی بھی پورا زور لگا رہی تھی۔ امید نہیں تھی کہ سزا میں تخفیف ہو سکے گی۔

میری بیوی اسی روز اپنے گھر واپس چلی گئی تھی جس روز میں نے ملزم کا چالان مکمل کیا تھا۔ سسرالی عزیزوں کی طرف سے مجھے خطرناک نتائج کی دھمکیاں بھی دی گئیں لیکن میں اپنے کام میں جتا رہا۔ میں جانتا تھا کہ سچ پر ہوں اور سچ کو آنچ نہیں۔

اس واقعہ کو تقریباً ڈیڑھ برس گزر گیا۔ حالات جوں کے توں رہے۔ وہ گرمیوں کی ایک تاریک رات تھی۔ اداس اور حبس زدہ۔ میں نو بجے کے قریب گھر آیا...... ہوٹل کے پکے ہوئے کھانے کو دوبارہ گرم کیا۔ چند لقمے لیے پھر خود ہی چارپائی بچھائی اور لیٹنے کی تیاری کرنے لگا۔ اس وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے وہیں صحن سے آواز دے کر کہا۔ ''دروازہ کھلا ہے آجاؤ۔'' آنے والا ایک درمیانی عمر کا سکھ تھا۔ کسی گھر کا نوکر دکھائی دیتا تھا۔ اس نے ست سری اکال کر کے کہا۔

''تھانیدار صاحب! آپ کو ڈاکٹر صاحب نے بلایا ہے...... ڈاکٹر مہتا نے۔ ان کی حالت بہت خراب ہے۔ وہ ہسپتال میں ہیں۔''

میں نے تفصیل پوچھی تو اس نے بتایا کہ آج شام سائیکل پر آتے ہوئے ان کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ انہیں سخت چوٹیں آئی ہیں۔ وہ آپ سے کوئی ضروری بات کرنا چاہتے ہیں اور تاکید کی ہے کہ آپ کو لے کر آؤں۔ میں تھکا ماندہ آیا تھا لیکن نہ جانے جی میں کیا آئی کہ اس کے ساتھ چل دیا۔

ہسپتال، مہتا کے پاس پہنچا تو وہ پٹیوں میں جکڑا پڑا تھا۔ لاری نے ٹکر ماری تھی۔ ٹانگوں اور چھاتی پر شدید چوٹیں آئی تھیں۔ خون اور گلوکوز لگا ہوا تھا۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ ان کی حالت بار بار خراب ہو جاتی ہے۔ آپ جلد بات کر لیں۔ میں مہتا کے پاس پہنچا تو وہ پہچان کر پھیکے سے انداز میں مسکرایا۔ کہنے لگا۔

''انسپکٹر صاحب! کرسچین لوگ اعتراف گناہ کر کے دل کا بوجھ ہلکا کرتے ہیں۔ میں بھی آپ کے سامنے ایک اعتراف کرنا چاہتا ہوں۔''

اس کی آواز دھیمی تھی۔ میں اسٹول پر بیٹھ کر آگے کو جھک گیا۔ وہ دھیرے دھیرے

بولنے لگا۔ میں اسی طرح جھکا رہا اور وہ بولتا رہا۔ قریباً نصف گھنٹہ گزر گیا۔ بیچ بیچ میں میں نے کچھ سوالات بھی کیے۔ اس گفتگو کا خلاصہ یہ ہے۔

آج سے ڈیڑھ برس پہلے مہتا سنگھ نے غفورے کے قتل میں جو گواہی دی تھی وہ جھوٹی تھی۔ ایسے معتبر شخص نے یہ جھوٹ کیوں بولا؟ اس کا جواب یہ تھا کہ اسے اس گواہی پر مجبور کیا گیا تھا۔ واقعہ کچھ یوں تھا کہ غفورے کے قتل سے کوئی دو ماہ پہلے ڈاکٹر مہتا ایک نوجوان لڑکی کے چکر میں پھنس گیا تھا۔ یہ برقعہ پوش لڑکی ایک گرم اور سنسان دوپہر کو اس سے دوائی لینے آئی۔ مہتا سنگھ اکیلا تھا۔ وہ لاکھ بھلا مانس اور ادھیڑ عمر سہی بہرحال ایک مرد تھا۔ لڑکی نے اسے ایسے نازنخرے دکھائے کہ وہ طبیعت پر قابو نہ رکھ سکا۔ اس نے لڑکی کے جسم کو ہاتھ لگایا تو وہ برا مان گئی اور اٹھ کر چل دی۔

ڈاکٹر مہتا کچھ دن اپنے کیے پر پشیمان رہا۔ پھر ایک روز اسے لڑکی کا خط ملا۔ اس حوصلہ افزاء خط نے ڈاکٹر مہتا کے شوق کو بھڑکایا۔ ان دونوں کے درمیان خط و کتابت شروع ہوگئی۔ تنہائی کے چند لمحے میسر ہوئے اور ڈاکٹر مہتا اس کے قریب پہنچا۔ اس لمحے اس پر انکشاف ہوا کہ برقعے میں عورت نہیں بلکہ مرد ہے۔ وہ بری طرح چونک کر پیچھے ہٹا۔ ایک مردانہ قہقہہ سنائی دیا اور برقعہ پوش، ڈاکٹر مہتا کو حیران و پریشان چھوڑ کر دکان سے نکل گیا۔ اس کے بعد مہتا کو جو خط ملا وہ سراسر ایک بلیک میلر کا خط تھا۔ اس میں ڈاکٹر کا مذاق اُڑایا گیا تھا اور بھانڈا پھوڑنے کی دھمکیاں دی گئی تھیں۔

ڈاکٹر نے اپنے طور پر بلیک میلر کا کھوج لگانے کی کوشش کی لیکن یہ جان کر اسے مایوسی ہوئی کہ جس پتے پر وہ خط لکھتا تھا وہاں کوئی بنگالی کرائے دار رہتے تھے جو مکان چھوڑ کر جاچکے تھے...... پھر ایک دن ڈاکٹر کو برقعہ پوش لڑکے کا طویل خط پہنچا۔ اس میں اسے مذکورہ گواہی پر مجبور کیا گیا تھا۔ ڈاکٹر بال بچے دار آدمی تھا۔ گلی محلے میں اس کی عزت تھی۔ وہ بدنامی کے خوف سے کانپ گیا۔ بلیک میلر نے وعدہ کیا تھا کہ اس کے بعد اسے تنگ نہیں کرے گا۔ بہت سوچ بچار کے بعد ڈاکٹر نے اس کی بات ماننے کا فیصلہ کیا۔

میں نے ڈاکٹر کا پورا بیان غور سے سنا۔ حالات ایک پُراسرار رنگ اختیار کر گئے تھے۔ اس پورے واقعے میں ایک برقعہ پوش ملوث دکھائی دیتا تھا۔ اور پھر وہ لڑکی جس نے مجھے گمنام خط لکھا تھا۔ کہیں وہ بھی تو لڑکا نہیں تھا؟ میرا ذہن آہستہ آہستہ اس نتیجے پر پہنچ رہا تھا کہ مُنے کو منظم طریقے سے پھنسانے کی کوشش کی گئی ہے۔ ایک بے قراری سی میرے رگ و پے میں اُتر گئی۔ میں نے ڈاکٹر مہتا سے چند اور ضروری سوال پوچھے اور ہسپتال سے نکل آیا۔

☆=====☆======☆

میں نے ڈاکٹر مہتا کو موصول ہونے والے خطوں کی تحریر کا گمنام لڑکی کے خط سے موازنہ کیا اور انکشاف ہوا کہ دونوں تحریریں ایک ہیں۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ اس برقعہ پوش لڑکے کا سراغ کیونکر لگے۔ جس نے پہلے ڈاکٹر مہتا کو اپنے دام میں پھنسایا تھا اور پھر مجھے خط لکھ کر مُنے کے خلاف شہادتیں فراہم کی تھیں۔ میں نے ایک بار پھر نئے سرے سے تفتیش شروع کی۔ غفورے کے تمام دوستوں سے فرداً فرداً پوچھ گچھ کی۔ (شاید میں بتانا بھول گیا کہ ڈاکٹر مہتا زخموں کی تاب نہ لاکر چل بسا تھا)

میں نے اپنے سب انسپکٹر کو ہدایت کی کہ وہ علاقے میں کسی ایسے نوجوان کا سراغ لگائے جسے عورتوں جیسا حلیہ بنانے کا شوق ہو اور خاص طور پر غفورے کے ملنے جلنے والوں میں ایسے لڑکے کو تلاش کرے۔ میں نے ان بنگالی کرائے داروں کا سراغ لگانے کی کوشش بھی کی جن کے پتے پر برقعہ پوش لڑکے کے خطوط آتے تھے۔ اس سلسلے میں چند بنگالیوں کو گرفتار بھی کیا گیا لیکن مطلوبہ لوگ ہاتھ نہیں آئے۔ آپ میری بے قراری کا اندازہ بخوبی لگا سکتے ہیں۔ میری تفتیش کی بنیاد پر بے ایک بے گناہ کو پھانسی ہونے کا خدشہ تھا اور وہ بے گناہ میرا نہایت قریبی عزیز تھا۔ ان دنوں مجھے کھانے پینے کا ہوش تھا نہ آرام کا۔ بس ایک ہی خواہش تھی کہ کسی طرح اس گتھی کا کوئی سراغ ہاتھ آجائے۔

تلاش بسیار اور سخت کوشش کے باوجود میری تفتیش کی کشتی کسی کنارے پر نہیں لگی۔ آہستہ آہستہ مجھ پر مایوسی غالب آنے لگی۔ پھر شاید میں ہمت ہار کے کوشش ترک کر ہی دیتا کہ ایک صبح میرے لیے کامیابی کی نوید لے آئی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے وہ ستمبر کی پہلی تاریخ تھی۔ رات کی موسلا دھار بارش کے بعد نرم دھوپ گلی کوچوں میں پھیلی ہوئی تھی۔ میں دو سپاہیوں کے ساتھ پیدل ہی تھانے کی طرف جارہا تھا، دفعتاً ایک لڑکی کو دیکھ کر چونک گیا۔ اس نے سیاہ برقعہ پہن رکھا تھا اور تیزی سے سڑک کے کنارے جارہی تھی۔ اس کی چال میں مجھے ضرورت سے کچھ زیادہ ہی نسوانیت اور لچک محسوس ہوئی۔ جیسی آپ نے بھی ہیجڑوں میں دیکھی ہوگی۔ موہوم شک کے تحت میں نے لڑکی کا پیچھا شروع کردیا۔

وہ اپنے تعاقب سے بے خبر چلتی رہی اور آخری لڑکیوں کے سکول کے سامنے پہنچ گئی۔ میں نے دیکھا کہ لڑکیاں اپنی مخصوص یونیفارم کی بجائے رنگ برنگے کپڑوں میں نظر آرہی تھیں۔ دراصل اس دن اسکول کے اندر کوئی میلہ وغیرہ تھا۔ لڑکی تیزی سے چلتی ہوئی اندر داخل ہوگئی۔ میں گیٹ پر پہنچا۔ چوکیدار مجھے دیکھ کر کھڑا ہوگیا۔ اسکول کے وسیع احاطے میں

شامیانے لگے تھے۔لڑکیاں، عورتیں، بچے اور بچیاں کثیر تعداد میں دکھائی دے رہے تھے۔ میں نے مطلوبہ لڑکی کو دیکھنے کی کوشش کی لیکن وہ ہجوم میں گم ہو چکی تھی۔ میری چھٹی حس مجھے خبردار کر رہی تھی۔ اتنے میں اسکول کی ہیڈ مسٹریس بھی دروازے پر آ گئی۔ میں نے اس پر اپنا شک ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ ان لڑکیوں میں کوئی برقعہ پوش مرد گھس گیا ہے۔ فربہ اندام ہیڈ مسٹریس کے چہرے پر ہراس دکھائی دینے لگا۔ وہ مجھے ساتھ لے کر احاطے میں آ گئی۔ اسکول کی لڑکیوں نے ایک باوردی پولیس والے کو اپنے قریب دیکھا تو شوخی پر اُتر آئیں۔ بڑی عمر کی کچھ تیز طرار لڑکیوں نے آوازے بھی کسے۔

ایک آواز آئی۔ ''فلاں استانی کا شوہر ہے۔''

ایک نے کہا۔ ''یہ چوری کی گائے ڈھونڈنے آئے ہیں۔''

دوسری بولی۔ ''بہن راستہ بھول گئے ہیں۔''

ہیڈ مسٹریس نے لڑکیوں کو ڈانٹا۔ میں نے غور سے لڑکیوں کے چہرے دیکھے کچھ اندازہ نہ ہوا۔ ہیڈ مسٹریس نے تمام لڑکیوں کو حکم دیا کہ ایک جگہ اکٹھی ہو جائیں۔ لڑکیاں اکٹھی ہو گئیں۔ عورتیں اور بچے بھی ان میں موجود تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر میرا شک غلط نکلا اور ان میں کوئی برقعہ پوش مرد نہ نکلا تو یہ میرا مذاق اُڑانے سے باز نہیں آئیں گی۔

دفعتاً میری نظر ایک شامیانے کی طرف اٹھ گئی۔ ایک اسٹال کے عقب میں سیاہ برقعے کی جھلک دکھائی دی تھی۔ میں نے انگلی سے اس طرف اشارہ کر کے ایک استانی کو اطلاع دی۔ میری انگلی اٹھنے کی دیر تھی کہ اسٹال کے عقب سے ایک برقعہ پوش برآمد ہوا۔ اس نے چھلانگ لگا کر کاؤنٹر پار کیا اور تیزی سے مخالف سمت میں بھاگا۔ لڑکیوں کی چیخیں کورس کی صورت میں بلند ہوئیں۔ میں ان کے درمیان سے راستہ بناتا ہوا تیزی سے مجرم کی طرف لپکا۔ وہ برقعے سمیت سرپٹ دوڑتا ہوا بیرونی دیوار کی طرف بڑھ رہا تھا۔ پھر اس نے کسی چمگادڑ کی طرح چھلانگ لگائی اور منڈیر تھام لی لیکن اس سے پہلے کہ وہ زور لگا کر اوپر چڑھتا میں اس کے قریب پہنچ چکا تھا۔

اس نے جب دیکھا کہ میں اسے فرار نہیں ہونے دوں گا تو اس نے منڈیر چھوڑ کر نیچے چھلانگ لگا دی۔ زمین پر گرتے ہی وہ سیدھا کھڑا ہوا۔ پھر اس نے برقعے کے اندر ہاتھ ڈالا اور ایک گراری دار چاقو نکال لیا۔ الٹے قدموں پیچھے ہٹتے ہوئے اس نے چاقو کھولا۔ چاقو کی آواز سن کر میرے جسم میں سنسنی دوڑ گئی۔ لڑکیوں اور عورتوں کی دبی دبی چیخیں بھی سنائی دیں۔ اتفاقاً اس وقت میرے پاس ریوالور نہیں تھا۔ لمبے پھل کا چاقو ہاتھ میں لیے برقعہ پوش نہایت

خوفناک بھی لگ رہا تھا اور کچھ مضحکہ خیز بھی۔ ایک ہاتھ سے اس نے نقاب الٹا اور اپنی ہراساں نگاہیں میرے چہرے پر جما دیں۔ میں اس چہرے کو اچھی طرح جانتا تھا، آپ بھی جانتے ہوں گے لیکن یقین کریں اس وقت میں بالکل نہ پہچان سکا۔ وہ ہو بہو ایک بنی سنوری دوشیزہ دکھائی دے رہا تھا۔ صرف بغور دیکھنے سے ہی اس کی ڈاڑھی کی نیلاہٹ محسوس کی جا سکتی تھی۔ میں سوچنے لگا اس شخص نے شامیانے میں گھس کر غلطی کی تھی۔ اگر یہ لڑکیوں کے درمیان رہتا تو بھی شاید اسے مشکل سے ہی پہچانا جاتا۔

میں نے نہایت محتاط انداز میں برقعہ پوش کے چاقو پر نگاہیں جما دیں۔ دست بدست لڑائی کا ایک اصول ہوتا ہے کہ مدِ مقابل کے پاس تیز دھار آلہ ہو تو اس سے فاصلے پر رہنے کی کوشش کی جاتی ہے اگر وہ آتشیں اسلحہ رکھتا ہو تو پھر اس سے گتھم گتھا ہونے میں فائدہ ہوتا ہے۔ اس زمانے میں جوڈو کراٹے اور اس قسم کی باتیں سننے میں نہیں آتی تھیں لیکن تجربہ انسان کو بہت کچھ سکھا دیتا ہے۔ مثلاً مجھے معلوم تھا کہ چاقو زن سے واسطہ پڑنے پر اس انداز سے کھڑا ہونا چاہیے کہ اس کا چاقو والا ہاتھ آپ کے اسی ہاتھ کے سامنے ہو۔ مثلاً اگر اس کے دائیں ہاتھ میں چاقو ہے تو آپ کا دایاں ہاتھ اس کے دائیں ہاتھ کی سیدھ میں ہو۔ اس طرح ذرا سا پہلو بدل کر وار سے صاف بچا جا سکتا ہے...... میں بالکل اسی انداز میں کھڑا تھا۔

مدِ مقابل کے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ وہ کوئی ماہر چاقو زن نہیں ہے۔ مجھے پورا یقین تھا کہ جس گھڑی اس نے مجھ پر وار کیا وہی گھڑی اس کی گرفتاری کی ہو گی لیکن وہ ایک چالاکی دکھا گیا۔ مجھ پر حملہ آور ہونے کی بجائے اس نے اچانک دوڑ لگا دی۔ لڑکیوں نے اسے اپنی طرف آتے دیکھا تو چیختی چلاتی چاروں طرف بھاگیں۔ میں پوری رفتار سے اس کے تعاقب میں تھا۔ میں اس کا ارادہ سمجھ گیا۔ وہ بیرونی دروازے سے نکل جانا چاہتا تھا۔ اس دوڑ کو آپ سو میٹر کی دوڑ بھی کہہ سکتے ہیں۔ بیرونی دروازے سے چند گز اِدھر میں نے اس پر چھلانگ لگائی۔ میرے ہاتھ اس کی کمر پر پڑے اور وہ میرے بوجھ تلے دور تک گھسٹتا چلا گیا لیکن پھر بے حد پھرتی سے اس نے کروٹ بدلی اور چاقو کا وار میرے چہرے پر کیا۔ اضطراری طور پر میری گردن پیچھے کی طرف جھکی اور ایک برق سی آنکھوں کے سامنے لہرا گئی۔ چاقو میری آنکھوں سے ایک انچ کے فاصلے سے گزر گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ دوسرا وار کرتا میں نے اس کی کلائی تھام لی۔

اب صورتِ حال یہ تھی کہ وہ بنی سنوری برقعہ پوش ''جعلی'' حسینہ چاروں شانے چت زمین پر پڑی تھی۔ میں اس کے سینے پر سوار تھا اور اس کی دونوں کلائیاں میری گرفت میں۔

زمین سے لگی تھیں۔ وہ اب بھی پیٹ کے زور سے مجھے اچھالنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن
اسکول کا پٹھان چوکیدار "خانہ خراب کا بچی...... خانہ خراب کا بچی" پکارتا ہوا اس کے سر
گیا۔ اس نے لاٹھی کا بھرپور وار اس کے سر پر کیا۔ لڑکا کراہا۔ چاقو پر اس کی گرفت ڈھیلی
اور میں نے ایک جھٹکے سے اسے غیر مسلح کر دیا۔

☆======☆======☆

آپ یہ سننے کے لیے بے چین ہوں گے کہ اسکول میں گرفتار ہونے والا ملزم کون تھا؟
قارئین وہ ملزم تھا ابھرے ہوئے رخساروں والا منظور۔ وہی منظور جو غفورے کا راز داں تھا
جس سے غفورا فرزانہ کو خط لکھواتا تھا۔ اپنی تفتیش کے دوران مجھے سب سے کم شک اسی لڑکے
پر پڑا تھا لیکن آخر میں وہی اصل مجرم نکلا۔

اس وقت وہ میرے سامنے بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے پر چوٹوں کے نشان تھے۔ ابھی تک
اس نے اقبال جرم نہیں کیا تھا۔ وہ اس بات پر مُصر تھا کہ غفورے کو کسی نے قتل نہیں کیا۔ اس نے
خودکشی کی ہے اور وہ اس حقیقت کا ایک ٹھوس ثبوت بھی فراہم کرنے پر آمادہ ہو گیا تھا۔ تھوڑی دیر
بعد غفورے کا درزی باپ وہ ثبوت لے کر تھانے پہنچ گیا۔ ایک دو معزز افراد بھی اس کے ساتھ
تھے۔ یہ ثبوت ایک کاغذ کی صورت میں تھا اور ان لوگوں نے منظور کی نشاندہی پر حاصل کیا تھا۔
اس کاغذ پر مقتول غفورے کی اپنی تحریر میں چند سطور لکھی تھیں۔ وہ کچھ یوں تھیں۔

"یہ رقعہ میں پورے ہوش کے ساتھ اپنی مرضی سے لکھ رہا ہوں۔ اپنی موت کا ذمہ دار
میں خود ہوں۔ میرے بعد کسی پر یہ الزام نہ آئے۔ کسی کی محبت نے جینا مشکل کر دیا ہے۔ بے
وفائی کا دکھ اور برداشت نہیں ہوتا۔" نیچے دو شعر لکھے ہوئے تھے۔ آخر میں لکھنے والے کا
نام تھا۔ "غفور احمد بقلم خود۔" تاریخ بھی درج تھی جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ یہ رقعہ غفورے کی
موت سے تھوڑی دیر پہلے لکھا تھا۔ تحریر ہو بہو غفورے کی دوسری تحریر سے ملتی تھی۔

اگر دیکھا جائے تو اس رقعے کی موجودگی میں غفورے کی خودکشی ثابت ہو جاتی تھی۔
واقعی منظور نے ایک اہم ثبوت مہیا کر دیا تھا لیکن میرے لیے اس ثبوت کی کوئی اہمیت نہیں
تھی...... میں اس معاملے کی تہہ تک پہنچ چکا تھا۔ نہایت لاپرواہی سے میں نے کاغذ کا ٹکڑا میز
پر پھینک دیا۔ منظور کے وارثوں کے چہرے تاریک ہو گئے۔ منظور بھی پریشانی سے میری
طرف دیکھنے لگا۔ میں نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔

"منظور! تم ایک میٹرک پاس ذہین لڑکے ہو لیکن تم نے اپنی ذہانت کا استعمال نہایت
غلط طریقے سے کیا...... مجھے اس وقت ایک شعر یاد آ رہا ہے جس میں شاعر کچھ اس قسم کی

کہتا ہے کہ ایک تو میرا اندازِ بیان اور اوپر سے اس پری چہرہ کا ذکر۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جو میرا
راز داں تھا وہی رقیب بن گیا۔ منظور! تم دراصل فرزانہ کے تیسرے عاشق ہو۔ غفورے کے
خط لکھتے لکھتے تم خود بھی فرزانہ کے عشق میں گرفتار ہو چکے تھے۔ تمہاری محبت دوسرے دونوں
دوستوں کی نسبت خاموش لیکن شدید تھی۔ تم دل ہی دل میں فرزانہ کو حاصل کرنے کے
منصوبے بنایا کرتے تھے۔ فرزانہ تمہیں بھائی جان کہتی تھی اور اپنے خطوں میں تمہاری خیر
خیریت بھی دریافت کیا کرتی تھی۔ کبھی کبھی تمہیں شک ہوتا تھا کہ وہ تم سے محبت کرتی ہے لیکن
تمہاری یہ محبت مُنے اور غفورے کی موجودگی میں پروان نہیں چڑھ سکتی تھی۔

آخر قدرت نے تمہیں ایک سنہری موقع دیا۔ غفورے اور مُنے کے درمیان فرزانہ سے
ملاقات کی شرط لگی اور تمہیں پتہ چلا کہ مُنا شرط جیت گیا ہے۔ تم نے ایک منصوبہ بنایا تمہیں
معلوم تھا کہ آج یا کل مُنا لڈو لے کر غفورے کے پاس آئے گا اور غفورے کو کامیابی کی خبر سنا کر
دل گیر کرے گا۔ تم نے غفورے کا راز دار بن کر اسے مشورہ دیا کہ کیوں نہ وہ اپنی خودکشی کا
ڈرامہ رچائے تم نے اسے کہا کہ میں تمہیں ایک ہلکا سا زہر لا دیتا ہوں۔ تم تھوڑی مقدار میں
کھا لینا۔ میں تمہارے گھر والوں کو اطلاع دوں گا۔ وہ تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے جائیں گے۔
تمہاری خودکشی کا ڈرامہ بھی کامیاب رہے گا اور تمہیں نقصان بھی نہیں پہنچے گا۔ فرزانہ کو جب
تمہاری محبت کی شدت کا علم ہوگا تو وہ تمہاری طرف مائل ہو جائے گی۔

غفورا تمہاری باتوں میں آ گیا۔ تم نے اچھی طرح سوچی سمجھی سکیم کے تحت اپنی بہن کے
سیاہ برقعے میں کچی بستی کا رخ کیا۔ دراصل تمہیں لڑکیوں کا بھیس بدلنے کی عادت ہے۔
ڈاکٹری زبان میں اسے ذہنی مرض بھی کہا جا سکتا ہے۔ کسی کو معلوم نہیں کہ تم جو اچھے بھلے مرد
ہو، بند کمرے میں گھس کر عورتوں کی طرح بناؤ سنگھار بھی کرتے ہو۔ بہرحال یہ ایک علیحدہ
کہانی ہے...... تم بہن کا برقعہ پہن کر کچی بستی پہنچے۔ وہاں سے زہر خریدا پھر حلوائی مختار سے لڈو
خریدے اور ان میں زہر ملایا۔ اس کے بعد تم رات کا انتظار کرنے لگے۔

حسب توقع اس رات تمہارے جانے کے بعد مُنا غفورے سے ملنے آیا۔ کچھ دیر
غفورے کے پاس بیٹھ کر وہ چلا گیا۔ تم دوبارہ غفورے کے پاس پہنچے تاکہ خودکشی کے ڈرامے کو
حقیقت کا رنگ دیا جائے۔ دراصل تم انتہائی مہلک زہر خرید کر لائے تھے اور تمہارا منصوبہ
غفورے کو قتل کرنے کا تھا۔ سب سے پہلے تم نے غفورے سے خودکشی کی تحریر لکھوائی جو تم اب
میرے سامنے پیش کر رہے ہو۔ اگر مُنا، غفورے کے قتل کا ملزم نہ بھی ٹھہرتا تو بھی تم اس قتل میں
نہیں پھنس سکتے تھے۔ کیونکہ تحریر تمہارے پاس تھی اور تم کسی بھی مناسب وقت پر اسے پولیس

کی نظروں میں لا سکتے تھے۔ اس وقت بھی تمہارے پاس کوئی نہ کوئی بہانہ ہوگا کہ یہ تحریر تم
اب تک کیوں چھپائی۔

بہرحال تحریر لکھوانے کے بعد نہایت سفاکی سے تم نے غفورے کو وہ زہریلے لڈو
دیئے۔ غفورے پر غشی طاری ہونے لگی تو اس نے تمہاری منتیں کیں کہ کسی کو بلواؤ۔ تم بیٹھک
نکل آئے اور باہر سے کُنڈی چڑھا دی۔ غفورا اندر ہی تڑپ تڑپ کر مر گیا۔ جب تمہیں یقین
ہوگیا کہ جگری دوست، تم سے رحم کی بھیک مانگنے کے لیے زندہ نہیں رہا ہوگا تو تم دوبارہ اندر
داخل ہوئے۔ وہاں سے زہریلے لڈو اٹھائے اور اس کے ساتھ ساتھ مُنے کے لائے ہوئے
بھی اٹھا لیے۔ مُنے کے لائے ہوئے لڈو تم اپنے گھر لے گئے جب کہ زہریلے لڈو تم
میرے گھر کے پچھواڑے پھینک دیئے۔ اس سے اگلے روز تم نے ''لکھائی'' بدل کر دو خط لکھے
ایک مجھے اور دوسرا ڈاکٹر مہتا کو۔ تم نے ڈاکٹر مہتا کو مجبور کیا کہ وہ مُنے کے خلاف گواہی دے۔

اس طرح تم نے ایک تیر سے دو شکار کیے......مُنا جیل پہنچ گیا اور غفورا قبر میں......تمہارا
منصوبہ بہت کامیاب تھا منظور۔ اگر تین ہفتے پہلے کچہری روڈ پر ایک حادثہ نہ ہوتا اور ڈاکٹر
ہسپتال میں نزعی بیان نہ دیتا تو قانون کے ہاتھ کبھی تمہاری گردن تک نہ پہنچ سکتے۔''

میری تقریر ختم ہوئی تو منظور کے ابھرواں رخساروں پر موت کی زردی کھنڈی تھی اور ا
کے لواحقین کے چہرے لٹک رہے تھے۔

میں اب اس کہانی کو مختصر کرتا ہوں۔ ہائی کورٹ نے میرے برادر نسبتی شکیل عرف مُنے
باعزت بری کر دیا۔ منظور کے خلاف دوسرے الزامات کے علاوہ دفعہ 302 کے تحت کیس
درج ہوا۔ سیشن کورٹ سے اسے سزائے موت ہوئی، لیکن بعد ازاں ہائی کورٹ نے اس کی
عمری کے پیشِ نظر سزائے موت کو عمر قید میں تبدیل کر دیا۔ حالانکہ اس نے جس سفاکی سے
دوست کو موت کے گھاٹ اتارا تھا، میری خواہش تھی کہ اس کی سزا برقرار رہتی۔

اس کہانی کا ایک کردار فرزانہ تھی۔ وہ ایک نہایت حسین اور پُرکشش لڑکی تھی لیکن خراب
کردار کی وجہ سے اسے اچھا رشتہ نہیں ملا۔ اپنے ہی خاندان کے ایک سانولے سے لڑکے
اس کی شادی ہوگئی۔ مُنا دوبارہ پڑھائی میں مصروف ہوگیا۔ اس کہانی کا ایک کردار میری
تھی۔ اس نے عہد کیا تھا کہ کبھی مجھے اپنی شکل نہیں دکھائے گی لیکن اپنے زندہ سلامت بھائی
صورت دیکھ کر جہاں اس کے آنسوؤں نے ضبط کے بند توڑے وہاں اس کا عہد بھی ٹوٹ گیا۔

☆======☆======☆

دوستی، فرض اور لاش

کہتے ہیں پولیس والوں کی نہ دوستی اچھی نہ دشمنی۔ ہوسکتا ہے یہ کہاوت درست ہو لیکن اس کہانی میں آپ کو ایک مجرم اور پولیس انسپکٹر کی دوستی کی نا قابلِ فراموش داستان ملے گی اور یہ بات ثابت ہو جائے گی کہ سارے پولیس والے ایک جیسے نہیں ہوتے۔

اِس دلچسپ کہانی کا آغاز گھوڑی چوری کے ایک واقعے سے ہوا۔ گاؤں کے کاشت کار دینو کی گھوڑی طویلے سے غائب ہوگئی۔ یہ اعلیٰ نسل کی بڑی تیز گھوڑی تھی۔ دینو کے پاس کسی کی امانت تھی۔ گھوڑی کے اصل مالک کا نام گلزار احمد تھا۔ گلزار احمد گاؤں کے ایک کھاتے پیتے زمیندار نذیر علی کا بیٹا تھا۔ شہر پڑھنے گیا ہوا تھا۔ مشہوری تھی کہ ڈاکٹر بن کر آ رہا ہے۔ یہ گھوڑی شہر ہی میں اسے کسی انگریز کلکٹر سے ملی تھی۔ گلزار اسے اپنے پاس ہاسٹل میں نہیں رکھ سکتا تھا لہٰذا یہاں دینو کے پاس چھوڑ گیا تھا۔ دینو اس کے بچپن کا دوست تھا لہٰذا بڑی اچھی طرح گھوڑی کی دیکھ بھال کر رہا تھا۔ پچھلی عید پر جب گلزار چند روز کے لیے گاؤں آیا تھا تو دینو نے صاف ستھری لشکارے مارتی گھوڑی کو بڑے چاؤ کے ساتھ گلزار کے سامنے لا کھڑا کیا تھا اور گلزار دو تین دن بڑے ٹھاٹ سے گھوڑی پر فراٹے بھرتا رہا تھا۔ میں نے بھی یہ گھوڑی دیکھی تھی واقعی بڑے کمال کی چیز تھی۔ اس وقت میں نے گلزار کو مشورہ دیا تھا کہ وہ اسے دھیان سے رکھے۔ رسّہ گیری کے کیسوں میں عام طور پر ایسے ہی جانور غائب ہوتے ہیں۔

اور آج اس بات کے ٹھیک چھ ماہ بعد گھوڑی غائب ہوگئی تھی۔ صبح قریباً آٹھ بجے اس واقعے کی اطلاع تھانے پہنچی۔ ان دنوں میں سب انسپکٹر تھا۔ امرتسر کے مضافات میں یہ راپور نامی گاؤں کا تھانہ تھا۔ گاؤں میں پچاس فیصد آبادی سکھوں کی اور باقی ہندوؤں مسلمانوں کی تھی۔ تھانہ گاؤں کی آبادی سے کچھ ہٹ کر تھا۔ دینو کا گھر تھانے سے بمشکل سو گز دور ہوگا۔ تھانے کے اس قدر قریب واردات ہو جائے تو پولیس کو شرمندگی محسوس ہوتی ہے۔ اس وقت تو ہوتی تھی آج کل کا پتہ نہیں۔ ویسے بھی چوہدری نذیر کے بیٹے کی گھوڑی تھی۔ چھوٹا موٹا معاملہ نہیں تھا۔

میں دو سپاہیوں کے ساتھ موقعۂ واردات پر پہنچا۔ طویلہ ایک چھوٹے سے برآمدے

میں تھا۔ بڑے بڑے دروں پر بوریے کے پردے لٹکائے گئے تھے۔ احاطے کی چار دیواری خاصی اونچی تھی۔ گاؤں بھر میں سب سے مضبوط چار دیواری شاید اس طویلے ہی کی تھی۔ دیوار پر شیشے وغیرہ لگے ہوئے تھے۔ دیوار پھاند کر اندر آنا آسان نہیں تھا۔ دینو نے بتایا کہ رسّہ گیر چھت کی طرف سے آیا ہے۔ اس نے چھت کی منڈیر دکھائی۔ یہاں دو اینٹیں اُکھڑی ہوئی تھیں اور ایک دیسی جوتے کی ایڑھی کا مدھم نشان بھی تھا۔ یعنی رسّہ گیر پہلے چھت پر پہنچا تھا۔ وہاں سے لٹک کر چار دیواری پر اُترا تھا اور پھر چھلانگ لگا کر صحن میں آ گیا تھا۔ اس نے بڑی ہوشیاری کے ساتھ دینو کے پاس سے گھوڑی کھولی تھی اور بیرونی دروازے کی کنڈی گرا کر نکل گیا تھا۔ میں نے اچھی طرح موقعۂ واردات کا جائزہ لیا۔ دینو سے مختلف سوالات پوچھے اور ایک خاص نتیجے پر پہنچ گیا۔ مجھے تقریباً تقریباً یقین ہو گیا تھا کہ یہ واردات اچھو نے کی ہے۔

اچھو ایک سوا چھ فٹ لمبے اکہرے بدن کے تیز طرار نوجوان کا نام تھا۔ شانے چوڑے، پیٹ چیتے کی طرح کسا ہوا، گردن لمبی اور آنکھیں روشن۔ اچھو کا پورا نام محمد اشرف عرف اچھو تھا۔ تین چار سال لاہور اور کراچی میں ٹیکسی وغیرہ چلاتا رہا تھا۔ شہر کی ہوا نے اسے خاصا خرانٹ کر دیا تھا۔ لڑائی بھڑائی کا شوق تو اسے شروع سے تھا۔ شہر کے بدمعاشوں اور غنڈوں سے واسطہ پڑا تھا تو اس کے ہاتھ میں اور صفائی آ گئی تھی۔ ٹانگ تو ایسے زور کی مارتا تھا کہ بندہ پھڑک کر رہ جاتا تھا۔ شہر میں ٹیکسی چلانے کے علاوہ اس نے دو بار جیل کی ہوا بھی کھائی تھی۔ یوں اس کے بگڑنے میں جو تھوڑی بہت کسر رہ گئی تھی وہ بھی پوری ہو گئی تھی...... میرے ساتھ اچھو کا یارانہ تھا۔ آپ سن کر حیران ہوں گے کہ ایک پولیس انسپکٹر سے چور بدمعاش کا کیسا یارانہ؟ دراصل یہ بھی ایک کہانی ہے۔ مختصر الفاظ میں یہ جان لیجیے کہ کوئی ایک سال پہلے اچھو نے ایک نازک موقعے پر بڑی ہمت سے میری مدد کی تھی بلکہ اگر میں کہوں کہ میری جان بچائی تھی تو غلط نہ ہوگا۔ ان دنوں وہ نیا نیا شہر سے واپس آیا تھا۔ برسات کے دن تھے۔ راپور کے قریب سے گزرنے والا ڈیک نالہ زبردست طغیانی پر تھا۔ میں نالے کے پاس سے گزر رہا تھا کہ ایک عورت کی چیخیں سنیں۔ وہ ایک ساتھ والے گاؤں سے بہتی ہوئی آئی تھی اور مدد کے لیے پکار رہی تھی۔ میں نے اسے بچانے کے لیے پانی میں چھلانگ لگائی لیکن جب اس عورت کے قریب پہنچا تو معلوم ہوا کہ وہ دو عورتیں ہیں۔ دونوں تیر تیر کر بے دم ہو چکی تھیں اور اب ڈوبنے کے قریب تھیں۔ وہ دونوں اس بری طرح مجھ سے لپٹیں کہ میرے لیے خود کو سنبھالنا بھی مشکل ہو گیا۔ پانی کا بہاؤ بہت تیز تھا وہ ایک منٹ کے بعد ہمیں گاؤں سے قریباً ایک فرلانگ دور لے گیا۔ یہ نہایت مشکل وقت تھا۔ آج بھی یاد کرتا ہوں تو کپکپی آ جاتی ہے۔ اس

وقت میرے کان میں ایک للکارتی ہوئی آواز پڑی تھی۔ ''حوصلہ کر بھائیا! میں بھی آرہا ہوں۔'' پھر چند لمحے بعد میں نے لمبے تڑنگے اچھو کو اپنے قریب پایا تھا۔ اس نے میرے ساتھ مل کر دیوانہ وار لہروں کا مقابلہ کیا تھا۔ ایک عورت تو ہمارے ہاتھوں سے نکل گئی تھی لیکن دوسری کو ہم بچانے میں کامیاب رہے تھے۔

اس واقعے کے بعد اشرف عرف اچھو میرے بہت قریب آ گیا تھا۔ وہ واقعی ایسا نوجوان تھا کہ اس کی قدر کی جاتی۔ پھرتیلا، نڈر، ذہین اور چیتے کی طرح چوکنا۔ بس خامی اس میں یہی تھی کہ شریف نہیں تھا اور یہ ایک خامی اس کی ساری خوبیوں پر بھاری تھی۔ میں اسے اکثر سمجھاتا رہتا تھا اور وہ کچھ کچھ بدل بھی گیا تھا لیکن وہ جو کہتے ہیں کہ چھٹتی نہیں منہ سے یہ کافر لگی ہوئی بدمعاشی کی لت بھی جاتے جاتے جاتی ہے اور کبھی ہزار کوشش کے باوجود نہیں جاتی۔ شراب پینا، جواء کھیلنا، وارداتیں کرنا، عورتوں کو پھسلانا، یہ ساری ''خوبیاں'' اچھو شہر سے ہی لے کر آیا تھا۔ شراب، جوئے اور عورتوں سے چھیڑ چھاڑ کا چسکا تو وہ گاؤں میں ہی پورا کر لیتا تھا لیکن واردات وہ میرے تھانے کے علاقے میں نہیں کرتا تھا۔

دینو کے طویلے کا بغور جائزہ لینے کے فوراً بعد مجھے اندازہ ہوا تھا کہ یہ واردات اچھو نے کی ہے۔ اس کی وجہ طریقۂ واردات تھا۔ اچھو بانس کے ذریعے چھت پر چڑھا تھا۔ بانس کے ذریعے چھلانگ لگانے کا رواج ان دنوں عام تھا۔ راپور میں تین جوان ایسے تھے جو ایسی چھلانگ لگانے میں بڑی مہارت رکھتے تھے۔ ان میں دو سکھ تھے اور ایک مسلمان۔ مسلمان تو اچھو خود تھا اور سکھ نرنجن سنگھ اور گوپال سنگھ تھے۔ اتفاق کی بات ہے کہ جس رات واردات ہوئی نرنجن سنگھ اور گوپال سنگھ عرف گوپی ایک قریبی تھانے کے حوالات میں بند تھے۔ ان کی غیر موجودگی میں میرا دھیان فوراً اچھو کی طرف چلا گیا۔ اس شبے کو ''کھرے'' نے مضبوط کیا اور پھر گاؤں میں اچھو کی غیر موجودگی نے اس شبے کو یقین میں بدل دیا۔

انگریز کلکٹر کی دی ہوئی گھوڑی کو برآمد کرنا بہت ضروری تھا۔ چوری کی خبر پا کر گھوڑی کا موجودہ مالک یعنی گلزار احمد خود بھی گاؤں آ دھمکا تھا اور ہر وقت میرے سر پر سوار رہتا تھا۔ میں پوری تندہی سے کوشش کر رہا تھا کہ اچھو کا سراغ ملے۔ مجھے یہ الزام اپنے سر لینا منظور نہیں تھا کہ اچھو کا میرے پاس اٹھنا بیٹھنا ہے اس لیے میں اسے ڈھیل دے رہا ہوں۔ آٹھ دس روز گزر گئے لیکن اچھو کا کچھ پتہ نہیں چلا۔ اچھو کا بڑا بھائی اکبر کھیتی باڑی کرتا تھا۔ وہ بھلا مانس آدمی تھا۔ اچھو کی بدعادتیں اسے ایک آنکھ نہیں بھاتی تھیں۔ دونوں بھائیوں میں اکثر گالی گلوچ ہو جاتا تھا۔ اگر ماں زندہ نہ ہوتی تو شاید اچھو اس گھر میں رہ ہی نہ سکتا۔ اس کے علاوہ

بھابی بھی دیور کی طرف داری کرتی تھی اور جب کبھی دونوں بھائیوں میں زیادہ ٹھن جاتی تو وہ خاوند کو سمجھا بجھا کر دیور کو گاؤں بدر ہونے سے بچا لیتی تھی۔ میں نے اچھو کے بھائی اکبر کو اعتماد میں لیا اور بڑے ڈھنگ کے ساتھ اس سے بات چیت کی۔ میرا خیال تھا کہ شاید وہ اچھو کے بارے میں کچھ جانتا ہوگا لیکن یہ اندازہ غلط نکلا۔ کافی کوشش کے باوجود میں اچھو کے بارے اس سے کچھ معلوم نہ کر سکا۔ واردات کے سلسلے میں مَیں نے دو اور افراد کو بھی مشتبہ بٹھا رکھا تھا۔ ان میں کرن سنگھ نام کا ایک بندہ خاصا بدنام تھا۔ وہ اس سے پہلے بھی گاؤں کے زمینداروں کی دو تین گھوڑیاں کھول چکا تھا لیکن یہ تازہ واردات اس نے نہیں کی تھی۔ اس بات کا مجھے پکا یقین تھا۔

کئی روز بعد بھی جب کامیابی کی کوئی صورت نہیں نکلی تو میں نے ایک چال چلی۔ میں نے کرن سنگھ کو گرفتار کر لیا۔ عدالت سے اس کا ریمانڈ لے لیا اور دو تین دن بعد یہ اعلان کر دیا گیا کہ کرن سنگھ نے اقبال کر لیا ہے۔ اُس نے تسلیم کیا ہے کہ دو ہفتے پہلے دینو کے طویلے سے گھوڑی اُسی نے چرائی تھی لیکن پھر یہ گھوڑی اس سے بھی چوری ہو گئی۔ وہ گھوڑی لے کر کپور تھلہ گیا تھا کہ رات کو کوئی گھوڑی کھول کر لے گیا۔

چوبیس گھنٹے کے اندر اندر اِس بات کی خبر دور و نزدیک پھیل گئی کہ ڈاکٹر گلزار احمد کی گھوڑی دینو کے طویلے سے چرانے والا کرن سنگھ تھا اور اُس نے اقبال جرم کر لیا ہے۔ اِس واقعے کے ایک ہفتے بعد اچھو گاؤں واپس آ گیا۔ میری اُس سے ملاقات ہوئی۔ میں نے پوچھا۔

''کہاں رہے ہو اتنے دن؟''

وہ اپنے لمبے چوڑے ہاتھ سے ٹھوڑی کھجا کر بولا۔ ''پسرور گیا ہوا تھا۔ ایک پرانے یار کی شادی تھی۔ بڑا اُلو کا کن ہے وہ آنے ہی نہیں دیتا تھا۔'' میں تیز نظروں سے اُسے گھور رہا تھا۔ وہ گڑبڑا کر نیچے دیکھنے لگا۔ پھر ذرا سنبھل کر بولا۔ ''یار تھانیدار! سنا ہے کوئی گھوڑی شوڑی چوری ہوگئی ہے گاؤں سے؟''

میں نے اُس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ''اچھو! تجھے کہا تھا ناں میرے سامنے نہ آنا۔ تُو پھر بھی باز نہیں آیا۔''

''کیا مطلب؟'' وہ اطمینان سے بولا۔

''مطلب کا تجھے اچھی طرح پتہ ہے۔ دیکھ میں تجھ سے زیادہ بک بک کرنا نہیں چاہتا۔ نہ ہی چاہتا ہوں کہ ہماری دوستی امتحان میں پڑے اس لیے چپ چاپ گھوڑی واپس لا کر دینو

کے طویلے میں باندھ دے۔"

پہلے تو اچھو نے آئیں بائیں شائیں کی لیکن جب اُسے اندازہ ہوا کہ میں آسانی سے اُس کا پیچھا چھوڑنے والا نہیں اور مجھے اِس بات کا پورا پورا یقین ہے کہ گھوڑی کھولنے والا وہی ہے تو اس نے ہتھیار ڈال دیئے اور مان گیا کہ گھوڑی اُسی کے پاس ہے۔ اگلے روز صبح سویرے مسروقہ گھوڑی دینو کے طویلے کے سامنے پائی گئی۔

گاؤں بھر میں کسی کو معلوم نہیں ہوا کہ گھوڑی نکالنے اور واپس لانے والا اچھو تھا۔ میں نے بھی اچھو پر کوئی کارروائی نہیں ڈالی۔ اُس نے میری بات مان لی تھی لہٰذا ضروری تھا کہ میں بھی اُسے کچھ رعایت دوں...... ہاں...... اگر وہ سیدھی طرح نہ مانتا تو پھر میں نے کوئی کسر نہیں چھوڑنی تھی۔ بے شک وہ میرا دوست تھا (اور اُس نے میری جان بچائی تھی) میں اُس سے وہی سلوک کرتا جو چوروں، رسہ گیروں سے کیا جاتا ہے۔ میری بروقت کارروائی سے ڈاکٹر گلزار کی نایاب گھوڑی بچ گئی ورنہ چند دن اور گزر جاتے تو اچھو اُسے ایک وڈیرے کے پاس فروخت کرنے کا پکا ارادہ کر چکا تھا۔ وڈیرے نے اُسے گھوڑی کے بدلے آٹھ سو روپیہ دینا تھا۔ یقینی بات تھی کہ وہ یہ رقم لے کر شہر چلا جاتا اور پھر کئی ماہ تک اُس کی شکل دیکھنا نصیب نہ ہوتی۔

اس واقعے کے دو تین ماہ بعد ہی گلزار احمد شہر سے گاؤں واپس آ گیا۔ یعنی مستقل طور پر آ گیا۔ وہ ڈاکٹری کی تعلیم مکمل کر چکا تھا اور اب امرتسر میں پریکٹس کا ارادہ رکھتا تھا۔ چونکہ گاؤں سے امرتسر کا فاصلہ زیادہ نہیں تھا لہٰذا ڈاکٹر کو گاؤں میں ہی رہنا تھا۔ ڈاکٹر درمیانے قد کا بانکا سجیلا نوجوان تھا۔ کھاتے پیتے گھرانے کا تھا اور سب سے بڑی بات یہ کہ ڈاکٹر تھا۔ سارے گاؤں میں اُس کا چرچا ہونے لگا۔ خاص طور پر گاؤں کی نوجوان لڑکیاں تو اُسے کھڑکیاں کھول کر دیکھتیں اور آتے جاتے اُس کی راہ میں آنکھیں بچھاتیں۔ کئی گھرانوں کی عورتیں اِس چکر میں تھیں کہ چوہدری نذیر کے گھر والوں کے ساتھ زیادہ سے زیادہ میل جول رکھا جائے۔ سب کو پتہ تھا کہ اب ڈاکٹر گلزار کی شادی ہونی ہے اور ڈاکٹر گلزار نے یہ بات اُڑائی ہوئی تھی کہ وہ گاؤں کی لڑکی سے شادی کرے گا۔ یہ بات اُڑا کر ڈاکٹر گلزار نے بڑی ہوشیاری دکھائی تھی۔ میں پہلی بار ڈاکٹر کی صورت دیکھ کر ہی سمجھ گیا کہ وہ رنگ رنگیلا لڑکا ہے۔ شہر میں یارانے پالنے کے بعد اب وہ گاؤں میں آنکھ مٹکے کا مزہ لینا چاہتا تھا۔

ایک روز میں اور بلال شاہ تھانے کے صحن میں بیٹھے "زمیندار اخبار" پڑھ رہے تھے کہ اچھو وہاں آ دھمکا۔ گو وہ بدمعاشی میں پاؤں رکھتا تھا لیکن اپنی ظاہری ٹیپ ٹاپ رکھتا تھا۔ سفید

تہبند، بے داغ قمیص جس میں اکثر چاندی کے بٹن لگے ہوتے تھے۔ بالوں بھرے سینے پر سونے کا چمکتا ہوا کینٹھا۔ گرم چادر کو گردن کے پیچھے سے گزار کر دونوں پلو دائیں بائیں آزاد چھوڑ دیتا تھا۔ بالوں میں ہمیشہ مانگ نکال کر رکھتا تھا۔ اُس روز وہ تھانے میں آیا تو کافی برہم دکھائی دیتا تھا۔ بلال شاہ نے ایک طرف کھسک کر اُس کے لیے جگہ چھوڑ دی۔ بلال شاہ کو وہ "بہن کا ویر" کہہ کر مخاطب کرتا تھا۔ "بہن کا ویر" گالی تو نہیں تھی لیکن بلال شاہ کو یہ خطاب بہت بُرا لگتا تھا کیونکہ گالی کی طرح تھا۔ کوئی اور ایسی حرکت کرتا تو بلال شاہ اُس کی جان لے لیتا لیکن اچھو یہ بات اتنے پیار سے کرتا تھا کہ بلال شاہ پیچ و تاب کھانے کے سوا اور کچھ نہیں کر پاتا تھا۔

اچھو نے پھیکی سی مسکراہٹ ہونٹوں پر سجا کر بلال شاہ کی طرف دیکھا اور کہا "اوئے بہن کے ویر تُو یہاں کیا کر رہا ہے۔ چل ذرا مجھے تھانیدار صاحب سے ایک بات کرنے دے۔"

بلال شاہ سمجھ گیا کہ کوئی اہم بات ہے اس لیے وہ تکرار کیے بغیر وہاں سے ٹل گیا۔ اچھو عادت کے مطابق کچھ دیر الٹے ہاتھ سے اپنی ٹھوڑی کھجاتا رہا پھر کھوئی کھوئی آواز میں بولا۔

"یار تھانیدار! مجھے دال میں کچھ کالا نظر آ رہا ہے۔ یہ سؤر کا پتر گلزار جو ہے کہیں اپنی ڈاکٹری سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش نہ کرے۔"

"میں کچھ سمجھا نہیں۔" میں نے ٹوپی سر سے اتارتے ہوئے کہا۔

وہ بولا۔ "یار! یہ نوری بڑا جا رہی ہے ڈاکٹر کی طرف۔ اس نے دواخانہ کھولا ہے ناں پُل کے پاس...... وہاں دو تین دفعہ جا چکی ہے۔ کہیں کوئی گڑبڑ نہ ہو جائے۔"

میں نے کہا۔ "تیرا کام پکا ہے تو پھر گڑبڑ کی کیا فکر۔ تُو نے بات کر لی ہوئی ہے ناں۔"

وہ بولا۔ "بس کچی پکی سی بات ہے۔ پتہ نہیں کیا ہو جاتا ہے مجھے اس کے پاس جا کر بڑی بڑی دبنگ کُڑیاں دیکھی ہیں لیکن سچی بات ہے یار ایسے پسینے میرے کبھی نہیں چھوٹے۔ پچھلے سے پچھلے جمعے ایک شادی پر ملاقات ہوئی تھی...... بات کرنے کا موقع بھی ملا لیکن عین وقت پر دو تین اور لڑکیاں ٹپک پڑیں۔ سارا ستیاناس ہو گیا۔"

اچھو اور نوری کی بھی عجب کہانی تھی۔ نوری اس کی سگی خالہ کی بیٹی تھی۔ بچپن میں اکٹھے کھیلے تھے۔ اچھو کے دل میں شروع سے نوری کی محبت تھی لیکن اپنی محبت کا اظہار وہ کبھی نوری سے نہ کر سکا۔ پھر وہ لاہور اور بعد میں کراچی چلا گیا۔ وہاں جا کر اُس کا رہن سہن اور طور اطوار بالکل بدل گئے۔ اب وہ ایک خرانٹ بدمعاش تھا اور شہر میں کئی عورتوں کو جوانی کے جوہر دکھا

چکا تھا لیکن کچھ بھی تھا نوری کی محبت اب بھی اس کے دل میں قائم دائم تھی۔ جب ایک
پہلے وہ گاؤں واپس آیا تھا تو نوری کی بھرپور جوانی دیکھ کر بالکل ہی لٹو ہو گیا تھا۔ اُس نے تہیہ
کیا تھا کہ جس طرح بھی ہو سکے نوری کو حاصل کرے گا۔ اُس نے دل کی بات اپنے گھر والوں
سے بھی کہہ دی تھی اور انہیں کہا تھا کہ وہ نوری کا رشتہ مانگیں۔ اچھو کی والدہ خود بھی چاہتی تھی
کہ بیٹے کو بہن کی طرف بیاہیں لیکن بیٹے کے لچھن بھی نظر میں تھے۔ لہٰذا سب گھر والوں نے
مل جل کر اچھو کو سمجھایا تھا کہ وہ اپنے طور اطوار ٹھیک کرے اور پہلے خود کو نوری کے قابل
بنائے۔ اچھو کے دل کو نوری کچھ ایسی لگی تھی کہ وہ اُس کے لیے سب کچھ کرنے پر تیار ہو گیا
تھا۔ اُس نے بری صحبت میں اٹھنا بیٹھنا بہت کم کر دیا تھا۔ وارداتیں بھی تقریباً چھوڑ دی تھیں
اور اگر کبھی کرتا بھی تھا تو کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوتی تھی۔ ویسے بھی علاقے کا ماحول اس
طرح تھا کہ جو "گبھرو" تین چار بار پولیس کے چھتر نہ کھالے اسے گبھرو ہی نہیں سمجھا جاتا تھا۔
آج کے مسئلہ روزگار کا تھا۔ اچھو کو ٹیکسی چلانے کے سوا اور کوئی کام نہیں آتا تھا اور گاؤں میں
ٹیکسی چلائی نہیں جا سکتی تھی۔ بھائی کے ساتھ مل کر ہل چلانا یا کھیت مزدوری کرنا وہ اپنی شان
کے خلاف سمجھتا تھا۔ نت نئے کپڑے اور لشکارے مارتی جوتی پہن کر پھرنا اُس کا محبوب مشغلہ
تھا اور چھوٹی موٹی استادیاں دکھانے سے جو پیسے ملتے تھے اُن سے گزارا چلتا رہتا تھا...... لیکن
ایک بات بڑے مزے کی تھی۔ بے حد خرانٹ اور نڈر ہونے کے باوجود جب اچھو نوری کے
سامنے جاتا تو اس کی بولتی بند ہو جاتی تھی۔ لڑکیوں اور مٹیاروں کے سلسلے میں اُس کا سارا تجربہ
دھرے کا دھرا رہ جاتا تھا اور وہ کوشش کے باوجود اُس سے ایک لفظ نہیں کہہ پاتا تھا۔ پچھلے ایک
برس میں وہ کم از کم دس دفعہ اپنی خالہ زاد سے اظہارِ محبت کی کوشش کر چکا تھا لیکن ناکامی ہوئی
تھی۔ یہ بات نہیں کہ اِس کے دل میں کوئی چور تھا۔ جہاں تک میں سمجھ پایا ہوں وہ اپنے
جذبے میں بالکل سچا تھا۔ وہ نہ صرف نوری کے ساتھ گھر بسانا چاہتا تھا بلکہ اُس کے لیے خود کو
بالکل بدل دینا چاہتا تھا...... اور بدل بھی رہا تھا لیکن وہ نوری کے سامنے کبھی بھی یہ نہ کہہ سکا کہ
اُسے چاہتا ہے۔

اچھو بڑی زبردست صلاحیتوں کا مالک تھا۔ اگر وہ نیک بھی ہوتا تو لاکھوں میں ایک
ہوتا۔ یہی وجہ تھی کہ بدنام ہونے کے باوجود میں نے اُس سے دوستی لگا رکھی تھی اور اُسے
راست پر لانے کی کوششیں کرتا رہتا تھا۔ کبھی کبھی میرا دل چاہتا تھا کہ وہ سدھر جائے تو کوشش
کر کے اُسے پولیس میں ملازمت دلوا دوں لیکن اپنے اِس ارادے کا ذکر میں نے اچھو سے
کبھی نہیں کیا۔

جب اچھو نے نوری کا ذکر کر کے اپنی فکرمندی بتائی تو مجھے اُس کی بات غور سے سننی
پڑی۔ مجھے یقین تھا کہ اگر اچھو کو بدلنے میں میری کامیابی کا امکان بیس فیصد ہے تو نوری کا
نوے فیصد ہے۔

میں نے اس سے پوچھا۔ "بھئی اگر وہ ڈاکٹر کے پاس گئی ہے تو درجنوں دوسری عورتیں
بھی جاتی ہیں۔ تمہیں اس میں کیا خطرہ ہے؟"

وہ بولا۔ "یار تھانیدار! نوری کی بات اور ہے۔ ذرا دماغ سے سوچو۔ نوری جیسی جوان
خوبصورت لڑکی اکیلے کمرے میں ڈاکٹر کے سامنے ہو۔ وہ ٹوٹیاں لگا لگا کر اُسے ٹوہ رہا ہو۔
اُس کا ہاتھ پکڑ کر نبض دیکھ رہا ہو، اسے الٹا سیدھا لٹا رہا ہو تو بتاؤ یار دل میں کھد بد ہوتی ہے کہ
نہیں۔ عورت مرد کا ساتھ تو تیل اور آگ کا ہوتا ہے۔ ڈاکٹر بھی آخر مرد ہی ہوتا ہے ناں۔
میری تو سمجھ میں نہیں آتا لوگ اپنی جوان لڑکیوں کو ڈاکٹروں کے پاس کیوں لے جاتے
ہیں۔"

میں نے کہا۔ "اچھو، یہ سارا تیرے ذہن کا گند ہے۔ ڈاکٹری بڑا مقدس پیشہ ہے۔
لاکھوں میں کوئی ایک برا ہو تو اور بات ہے۔ ورنہ یہ بڑی بھلی مانس مخلوق ہوتی ہے۔ تیری
میری طرح سوچیں نہیں ہوتیں اِن کی۔"

تھوڑی دیر اچھو اور مجھ میں اس بارے میں گفتگو ہوئی اور پھر بات آئی گئی ہو گئی۔

یہ سات آٹھ روز بعد کی بات ہے۔ ایک روز بلال شاہ تھانے میں مجھ سے ملنے آیا تو
اس کے چہرے پر دبا دبا جوش تھا۔ تنہائی میں مجھ سے کہنے لگا۔ "خان صاحب! کچھ ڈاکٹر کے
بارے میں سنا ہے آپ نے؟"

"کیا بات ہے؟" میرے کان کھڑے ہو گئے۔

وہ بولا۔ "وہی بات ہوئی ہے جس کا اچھو کو ڈر تھا۔ اُس ڈاکٹر نے تو سچ مچ نوری کو پھنسا
لیا ہے۔ سارے گاؤں میں باتیں ہو رہی ہیں۔ کل شام جسونت تیلی کی گھر والی نے ڈاکٹر اور
نوری کو بیلے میں باتیں کرتے دیکھا ہے۔"

بلال شاہ کی اطلاع واقعی سنسنی خیز تھی۔ ظاہر ہے کوئی نہ کوئی بات تھی تو نکلی تھی۔ میں نے
نوری کو کئی بار دیکھا تھا۔ وہ اچھے قد کاٹھ کی خوبصورت لڑکی تھی۔ پھڑکتے ہونٹ، بولتی ہوئی
آنکھیں، اُس کے جسم کی سب سے خوبصورت چیز اُس کے بال تھے۔ بہت بوجھل اور لمبے
بال۔ موٹی چوٹی اُس کے گھٹنوں تک پہنچتی تھی۔ رنگین پھندنوں والا پراندہ ٹانگوں میں الجھتا
رہتا تھا۔ ایسی لڑکیاں سرِ راہ کھلے ہوئے پھول کی طرح ہوتی ہیں۔ جلد یا بدیر کسی کا ہاتھ اُن

تک پہنچ جاتا ہے۔ وہ کسی گھر کے گلدان میں جا سجتی ہیں یا پتی پتی ہو کر بکھر جاتی ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ میں اُس کے بارے میں اکثر اچھو کو سمجھاتا رہتا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ اگر وہ واقعی نوری کے بارے میں سنجیدہ ہے تو پھر اُسے اپنانے میں دیر نہ کرے۔ پہلے اپنے روزگار کا بندوبست کرے پھر والدین کے ذریعے نوری کا رشتہ مانگے اور اُسے بیوی بنالے۔ اب جو باتیں سننے میں آرہی تھیں یہ بڑی خطرناک تھیں۔ میں اچھو کے مزاج کو بہت اچھی طرح سمجھتا تھا۔ وہ ہار ماننے والا یا پیچھے ہٹنے والا شخص نہیں تھا...... پھر نوری پر تو اس نے بہت دیر سے آس لگا رکھی تھی۔ وہ کیسے برداشت کرسکتا تھا کہ وہ ڈاکٹر کی بانہوں میں جا گرے۔ مجھے خطرہ محسوس ہونے لگا کہ کہیں اچھو ڈاکٹر سے دنگا فساد نہ کرے۔ میں نے دوپہر کے وقت بلال شاہ کے ہاتھ اُسے تھانے بلوایا۔ وہ پہنچا تو نشے میں دُھت تھا۔ گریبان کھلا ہوا، آنکھیں سُرخ اور قدم ڈانواں ڈول۔ آج اُس نے تین چار ماہ بعد پی تھی اور غالباً اتنی پی تھی کہ اگلی پچھلی کسر نکال دی تھی۔ مجھے افسوس ہوا کہ ایسی حالت میں مَیں نے اُسے کیوں تھانے بلالیا۔ بہرحال اب کیا ہوسکتا تھا۔ میں اُسے اپنے کمرے میں لے گیا اور اندر سے کنڈی لگا دی۔ وہ نشے میں واہی تباہی بکنے لگا۔ پہلے اس نے ڈاکٹر گلزار کو بے تحاشا گالیاں دیں پھر نوری پر غصہ نکالنے لگا اور جب اس کام سے بھی تھک گیا تو اپنے آپ کو برا بھلا کہنے لگا۔

''اچھا ہوا ہے اچھو صاحب! اچھا ہوا ہے تم اسی لائق تھے۔ حرامی! نہ کوئی کام نہ کار، نہ گھر نہ بار اور چلے ہو عشق فرمانے۔ اچھا جوتا پڑا ہے تمہارے منہ پر۔ اب اگر رتی بھر بھی غیرت ہے تو ڈوب مرو کہیں......'' کتنی ہی دیر وہ یونہی خود کو کوسنے دیتا رہا۔ میں نے اسے بڑی مشکل سے سنبھالا۔ سر پر ٹھنڈا پانی ڈال کر اور اچار وغیرہ کھلا کر اس کا نشہ کچھ کم کیا اور اُس رات اُسے اپنے ساتھ ہی کوارٹر میں لے گیا۔ میں نے بڑے ہمدردانہ لہجے میں اُسے سمجھایا کہ وہ پریشانی کے عالم میں اپنے حواس سے ناطہ نہ توڑے۔ سنی سنائی باتوں پر اتنی جلدی یقین نہیں کر لینا چاہیے اور پھر نوری کوئی چھوٹی سی بچی تو نہیں۔ اپنا اچھا برا سمجھتی ہے۔ اُسے بھی معلوم ہوگا کہ لڑکیوں کو چکر دینا گلزار کا پرانا مشغلہ ہے۔ وہ اتنی آسانی سے اُس کی باتوں میں نہیں آئے گی۔ وہ ماسی جنتے کی بیٹی ہے کوئی مذاق نہیں۔

سمجھانے کو تو میں نے اچھو کو سمجھا دیا اور وقتی طور پر اس کا غصہ بھی کم ہوگیا لیکن اصل بات وہی نکلی جو گاؤں میں مشہور ہوئی تھی۔ ڈاکٹر اور نوری میں میل ملاپ ثابت ہوگیا۔ پتہ چلا کہ نوری کے والد میتے نے اُسے بری طرح مارا ہے اور اُس کا گھر سے نکلنا بالکل بند کر دیا ہے۔ دوسری طرف ڈاکٹر بھی کئی روز تک گاؤں میں نظر نہیں آیا۔ معلوم ہوا کہ وہ شہر میں اپنا

کلینک بنوا رہا ہے۔ اس دوران اچھو بھی گاؤں میں کم کم ہی نظر آتا رہا۔ پتہ نہیں کیا کرتا پھرتا تھا۔ مجھے معلوم تھا اُسے بہت دکھ پہنچا ہے۔ میں نے کئی مرتبہ کوشش کی لیکن اچھو سے ملنے میں کامیابی نہیں ہوئی...... اور پھر ایک روز بہت ہی دھماکہ خیز خبر گاؤں میں گونجنے لگی۔ مجھے یہ خبر سب سے پہلے اپنے اے ایس آئی باجوہ کی زبانی ملی۔ میں شہر میں ایک تاریخ بھگت کر واپس آرہا تھا۔ تانگے پر سوار ابھی میں گاؤں سے چند فرلانگ دور ہی تھا کہ اے ایس آئی باجوہ دو سپاہیوں کے ساتھ بڑے تیز قدموں سے پنچایت گاہ کی طرف جاتا دکھائی دیا۔ جس جگہ کو پنچایت گاہ کہا جاتا تھا یہ ایک پرانا کنواں تھا۔ یہاں برگد کے گھنے درخت تھے اور ایک طرف نانک چندی اینٹوں کا بڑا سا چبوترہ بنا ہوا تھا۔ پنچ یہاں چارپائیاں ڈال کر بیٹھ جاتے تھے اور گاؤں کے لوگ نیچے کھڑے ہوکر پنچایت کی کارروائی دیکھتے تھے۔

میں نے اے ایس آئی سے پوچھا وہ کدھر بھاگا جا رہا ہے۔ جواب میں اُس نے کہا۔ ''میتے کی لڑکی نوری ڈاکٹر کے ساتھ پکڑی گئی ہے۔ دونوں دواخانے میں گھسے ہوئے تھے۔ گاؤں کی ایک عورت نے پکڑلیا۔ نوری تو گھر آگئی ہے۔ ڈاکٹر کو لوگ سیدھا پنچایت میں لے گئے ہیں۔''

میں فوراً تانگے سے اُترا اور اے ایس آئی کے ساتھ ہی پنچایت گاہ کی طرف چل دیا۔ پنچایت گاہ میں دور ہی سے ہجوم نظر آرہا تھا۔ چبوترے کے اردگرد دیہاتی ٹکڑیوں کی صورت میں کھڑے تھے۔ بار بار کسی کے بلند لہجے میں بولنے کی آواز بھی آتی تھی۔ میں نے غور کیا تو پتہ چلا کہ ڈاکٹر کے والد چوہدری نذیر کی آواز ہے۔ ہم موقعے پر پہنچے تو لوگوں نے دائیں بائیں ہٹ کر راستہ دیا۔ چبوترے پر نوری کے والد میتے اور ڈاکٹر کے والد چوہدری نذیر کے علاوہ آٹھ دس معتبر افراد موجود تھے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر گلزار خود بھی نظر آرہا تھا۔ وہ حسبِ معمول پتلون قمیص میں تھا۔ گھنگھریالے بال پیشانی پر جھول رہے تھے۔ وہ سخت غصے میں نظر آرہا تھا۔ یعنی خود شرمندہ ہونے کی بجائے وہ دوسروں کو شرمندہ کرنے پر تُلا ہوا تھا۔ اُس کا والد بھی خاصا برہم دکھائی دیتا تھا۔ اُن کے مقابلے میں نوری کا باپ اور چچا وغیرہ دبے دبے نظر آتے تھے۔ گاؤں اور قصبوں وغیرہ میں رواج تھا کہ پولیس پنچایت کی کارروائی میں دخل نہیں دیتی تھی۔ میں بھی ایک طرف خاموشی سے بیٹھ گیا اور کارروائی کا جائزہ لینے لگا۔ وہاں ہونے والی بحث سے پتہ چلا کہ نوری چوری چھپے ڈاکٹر کے دواخانے پر پہنچی تھی۔ جیسا کہ میں نے بتایا ہے یہ دواخانہ گاؤں کی آبادی سے کچھ ہٹ کر تھا۔ ظہر سے پہلے دواخانہ بند ہوجاتا تھا پھر ڈاکٹر گلزار امرتسر چلا جاتا تھا یا گھر واپس آجاتا تھا۔ ایک بوڑھے نوکر ہاشو کے علاوہ رات

پھر دوا خانے میں اور کوئی نہیں ہوتا تھا لیکن آج ڈاکٹر دوا خانے میں ہی تھا۔ شام سے تھوڑی دیر پہلے نوری دوا خانے میں گھسی تو جسونت تیلی کی گھر والی تاباں نے اسے دیکھ لیا۔ (اس عورت نے پہلے بھی ڈاکٹر اور نوری کے چکر کی خبر پھیلائی تھی۔ یوں لگتا تھا وہ ہاتھ دھو کر نوری کے پیچھے پڑی ہوئی ہے) تاباں نے شور مچایا تو بہت سے لوگ وہاں اکٹھے ہو گئے۔ اتنے میں نوری کا والد مہتا بھی اُسے تلاش کرتا ہوا دوا خانے پہنچ گیا۔ تاباں اُسے دیکھ کر بڑی کراری آواز میں بولی۔ ''اندر دوا خانے میں ہے تیری بیٹی، ڈاکٹر سے علاج کروا رہی ہے۔ ابھی پتہ نہیں کتنی دیر میں نکلے گی۔ پون گھنٹہ تو ہمیں بھی ہو گیا ہے یہاں کھڑے ہوئے۔''

اتنے میں گاؤں کی مسجد کے امام صاحب بھی وہاں پہنچ گئے۔ لوگوں نے دوا خانے کے دروازے زور زور سے کھٹکھٹائے اور آوازیں دیں تو ڈاکٹر اور نوری باہر نکل آئے۔ نوری کا والد درانتی لے کر نوری پر جھپٹا لیکن کچھ لوگ آڑے آ گئے۔ چند عورتیں نوری کو اپنے ساتھ گاؤں لے آئیں۔ ڈاکٹر کو لوگ پنچایت گاہ میں لے آئے اور اب یہ معاملہ پنچوں کے سامنے پیش تھا۔ ڈاکٹر کا کہنا تھا کہ اس سارے معاملے میں اُس کا کوئی قصور نہیں نوری خود اُس کے پاس آئی تھی۔ وہ دوا لینا چاہتی تھی۔ دوا خانے کا وقت ختم ہو چکا تھا۔ وہ پھر بھی اصرار کر کے اندر آ گئی۔

ڈاکٹر کی باتوں پر یقین کرنا کسی کے لیے بھی ممکن نہیں تھا۔ سب اندر کی بات سمجھ رہے تھے۔ پنچوں میں سے دو تین کا خیال تھا کہ یہ صرف نوری کا نہیں گاؤں کی عزت کا معاملہ بھی ہے۔ بہتر ہے کہ اب نوری کے ماتھے سے بدنامی کا داغ دھونے کے لیے ڈاکٹر اُس سے شادی کر لے۔ دیکھا جاتا تو یہ کوئی ایسی نہ ہونے والی بات نہیں تھی۔ ڈاکٹر خود کہہ چکا تھا کہ وہ گاؤں کی لڑکی سے شادی کرے گا۔ نوری گاؤں کی لڑکیوں میں سے نہ صرف خوبصورت ترین تھی بلکہ چند جماعتیں پڑھی ہوئی بھی تھی۔ ویسے بھی کھاتے پیتے گھرانے سے تھی۔ یہ رشتہ ہر طرح سے جوڑ کا تھا لیکن ڈاکٹر گلزار اور اُس کے رشتے دار یہ بات سن کر آگ بگولہ ہو گئے۔ سب سے زیادہ چوہدری نذیر گرج رہا تھا۔

''یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ میرا بیٹا ایسا گرا پڑا نہیں کہ مہتے جیسے بندے کا داماد بنے۔ نوری جیسی لڑکی کو تو میں نوکر نہ رکھوں بہو بنانا تو دور کی بات ہے۔''

اس تنازعے پر ڈیڑھ دو گھنٹے گرما گرم بحث ہوئی۔ بحث میں چوہدری نذیر کا پلہ ہر طرح سے بھاری تھا۔ مہتا ایک تو حیثیت میں کمزور تھا دوسرے صورتِ حال بھی اُس کے حق میں نہیں تھی۔ جوان بیٹی کے اٹھے ہوئے ایک غلط قدم نے اُسے ہر نگاہ کے سامنے شرمسار کر دیا

تھا۔ رات گئے پنچایت کسی فیصلے پر پہنچے بغیر ختم ہو گئی۔

جوان لڑکی کی آبرو کانچ کے نازک پھول کی طرح ہوتی ہے۔ گناہ کی دھوپ نہ بھی پڑے تو بدنامی کی ہلکی سی ٹھیس سے ٹوٹ جاتا ہے۔ نوری کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا۔ وہ بدچلن نہیں تھی لیکن ڈاکٹر کی لچھے دار باتوں کا شکار ہو کر بدنامی کی ٹھوکروں میں آ گئی۔ وہی لڑکی جو کل تک پورے گاؤں کی آنکھ کا تارا تھی اور جس کا سُرخ پھندنوں والا پراندہ ہر گلی میں لشکارے مارتا پھرتا تھا۔ ذلیل و خوار ہو کر رہ گئی تھی۔ اُس کی ماں نے اُسے باپ کے قہر سے بچانے کے لیے قریبی گاؤں سہارن پور بھیج دیا تھا۔ سہارن پور میں نوری کی خالہ رہتی تھی۔ چند روز بعد اس واقعے کا شور کچھ کم ہوا تو نوری کی شادی کی بات ہونے لگی۔ بلال شاہ کو ایسی باتوں کا بہت پتہ ہوتا تھا۔ کسی سے رشتہ جوڑنا تو بلال شاہ کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ آج کل اُس نے نوری کی ماں سے بھائی کا رشتہ جوڑا ہوا تھا۔ نوری کی ماں کو ایک عجیب عادت تھی۔ وہ مٹی کھاتی تھی۔ خالص اور چکنی مٹی کی تلاش میں وہ بعض اوقات دور تک نکل جاتی۔ نہر یا ڈیک نالے کی تہہ سے گاچی جیسی مٹی ڈھونڈ کر لاتی اُسے دھوپ میں سکھاتی اور بڑے اہتمام سے کھاتی۔ اس نے ''بہن'' کو رازداری سے بتایا کہ وہ خود بھی مٹی کھانے کا شوقین ہے۔ ظاہر ہے اس بات کے ثبوت کے لیے اُس نے ''بہن'' کو مٹی کھا کر بھی دکھائی ہو گی۔ یوں وہ دونوں مٹی خور بہن بھائی بن چکے تھے۔ اس رشتے کے سبب بلال شاہ کو نوری کے گھر میں ہونے والی ہر بات کی خبر رہنے لگی۔ اس نے مجھے بتایا۔ ''خان صاحب! بڑا پریشان ہے مہتا۔ کل اُس نے اپنے ایک بڑے بھائی اور چاچے کو سرگودھا سے بلایا ہوا تھا۔ وہ جلد از جلد نوری کا بار سر سے اتار پھینکنا چاہتے ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ دور و نزدیک میں جو بھی رشتہ ملے فوراً قبول کر لیا جائے اور بدنامی کی اس گٹھڑی کو سُرخ جوڑے میں لپیٹ کر دفع کیا جائے۔ اس سلسلے میں اچھو کا نام بھی آیا ہے۔ مہتے کا خیال ہے کہ نوری کی شادی اچھو سے کر دی جائے اور وہ اُسے لے کر شہر چلا جائے لیکن نوری کی ماں اب اس بات پر راضی نہیں۔ وہ کہتی ہے کہ پہلے میری بہن نوری کا رشتہ مانگتی تھی لیکن کوئی اُسے منہ نہیں لگاتا تھا اب میں کس زبان سے اُسے یہ بات کہوں۔''

بلال شاہ کی باتیں قابلِ غور تھیں۔ میں نے ایک سال تک اچھو کو پرکھا تھا اور اُس کے بارے میں بہت کچھ جانتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ اب بھی نوری کو خوشی سے قبول کر لے گا۔ اگر نوری سے ایک غلطی ہو گئی تھی تو کیا خود اچھو سے بے شمار غلطیاں نہیں ہوئی تھیں؟ اور پھر اس غلطی میں اچھو کا اپنا ہاتھ بھی تھا۔ اگر وہ خواہ مخواہ اتنی دیر نہ کرتا اور نوری سے دل کا حال کہہ دیتا تو کوئی وجہ نہیں تھی کہ نوری کی منہ زور جوانی ڈگمگاتی اور اگر اُن کا رشتہ بھی طے ہو گیا ہوتا تو

سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ ڈاکٹر اُن کے درمیان کودتا۔ بہرحال پنجابی کی کہاوت کے مطابق اب بھی گرے ہوئے بیروں کا کچھ نہیں بگڑا تھا۔ نوری اور ڈاکٹر کے تعلق کا پتہ شروع میں ہی چل گیا تھا۔ ابھی معاملہ اس حد تک نہیں بڑھا تھا کہ نوری کو بدچلن یا بدکار قرار دیا جاسکتا۔ نوری ڈاکٹر کے دواخانے میں آدھ پون گھنٹہ موجود رہی تھی لیکن اُس وقت بوڑھا ملازم ہاشو بھی اندر موجود تھا اور اُس نے مسجد میں جاکر قسم کھائی تھی کہ نوری اور ڈاکٹر صرف ''باتیں'' کرتے رہے تھے۔

یہ دو روز بعد کی بات ہے۔ سردی اپنے زوروں پر تھی۔ شام سے بوندا باندی بھی ہو رہی تھی۔ میرے سر میں درد تھا۔ اس لیے تھانے سے جلد ہی فارغ ہو کر اپنے رہائشی کوارٹر میں لیٹا ہوا تھا کہ دروازے سے باہر اچھو کے کھانسنے کی آواز آئی۔ اس کے ساتھ ہی کسی نے اپنے بھاری بھرکم ہاتھ سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ شبے کی کوئی گنجائش نہیں تھی کہ اچھو ملنے آیا ہے۔ میں پچھلے چند روز سے بڑی شدت کے ساتھ اُس کا انتظار کر رہا تھا۔ ایک دو دفعہ اُس کے گھر بلال شاہ کو بھی بھیج چکا تھا لیکن ہر دفعہ یہی پتہ چلتا تھا کہ وہ شہر گیا ہوا ہے۔ جلدی سے اٹھ کر میں نے دروازہ کھولا۔ اس کی صورت دیکھتے ہی مجھے چوکنا ہونا پڑا۔ وہ کسی سے لڑ کر آیا تھا۔ چہرے پر ایک دو جگہ چوٹوں کے نشان تھے۔ بال بکھرے ہوئے تھے اور گریبان ادھڑا ہوا تھا۔ گرم چادر سمیت اُس کا سارا لباس بری طرح بھیگا ہوا تھا اور بارش میں مزید بھیگ رہا تھا۔ وہ میرے ساتھ اندر آ گیا۔

''کیا کارنامہ کرکے آئے ہو؟'' میں نے کمرے میں پہنچ کر پوچھا۔

''کارنامہ تو نہیں کیا ایک چھوٹا سا فرض پورا کیا ہے۔'' وہ بولا۔

''مثلاً؟'' میں نے وضاحت طلب کی۔

''اُس کتی کے پتر کو عشق بازی کا مزہ چکھایا ہے۔''

میں بری طرح چونک گیا۔ اچھو کا اشارہ یقیناً گلزار کی طرف ہی تھا۔ ''پوری بات بتاؤ'' میں نے تیزی سے پوچھا۔

''کوئی لمبی چوڑی بات نہیں۔'' وہ اپنی چادر اتار کر انگیٹھی کے قریب ہوتے ہوئے بولا۔ ''میں آج اُس کے دواخانے گیا تھا...... امرتسر والے دواخانے میں۔ میں نے اُس سے کہا، تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے آؤ میرے ساتھ۔ وہ بولا میں تیرے حرامی باپ کا نوکر نہیں ہوں، دفع ہو جاؤ یہاں سے...... بس پھر میں نے ایسا ہاتھ ڈالا ٹینٹوے پر کہ آواز نہیں نکل سکی سالے کی۔ گردن دبوچ کر جو اٹھایا تو سیدھا ٹیکسی میں لا پھینکا۔ یہ میرے ایک

دوست کی ٹیکسی تھی۔ ہم اُسے نہر والے پُل پر لے گئے۔ یہاں میں نے شمشان گھاٹ کے اندر ٹیکسی رکوائی اور باہر نکال کر سالے کو چھینٹی لگائی۔ پہلے تو ماں کے ویر نے بڑی چمک دکھائی۔ ایک دو مکے بھی مارے میرے منہ پر لیکن پھر چڑھ گیا میرے ٹیٹے۔ مار مار کر بھرکس نکال دیا کنجر کے تخم کا۔ اللہ نے چاہا تو دو مہینے اٹھ نہیں سکے گا چارپائی سے۔''

''لیکن اب کہاں ہے وہ؟'' میں نے پوچھا۔

''ہوگا اسپتال میں یا کسی دواخانے میں۔''

''کوئی ہاتھ پاؤں تو نہیں توڑ دیا اُس کا؟''

''ٹوٹا ہوگا ضرور ٹوٹا ہوگا۔ اچھو کے ہاتھ لگے ہیں اُسے، کوئی مخول نہیں ہے۔'' وہ نفرت سے فرش پر تھوک کر بولا۔

یہ دفعہ 320 کا کیس تھا۔ میں جلد جلد حساب لگانے لگا کہ پرچہ کٹایا گیا تو قانون کے دائرے میں رہ کر اچھو کے ساتھ زیادہ سے زیادہ رعایت کیا ہو سکتی ہے۔ یہ بات تو اچھو بھی جانتا تھا کہ میں نے اُس کی ناجائز حمایت کبھی کی ہے اور نہ کروں گا۔ بے شک ڈاکٹر گلزار کو میں بھی اچھا نہیں سمجھتا تھا لیکن اپنی ذاتی رائے کو سامنے رکھ کر اُس کے خلاف کوئی قدم اٹھانا میرے لیے قطعی ناممکن تھا۔ میں نے جو کچھ کرنا تھا قانون کی ہدایت کے مطابق کرنا تھا۔

بارش کی وجہ سے گاؤں سنسان پڑا تھا۔ کسی بندے بشر نے اچھو کو میرے کوارٹر میں داخل ہوتے نہیں دیکھا تھا۔ میں نے مناسب سمجھا کہ وہ خاموشی کے ساتھ رات یہیں گزار لے۔ اس دوران میں اُسے سمجھا بجھا بھی سکتا تھا۔ میری طبیعت خراب تھی۔ اس لیے بلال شاہ شام کو میرے لیے جو کھانا لایا تھا وہ جوں کا توں پڑا تھا۔ میں نے انگیٹھی پر رکھ کر یہ کھانا دوبارہ گرم کر دیا۔ بکرے کے پائے کا سالن تھا۔ تندوری روٹی تھی اور تھوڑے سے میٹھے چاول تھے۔ اچھو نے سیر ہو کر کھانا کھایا۔ پھر تہبند کی ڈب سے سگریٹ نکال کر پینے لگا۔ وہ آٹھ دس دن بعد گاؤں آیا تھا۔ میں نے اُسے وہ باتیں بتائیں جو بلال شاہ کی زبانی مجھ تک پہنچتی رہتی تھیں۔ میں نے اُسے اطلاع دی کہ نوری کو ایک ڈیڑھ ماہ کے اندر بیاہنے کی بات ہو رہی ہے اور نوری کے رشتے کے لیے اُس کا نام بھی لیا جا رہا ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ اچھو کی بڑی بڑی خوابیدہ آنکھوں میں موہوم سی چمک پیدا ہو گئی ہے۔ وہ میری بات مزید غور سے سننے لگا۔

میں نے کہا۔ ''اچھو! جو کچھ ہوا وہ کچھ زیادہ اہم نہیں ہے۔ ڈاکٹر سے نوری کی میل ملاقات ایک وقتی سی بات تھی۔ اب پنچایت میں ڈاکٹر جو بکواس کر چکا ہے اس کے بعد نوری اُس کے منہ پر تھوکے گی بھی نہیں۔ اس وقت وہ ڈانوں ڈول ہے۔ تم نے اُسے سہارا دیا تو

ساری زندگی تمہاری ہو کر رہے گی۔"

میں نے محسوس کیا کہ میری باتیں اچھو کے دل پر اثر کر رہی ہیں۔ ممکن تھا کہ یہ باتیں پہلے ہی اُس کے دل میں موجود ہوں۔ بظاہر وہ سامنے دیوار کو دیکھ رہا تھا لیکن اُس کی آنکھوں میں وہ حسین پُرشباب جسم بھرا ہوا تھا جسے وہ بچپن سے چاہتا آیا تھا۔ وہ بے انتہاء بوجھل اور لمبے بال جنہوں نے ایک جال کی طرح اُس کی سوچوں کو جکڑے رکھا تھا...... وہ اپنی گمراہ زندگی کو راستے پر لانے کے لیے اب بھی نوری کا ضرورت مند تھا۔ اُسے اپنانا چاہتا تھا۔

اُس وقت رات کے دو بجے تھے جب بیرونی دروازے پر زور کی دستک سنائی دی۔ میرا دھیان فوراً چوہدری نذیر کی طرف چلا گیا۔ وہ بیٹے کی مار پیٹ کی اطلاع دینے آیا ہو۔ کمرے کا دروازہ بند کر کے میں صحن میں آیا۔ "کون ہے؟" میں نے پوچھا۔ جواب میں بلال شاہ کی آواز سنائی دی۔ میں نے دروازہ کھولا۔ بارش بدستور جاری تھی۔ بلال شاہ کے بال بھیگ کر پیشانی سے چپکے ہوئے تھے۔ اُس کے چہرے پر ہیجانی کیفیت تھی۔

"کیا بات ہے؟" میں نے پوچھا۔

وہ بولا۔ "اچھو نے ڈاکٹر گلزار کو قتل کر دیا ہے۔" بلال شاہ کے الفاظ دھماکے کی طرح میرے کانوں میں گونجے۔ میں حیرت سے اُس کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ بولا۔ "تھوڑی دیر پہلے امرتسر سے دو تین بندے آئے ہیں۔ انہوں نے چوہدری نذیر کو یہ بات بتائی ہے۔ ڈاکٹر گلزار کی لاش سول ہسپتال میں پڑی ہے۔ چوہدری اپنے کچھ رشتے داروں کو لے کر امرتسر گیا ہے۔ گلزار کی ماں کو غشی کے دورے پڑ رہے ہیں۔"

مجھے بلال شاہ کی باتوں پر یقین نہیں آ رہا تھا لیکن یقین کیے بغیر چارہ بھی نہیں تھا۔ ایک دم مجھے خطرہ محسوس ہوا۔ بلال شاہ بہت دھیمی آواز میں بولا تھا مگر رات کے سناٹے میں یہ آواز اچھو کے کانوں تک پہنچ سکتی تھی۔ میں نے کمرے کے بند دروازے کی طرف دیکھا۔ عین اُس وقت دروازے میں حرکت پیدا ہوئی۔ پٹ کھلے اور اچھو کمرے سے نکل کر پوری رفتار سے بیرونی دیوار کی طرف بھاگا۔ یہ دیوار زیادہ اونچی نہیں تھی اور اچھو جیسا جنگلی گھوڑا ایک ہی جست میں یہ دیوار پھلانگ سکتا تھا۔ ایک لمحہ پہلے میرے ذہن میں پیدا ہونے والا اندیشہ سو فیصد درست ثابت ہوا تھا۔ اچھو نے بلال شاہ کی زبان سے نکلنے والے الفاظ سن لیے تھے اور اب گرفتاری سے بچنے کے لیے راہِ فرار اختیار کر رہا تھا۔ یہ سوچنے کا نہیں کچھ کرنے کا وقت تھا۔ پلک جھپکتے میں اچھو میری نظروں سے اوجھل ہو سکتا تھا۔ میں نے چند قدم بھاگ کر اس پر جست کی اور صحن کے عین درمیان اُسے جا لیا۔ ہم اوپر نیچے کیچڑ آلود صحن میں گرے اور لت

پت ہو گئے۔ اچھو میرا محسن تھا اور دوست بھی، لیکن اس وقت وہ صرف ایک قاتل تھا اور مجھے اُس کو گرفتار کرنا تھا۔ میں نے ایک بھرپور مکہ اس کی ٹھوڑی پر جمایا۔ جواب میں اُس نے میری پسلیوں میں زوردار گھٹنا مارا اور دوسرے پاؤں سے مجھے اچھال کر دور پھینک دیا۔ اس کے لمبے تڑنگے جسم میں کسی وحشی گھوڑے کا سا زور تھا۔ میں اُس کے ڈیل ڈول کو بڑی پسندیدگی کی نظر سے دیکھا کرتا تھا اور آج یہی ڈیل ڈول میرے مقابلے میں تھا۔ میں بیرونی دروازے کی طرف گرا تھا۔ یعنی اچھو بھاگنا چاہتا تو اس کے لیے ضروری تھا کہ مجھے راستے سے ہٹائے۔ اس نے بالکل کبڈی کے انداز میں مجھے جھکی دینے کی کوشش کی۔ میں نے اُس کا یہ وار خالی کر دیا اور بھاگ کر اُسے جپھے میں لے لیا۔ اس بار ہم دونوں برآمدے کے اندر کمرے کے بالکل سامنے گرے۔ گرتے گرتے اچھو میرے ہاتھوں سے چکنی مچھلی کی طرح پھسل گیا اور سنبھل کر کمرے کی طرف بھاگا۔ پہلے تو مجھے اس کی یہ حرکت سمجھ میں نہیں آئی۔ پھر اندازہ ہوا کہ وہ میرے سرکاری ریوالور کی طرف گیا ہے جو دیوار سے لٹکا ہوا ہے۔ یہ بڑی خطرناک صورتِ حال تھی۔ میں نے ایک بار پھر اُس پر چھلانگ لگائی۔ میرا دھکا کھا کر وہ منہ کے بل دیوار سے ٹکرایا۔ پھر تیزی سے گھوما۔ مجھے نیچے جھکنے میں ایک ساعت کی تاخیر ہوتی تو اس کا ہتھوڑے جیسا مکا میرے جبڑے کو ہلا دیتا۔ اُس کا وار خالی گیا تو میں نے رانوں میں ہاتھ دے کر اُسے اٹھایا اور پوری قوت کے ساتھ دیوار سے دے مارا۔ اُس کے حلق سے دردناک آواز نکلی۔ کوئی اور ہوتا تو اس چوٹ سے سنبھل نہ سکتا لیکن وہ لاہور اور کراچی کے بدمعاشوں میں رہ کر اور رات دن مارا ماری کر کے بہت سخت جان ہو چکا تھا۔ شدید چوٹ کھا کر بھی وہ نہ صرف پاؤں پر کھڑا رہا بلکہ میرے پیٹ میں گھٹنا رسید کرنے کی ایک ناکام کوشش بھی کر ڈالی۔ میں نے پنجوں پر کھڑے ہو کر ایک زوردار دوہتڑ اُس کی گردن پر مارا۔ وہ انگیٹھی پر اوندھے منہ گرتے گرتے بچا۔ قریب ہی کھانے کے خالی برتن پڑے تھے۔ اچانک اُس نے نہ جانے کیا کیا۔ وہ تیزی سے گھوما اور میری آنکھوں میں مرچیں ہی مرچیں بھر گئیں۔ میں نے بڑی کوشش سے آنکھیں کھولنے کی کوشش کی لیکن ناکامی ہوئی۔

"بلال شاہ پکڑو اسے۔" میں آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر چلایا۔

بلال شاہ ایک چھوٹی سی بڑھک مار کر اُس سے لپٹ گیا۔ "چھوڑ دے مجھے بہن کے ویر نہیں تو پیٹ پھاڑ دوں گا۔" اچھو کی خوفناک آواز میرے کانوں میں پڑی۔ پھر مجھے اندازہ ہوا کہ اچھو نے بلال شاہ کو اٹھا کر دروازے سے دے مارا ہے۔ یہ بڑی زبردست ٹکر تھی۔ دروازہ باہر سے کھلتا تھا۔ لہٰذا بلال شاہ کے ٹکرانے سے ایک پٹ چکنا چُور ہو گیا۔ میں اندھوں کی طرح

ٹٹولتا ہوا گھڑے تک آ پہنچا۔ آنکھوں میں ٹھنڈے پانی کے چھینٹے دیئے۔ اتنے میں ا(ُس)
بیرونی دیوار سے فرار ہو چکا تھا۔ جیسا کہ بعد میں پتہ چلا اُس خبیث نے میرے چہرے (پر)
سالن کا بچا ہوا شوربہ پھینکا تھا۔

ڈاکٹر گلزار کا قتل ہونا کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ سارے علاقے میں دہائی مچ گئی۔ گل(زار)
کی لاش امرتسر نہر کے کنارے کالے شمشان گھاٹ میں پڑی پائی گئی تھی۔ رات گئے ا(یک)
چوکیدار نے لاش دیکھی تھی۔ اُس نے دوسرے لوگوں کو بتایا۔ قریبی تھانے میں اطلاع دی (گئی)
اور پولیس موقعہ پر پہنچ گئی۔ متوفی کے جسم پر کئی ضربات تھیں۔ ایک کلائی کی ہڈی بھی ٹوٹی ہو(ئی)
تھی۔ تاہم سب سے شدید ضربات اُس کے سر پر آئی تھیں۔ کنپٹی اور پیشانی کے قریب دو (زخم)
تھے اور اُن میں سے خون رس رس کر پورے چہرے کو رنگین کر رہا تھا۔ رات تین بجے امر(تسر)
جا کر میں نے خود موقعہ ملاحظہ کیا۔ اُس وقت تک لاش اٹھائی جا چکی تھی اور جہاں جہاں خو(ن)
کے دھبے تھے وہاں اینٹوں کی کیاریاں سی بنا دی گئی تھیں۔ موقعے پر گاڑی کے پہیوں (کے)
نشانات موجود تھے اور گیلی زمین پر دھینگا مشتی کے آثار بھی صاف نظر آتے تھے۔ ڈاکٹر (گلزار کے)
شہر والے دواخانے میں کم از کم تین گواہ ایسے موجود تھے جن کے سامنے اچھو دواخانے (میں)
گھسا تھا اور اُس نے ڈاکٹر کو اٹھا کر ٹیکسی میں پٹخا تھا۔ ٹیکسی پر کوئی نمبر پلیٹ نہیں تھی اور ا(سے)
ایک دبلا پتلا سکھ چلا رہا تھا۔ ٹیکسی ڈاکٹر کو لے کر روانہ ہو گئی تو محلے میں شور مچ گیا تھا۔ ایک
اسکوٹر پر تین آدمی بیٹھ کر ٹیکسی کے پیچھے روانہ ہوئے تھے لیکن دس پندرہ منٹ بعد ناکام وا(پس)
آئے تھے۔

سب گواہیاں اچھو کے خلاف جاتی تھیں۔ اس بات میں اس شبے کی کوئی گنجائش نہ(یں)
تھی کہ اچھو نے ڈاکٹر گلزار سے نوری کی بے عزتی اور بدنامی کا بدلہ لیا ہے۔ وہ پہلے دن (سے)
گلزار کو اپنا رقیب سمجھتا تھا۔ اُس کے اندر دشمنی کے جذبات مسلسل پرورش پا رہے تھے۔ جب
ڈاکٹر گلزار نے اُس کی خالہ زاد کو پورے گاؤں میں بدنام کر دیا تو وہ خود پر قابو نہ رکھ (سکا اور)
گلزار کو اتنا مارا کہ وہ جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔

یہ بات بالکل سامنے کی تھی کہ اچھو ڈاکٹر گلزار کو قتل کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اُس نے (تو)
اُسے مار لگائی تھی جان سے نہیں مارا تھا۔ اگر اُس نے اُسے جان سے مارا ہوتا تو (وہ)
میرے پاس نہ آتا۔ اُس نے غلطی یہ کی تھی کہ اُسے نیم بے ہوش کر کے وہاں پھینک آیا (تھا)
وہ زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے جاں بحق ہو گیا تھا...... تقدیر ایک بار پھر اچھو کو دغا (دے گئی)
تھی۔ اگر وہ یہ سب کچھ نہ کرتا تو حالات خود بخود اُس کے حق میں ہو رہے تھے۔ اُس کی

سے بڑی تمنا نوری کو حاصل کرنا تھی اور یہ تمنا پوری ہوتی نظر آ رہی تھی...... مگر اب وہ ایک
قاتل تھا اُس کا نصیب نوری کی بانہوں کا ہار نہیں پھانسی کا پھندا تھا۔

اچھو مفرور تھا اور اُسے گرفتار کر کے عدالت کے کٹہرے میں لانے کی پوری ذمہ داری
مجھ پر تھی۔ میں نے پوری دیانتداری سے تفتیش شروع کی لیکن اُس کا کوئی کھوج نہیں ملا۔
مقتول کے لواحقین کی طرف سے زبردست دباؤ تھا۔ وہ تفتیش تبدیل کرانا چاہتے تھے تاہم اعلیٰ
افسروں کو مجھ پر مکمل بھروسہ تھا۔ میں نے اپنا کام جاری رکھا۔ گلزار کی موت کے بعد اچھو کی
والدہ، بڑا بھائی اور اُس کی بیوی بچے گاؤں سے رفو چکر ہو چکے تھے۔ اُن بے چاروں کو خدشہ
تھا کہ اچھو کی کرنی اُن کے سامنے آئے گی اور گلزار کے وارث انہیں نقصان پہنچانے کی کوشش
کریں گے۔

تقریباً دو مہینے اسی طرح گزر گئے۔ اچھو کا پتہ چلا اور نہ اُس ٹیکسی ڈرائیور کا جس نے
واردات میں اچھو کی مدد کی تھی۔ بلال شاہ کی زبانی مجھے نوری کے گھر کی خبریں ملتی رہتی تھیں۔
وہ لوگ نوری کا رشتہ ڈھونڈ چکے تھے اور اب جلد از جلد اُسے گاؤں سے چلتا کرنا چاہتے تھے۔
اونچی لمبی پونے گنے جیسی نرم ملائم نوری کا نصیب امین فورمین جیسے کھردرے مرد سے جوڑا
جا رہا تھا۔ امین فورمین یوں تو اسی گاؤں کا تھا لیکن اب اُس نے امرتسر میں مکان بنا لیا تھا اور
اب گاؤں میں اُس کا آنا کبھی کبھار ہی ہوتا تھا۔ دیکھنے میں بھلا مانس اور ذمے دار شخص نظر آتا
تھا۔ اس کی عمر پینتیس کے قریب تھی۔ رنگ گندمی اور پیشانی سے بال اُڑے ہوئے تھے۔
امین فورمین کی ایک بیوی پہلے بھی تھی۔ شادی کے ایک ہی سال بعد ایک حادثے میں اُس کا
نچلا دھڑ مفلوج ہو گیا تھا اور وہ بے کار چیز کی طرح گھر میں پڑی رہتی تھی۔ نہ کام کاج کے
قابل تھی نہ بچے پیدا کر سکتی تھی۔ امین ایک سرکاری ورکشاپ میں ملازم تھا۔ یہاں سے اُسے
معقول تنخواہ ملتی تھی۔ اس کے علاوہ اُس نے گاڑیوں کے سپیئر پارٹس کی ایک دکان بھی کھول
رکھی تھی۔ اچھی بھلی آمدن تھی۔ وہ ایک عرصے سے دوسری شادی کا خواہش مند تھا۔ نوری کے
والدین سے اُس کی رشتے داری بھی تھی۔ نوری کی دو بڑی بہنیں اور بھی تھیں۔ اُن کی شادی
سے پہلے امین نوری کے والد سے اصرار کیا کرتا تھا کہ وہ اپنی ایک بیٹی دے کر اُس کا گھر بسا
دے لیکن مہتے نے کبھی اُس کی بات پر کان نہیں دھرا۔ اب قدرت نے انوکھا کھیل دکھایا تھا۔
مہتے کو اپنی سب سے چھوٹی اور خوبصورت بیٹی کا ہاتھ امین کے ہاتھ میں تھمانا پڑ رہا تھا اور وہ بھی
بڑی عاجزی کے ساتھ۔ نوری کی قسمت پر افسوس ہی کیا جا سکتا تھا۔ ایک چاہنے والے نے
اسے دھوکا دیا، دوسرے نے غضب میں آ کر پھانسی گھاٹ کے راستے پر قدم رکھ دیا۔ اب وہ

ایک پکی عمر کے بیاہتا مرد کے پلّے باندھی جا رہی تھی۔

دو ہفتے کے اندر اندر نوری کی شادی ہوگئی اور وہ امین فورمین کی دلہن بن کر امرتسر چلی گئی۔ یہ سراسر ایک بے جوڑ شادی تھی اور کسی کو بھی نوری کے اس انجام پر خوشی نہیں ہوئی۔ (رخصتی کے موقعے پر نوری کی ایک سہیلی تو رو رو کر بے ہوش ہوگئی اور بعد میں اُسے ہسپتال پہنچانا پڑا)

وقت اپنی دھیمی رفتار سے آگے کو سرکتا رہا۔ ہر نیا دن گزرنے والے دن کے واقعات پر گرد کی تہہ چڑھاتا رہا۔ راپور کی گلیوں میں ننگی ٹانگوں والے شریر بچے کھیلتے رہے، کنوؤں پر لڑکیاں گھڑے بھرتی رہیں۔ بیلے میں نوجوان ماہیے کی تانیں بکھیرتے رہتے اور پنچایت گاہ کے گھنے برگدوں کے نیچے بڑے بوڑھوں کی محفلیں جمتی رہیں۔ اگر کہیں دوبارہ رونق نظر نہیں آئی تو وہ دو جگہیں تھیں۔ ایک ڈاکٹر گلزار کا دیہاتی دواخانہ جو کھلنے کے دو ماہ بعد ہی بند ہوگیا تھا اور دوسرا اچھو کا گھر۔ جس کے مکین زندگی کے خوف سے اپنا بسیرا چھوڑ چکے تھے اور اب پختہ لکڑی کے دروازے پر لگا ہوا بڑا سا آہنی تالہ دن بدن زنگ آلود ہوتا جا رہا تھا۔

اچھو ابھی تک مفرور تھا اور مجھے شک تھا کہ وہ جلد یا بدیر نوری تک پہنچنے کی کوشش کرے گا۔ یہی وجہ تھی کہ نوری کے شوہر امین فورمین کو میں نے مسلسل نظر میں رکھا ہوا تھا۔ راپور سے امرتسر کا فاصلہ آٹھ دس میل سے زیادہ نہیں تھا۔ ہفتے میں ایک آدھ بار میرا امرتسر جانا ہو ہی جاتا تھا۔ میں جب بھی امرتسر جاتا کسی نہ کسی بہانے امین سے ملاقات ضرور کرتا۔ امرتسر کی اصل آبادی سے کچھ فاصلے پر وہ ایک بہت بڑی ورکشاپ میں کام کرتا تھا۔ یہ ورکشاپ کئی ایکڑ رقبے پر پھیلی ہوئی تھی۔ ورکشاپ کی حد بندی کرنے کے لیے خاردار تاریں لگائی گئی تھیں۔ ان تاروں کے اندر مختلف محکموں کی بے شمار نئی اور پرانی گاڑیاں کھڑی رہتی تھیں۔ امین کے نیچے پندرہ بیس مکینک کام کرتے تھے۔ وہ خود مین گیٹ کے پاس لکڑی کے ایک چھوٹے سے کیبن میں بیٹھا رہتا تھا۔ کوئی کام الجھ جاتا تو مکینک آکر اُسے بتا دیتے تھے...... میں نے امین کو صاف لفظوں میں سمجھا دیا تھا کہ وہ اشرف عرف اچھو کی طرف سے چوکس رہے۔ وہ مفرور ہے اور کسی بھی وقت سامنے آسکتا ہے۔ امین میری بات سمجھ گیا تھا۔ ویسے بھی یہ سارا قصہ الف سے لے کر یے تک اُسے معلوم تھا۔ اُس سے نوری کے بارے میں کوئی بھی بات چھپانا فضول تھا۔

ایک روز کچہری سے واپس آتے ہوئے میں امین سے ملنے رک گیا۔ ورکشاپ میں پہنچا تو وہ اپنے کیبن میں موجود نہیں تھا۔ کیبن سے باہر لوہے کی کرسیوں پر اُس کے تین چار

ملنے والے بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ نوجوان تھے اور دو ٹیکسیوں پر یہاں پہنچے تھے۔ شکل وصورت اور لباس سے وہ سب ٹیکسی ڈرائیور ہی لگتے تھے۔ میں سادہ لباس میں تھا اس لیے نوجوانوں نے میری موجودگی کی کوئی پرواہ نہیں کی اور اپنی روانی میں بات چیت کرتے رہے۔ وہ ایک دوسرے کو الٹے پلٹے ناموں سے پکار رہے تھے، فحش گالیوں سے نواز رہے تھے اور بار بار کسی دوڑ کا ذکر کر رہے تھے۔ میں نے اُن کی باتوں پر کان لگائے تو پتہ چلا کہ وہ کسی ٹیکسی دوڑ کا ذکر کر رہے ہیں اور اس دوڑ پر شرطیں وغیرہ لگانے کی بات ہو رہی تھی۔ اُن دنوں امرتسر میں ٹیکسی دوڑ اور تانگہ دوڑ کا بڑا رواج چلا ہوا تھا۔ یہ دوڑیں چوری چھپے لگتی تھیں اور ان پر بڑی بڑی شرطیں لگائی جاتی تھیں۔ اشرف عرف اچھو بھی ایسی دوڑ کا بہت شوقین تھا۔ وہ اس بارے میں بڑے بڑے دعوے کیا کرتا تھا اور یہ دعوے حقیقت سے کچھ ایسے خالی بھی نہیں تھے۔ بڑا تیز ڈرائیور تھا وہ۔ گاڑی ایسے چلاتا تھا جیسے ڈاکہ مار کر آیا ہو یا ڈاکو کا پیچھا کر رہا ہو اور یہ کسی ایک وقت کی بات نہیں تھی۔ گاڑی میں بیٹھتے ہی وہ ہوا کے گھوڑے پر سوار ہو جاتا تھا۔ ایک دفعہ ایک ٹیکسی دوڑ میں حصہ لینے کے لیے اُس نے اپنے پیر استاد کی ٹیکسی چرالی تھی اور راتوں رات امرتسر سے دہلی پہنچ گیا تھا۔ بڑی کشش تھی اُس کے لیے ایسے کاموں میں۔ ڈرائیوروں میں جو گفتگو ہو رہی تھی اُس سے مجھے چند اور باتوں کا پتہ بھی چلا۔ وہ امین فورمین کو استاد ملتانی کے نام سے یاد کر رہے تھے اور اُس کے متعلق بڑی دلچسپ باتوں میں مصروف تھے۔ ایک نے کہا۔ ''یار سنا ہے نئی استادنی استاد کو قریب نہیں پھٹکنے دیتی۔'' دوسرا بولا۔ ''بات تو ٹھیک لگتی ہے استاد ساری رات اکیلا چارپائی توڑتا رہتا ہے اسی لیے تو ورکشاپ آکر جمائیاں لینے لگتا ہے۔'' تیسرا بولا۔ ''اس سے تو دوسرا مطلب بھی لیا جاسکتا ہے۔ ہوسکتا ہے وہ رات کو استادنی کے ساتھ مل کر جاگتا ہو۔ دونوں نو کا پہاڑہ یاد کرتے رہتے ہیں۔'' سب سے پہلے والے فربہ اندام ڈرائیور نے قہقہہ لگایا۔ ''نہیں یار! رات کو نو کا پہاڑہ پڑھا جاتا تو ورکشاپ آکر استاد کا موڈ اس طرح خراب نہ ہوتا۔ دیکھتے نہیں ہر ایک کو کاٹنے دوڑتا ہے۔'' بھورے رنگ کا ایک پھرتیلا سا نوجوان ڈرائیور بولا۔ ''ہم سب کھوتے کے پتر ہیں۔ ایک ایسے شخص کے بارے میں پریشان ہو رہے ہیں جو ہے ہی استاد۔ اڑیل سے اڑیل گاڑی اس کے ہاتھ میں آکر رواں ہو جاتی ہے۔ استادنی کو اسٹارٹ ہوتے بھی زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ دیکھ لینا تم......''

یکا یک اُن سب کو چپ ہونا پڑا۔ امین فورمین ایک میلے کپڑے سے ہاتھ پونچھتا واپس چلا آ رہا تھا۔ اُس کے ساتھ ایک نوعمر مکینک بھی تھا۔ مجھے دیکھ کر امین سیدھا میری طرف چلا آیا۔ نوعمر مکینک نے باہر بیٹھے ڈرائیوروں کے ساتھ سرگوشیاں کیں اور وہ خاموش ہوگئے۔

نوعمر مکینک نے غالباً انہیں بتا دیا تھا کہ اندر تھانیدار بیٹھا ہے وہ ذرا ہوش سے گل بات کریں۔
امین فورمین میرے ساتھ باتوں میں مصروف ہو گیا۔ گفتگو کے دوران اس کی کلائی پر سے قمیص کا بازو اوپر ہوا تو میری نگاہ اُس گھڑی پر پڑی۔ میں چونک گیا۔ سنہری ڈائل والی یہ خاصی قیمتی گھڑی تھی۔ کم از کم پانچ سو قیمت تھی اس کی۔ اس سے پہلے بھی میں امین کے پاس کئی مہنگی اشیاء دیکھ چکا تھا۔ ابھی حال ہی میں اس نے تین چار ہزار روپے کی ایک سیکنڈ ہینڈ موٹر سائیکل بھی خریدی تھی۔ جرمنی کی بنی ہوئی یہ دیوہیکل موٹر سائیکل وہ گاؤں بھی لے کر گیا تھا۔ دور دور سے لوگ یہ عجیب وغریب شے دیکھنے کے لیے جمع ہو گئے تھے۔ ہر طرف مشہوری ہو گئی تھی کہ مہتے کا داماد "دس گھوڑوں کی طاقت" والی موٹر سائیکل چلاتا ہے۔ مجھے صاف طور پر اندازہ ہو رہا تھا کہ امین فورمین کے پاس اُس کی آمدن سے زیادہ پیسے ہیں۔ میں نے اس کی دکان دیکھی ہوئی تھی اور تنخواہ کا بھی پتہ تھا۔ وہ جتنا "خوشحال" نظر آ رہا تھا اتنا ہو نہیں سکتا تھا۔ نہ جانے کیوں میرے ذہن میں اُس کے خلاف شبہات سر اٹھانے لگے۔

میں نے اپنے ایک ہوشیار مخبر کو مستقل طور پر امین فورمین کی نگرانی پر لگا دیا۔ یہ مخبر اُسی علاقے کا رہائشی تھا جہاں امین فورمین اپنی دونوں بیویوں کے ساتھ رہائش پذیر تھا۔ اس مخبر نے آٹھ دس روز کے اندر مجھے کئی کارآمد اطلاعات دیں۔ ان اطلاعات سے اس بات کی تصدیق بھی ہوئی کہ اپنی نئی نویلی دلہن سے امین کی ناچاقی ہے۔ وہ اسے ڈانٹتا ڈپٹتا ہے اور وہ بھی کمرہ بند کئے پڑی رہتی ہے۔ مخبر نے ایک اور خاص خبر بھی دی۔ اُس نے بتایا کہ امین فورمین کے ایک بھگتو نامی نوجوان سے تعلقات ہیں اور یہ نوجوان چوری چھپے گاڑیوں کے پُرزے فروخت کرتا ہے۔ مخبر نے بتایا کہ بھگتو یہ کام اپنے گھر پر کرتا ہے۔ جن لوگوں کو اُس کے کاروبار کا پتہ ہے وہ بڑی رازداری سے اُس کے گھر واقع "ٹھنڈی کھوئی" پر پہنچتے ہیں اور نہایت قیمتی پُرزے کوڑیوں کے بھاؤ خرید لاتے ہیں۔

یہ اطلاع میرے لیے خاصی اہم اور دلچسپ تھی۔ بعض اوقات "تفتیش" اپنا راستہ خود چن لیتی ہے۔ میں نے امین فورمین سے رابطہ اس لیے رکھا ہوا تھا کہ اگر اچھو اُس تک پہنچنے کی کوشش کرے تو گرفتار کیا جائے لیکن اس رابطے کی وجہ سے امین کا ایک راز کھل کر سامنے آ گیا تھا۔ میں نے اس اطلاع کی تصدیق کرنے کی ذمہ داری بلال شاہ کو سونپی۔ وہ ایک فرضی گاہک کے طور پر امرتسر پہنچا اور کچھ ڈرائیور ٹائپ لوگوں سے مل ملا کر بھگتو تک جا پہنچا۔ بلال شاہ نے بھگتو سے ایک موریس کار کا ایکسل خریدا۔ عرف عام میں اسے گوڈا بھی کہتے ہیں۔ یہ گوڈا اُن دنوں مارکیٹ میں بہت مشکل سے ملتا تھا اور اگر ملتا بھی تھا تو سو روپے سے کم قیمت

نہیں ہوتی تھی۔ بلال شاہ نے یہ صرف بیس روپے میں خریدا اور اُسے اخبار کے کاغذ میں لپیٹ کر سیدھا میرے پاس راپور لے آیا۔ پُرزوں کی تھوڑی بہت پہچان مجھے بھی تھی۔ میں نے اچھی طرح گوڈے کا معائنہ کیا۔ وہ بالکل برانڈ نیو اصلی پُرزہ تھا۔

میں نے اس معاملے میں تھوڑی سی تفتیش اور کرائی تو سعد اللہ خان نامی ایک پٹھان ٹرک ڈرائیور سلطانی گواہ بن گیا۔ اُس نے بتایا کہ شروع شروع میں اُس نے بھی بھگتو سے کچھ پُرزے خریدے تھے۔ وہ ایک عرصے سے یہ کام کر رہا ہے اور ہزاروں کما چکا ہے۔

تھانے میں سنسنی خیز انکشاف کرتے ہوئے سعد اللہ خان نے کہا۔ "انسپکٹر صیب! اس حرام خور بھگتو کے گھر میں ہزاروں کا مال پڑا رہتا ہے۔ وہ یہ پُرزے گورنمنٹ کے ورکشاپ سے "چوری کرتی" ہے۔ اصل بات تو خدا "جانتی" ہے لیکن جہاں تک ہمیں معلوم ہے ملی بھگت کے بغیر یہ کام نہیں ہوسکتا۔ وہ کا پھر کا بچی امین پھورمین بھی اس کا پورا پورا مدد کرتی ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "امین فورمین کیا مدد کرتا ہے؟"

وہ بولا۔ "وہ اپنی آنکھیں بند رکھتی ہے۔ بس یہی اُس کا بہت بڑا مدد ہے۔ بھگتو اور اُس کے ساتھی رات کو جاتے ہیں۔ تار کاٹ کر ورکشاپ میں گھستے ہیں اور گاڑیوں کا انجر پنجر ڈھیلا کر کے لے آتے ہیں۔ سب کچھ امین پھورمین کی ناک کے نیچے ہوتا ہے لیکن وہ خدائی خوار چپ رہتی ہے۔ اُس کو چپ رہنے کا قیمت ملتی ہے۔ رشوت کھاتی ہے وہ۔"

میں نے پوچھا۔ "یہ کام کب سے ہو رہا ہے؟"

سعد اللہ خان نے جواب دیا۔ "ام کو نہیں مالوم...... لیکن چار پانچ مہینے سے یہ کام بڑے زور پر ہے۔ ام نے سنا ہے کہ پہلے پہلے امین پھورمین اُس حرامی بھگتو کی بات نہیں مانتی تھی۔ راضی ہی نہیں ہوتی تھی۔ اُسے اپنی نوکری کا خطرہ تھا پھر مالوم نہیں کیا بات ہوا وہ راضی ہو گیا۔ اب وہ بھگتو کے سامنے چوں نہیں کرتی۔ کھلی چھٹی دے دی ہے اُس بے ایمان کو...... اور وہ دیمک کا مافق رات دن چاٹ رہی ہے ورکشاپ کی گاڑیوں کو......"

سعد اللہ خان نے اس معاملے پر بہت کھل اور تفصیل سے بات کی۔ اُس کی گفتگو سے میں نے یہ نتیجہ نکالا کہ امین فورمین پُرزوں کی اس چوری میں ملوث تو ہے لیکن اس کام کے لیے اُسے مجبور کیا گیا ہے۔ شروع شروع میں اُس نے بھگتو سنگھ کی بات نہیں مانی بلکہ اُسے پکڑوانے کی دھمکیاں بھی دیں لیکن کچھ عرصہ بعد اچانک نہ جانے کیا ہوا کہ سب اندیشے بالائے طاق رکھ کر وہ بھگتو سنگھ کی لائن پر آ گیا۔ دوسرے لفظوں میں بھگتو سنگھ نے اُسے مجبور

کر دیا کہ وہ ورکشاپ میں ہونے والی چوری سے آنکھیں بند رکھے۔ اس چشم پوشی کے بدلے میں بھگتو سنگھ اپنی کالی کمائی میں سے کچھ رقم امین فورمین کو بھی دے دیتا تھا۔ یہ رقم صرف امین فورمین کی نہیں ہوتی تھی بلکہ کئی اور افراد بھی اس میں شریک تھے۔ جن میں ورکشاپ کے دو چوکیدار بھی شامل تھے۔ امین کے حصے میں مشکل سے ڈیڑھ سو روپیہ آتا تھا۔ یعنی ایک معمولی رقم کے عوض امین فورمین ایک بڑا خطرہ مول لینے پر مجبور تھا اور اس وجہ سے بھگتو سنگھ سے اکثر اس کی لڑائی بھی رہتی تھی...... درحقیقت وہ اس دلدل سے نکلنا چاہتا تھا لیکن بھگتو سنگھ کے ہاتھ میں معلوم نہیں کون سی ایسی کل تھی کہ وہ دباتا تھا تو امین اُس کے سامنے بے بس ہو جاتا تھا۔

بھگتو سنگھ کے بارے میں مَیں نے دوسرے ذریعوں سے بھی معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی۔ معلوم ہوا کہ وہ ایک خطرناک شخص ہے۔ اُس کا کوئی قریبی رشتہ دار کسی بہت بڑے سرکاری عہدیدار کا ڈرائیور ہے۔ اس تعلق کی وجہ سے وہ چھوٹے بڑے کئی کیسوں میں بری ہو چکا ہے۔ بہت ہتھ چھٹ شخص ہے۔ چند ماہ پہلے وہ بھیک مانگنے والی ایک نوجوان لڑکی کو اٹھا کر اپنے مکان میں لے گیا تھا۔ لڑکی کا شوہر اسے چھڑانے کے لیے پہنچا تو بھگتو سنگھ نے اُس سے ہاتھا پائی کی اور ایسا زوردار مکا اُس کے سر پر مارا کہ وہ وہیں تڑپ کر مر گیا۔ بعد میں وہ اس قتل سے صاف بری ہو گیا۔ متعلقہ انسپکٹر نے اپنی رپورٹ میں لکھ دیا کہ متوفی نشے کا عادی تھا اور دماغ کی شریان پھٹنے سے مرا ہے۔ پتہ نہیں کیسے لڑکی نے بھی عدالت میں بیان دے دیا کہ مرنے والے سے بھگتو سنگھ کی کوئی ہاتھا پائی نہیں ہوئی تھی۔ اس طرح کے اور کئی قصے بھگتو سنگھ کے متعلق مشہور تھے۔ پیشے کے لحاظ سے وہ ٹیکسی ڈرائیور تھا اور غیر شادی شدہ تھا۔

میں نے فیصلہ کیا کہ بھگتو سنگھ کو رنگے ہاتھوں پکڑا جائے تا کہ بہت بڑے افسر کا ڈرائیور کوئی چاچا ماما اُسے چھڑا نہ سکے۔ اپنے مخبر کے ذریعے اور سلطانی گواہ کی مدد سے میں نے امین فورمین کا کچا چٹھا جان لیا۔ ورکشاپ میں چوری کی واردات عموماً جمعرات اور جمعے کی درمیانی شب کو ہوتی تھی۔ اس روز امین فورمین کی ڈیوٹی رات کو ہوتی تھی۔ وہ مخصوص گاڑیوں کے بونٹ شام کو ہی کھلوا دیتا تھا۔ چوکیدار اُس سے ملے ہوئے تھے وہ دائیں بائیں ہو جاتے تھے۔ بھگتو سنگھ اپنے ایک یا دو ساتھیوں کے ساتھ ورکشاپ میں گھستا تھا اور گاڑیوں کا پوسٹ مارٹم شروع کر دیتا تھا۔

وہ جمعرات کی ٹھٹھری ہوئی شب تھی۔ بارہ ساڑھے بارہ بجے کا عمل تھا۔ اپنے اے ایس آئی اور عملے کے چار افراد کے ساتھ میں نے خاموشی سے ورکشاپ میں چھاپہ مارا۔ سلطانی گواہ سعد اللہ خان کے علاوہ ورکشاپ کا ایک نوجوان مکینک رگبیر بھی ہمارے ساتھ تھا۔ ہم

سب سے پہلے امین فورمین کے کیبن میں گھسے۔ وہ سرے سے اپنی ڈیوٹی پر موجود ہی نہیں تھا۔ اُس کی جگہ ایک کالا کلوٹا رنگ ساز کرسی پر ٹانگیں پسارے سو رہا تھا۔ رگبیر کی رہنمائی میں ہم ورکشاپ کے وسیع و عریض احاطے میں پہنچے۔ وہ ہمیں ایک بس میں لے گیا۔ اب بس کی باڈی تیار ہو چکی تھی۔ صرف رنگ وغیرہ ہونے والا تھا۔ ہم دروازے کھول کر اندر داخل ہوئے تو دونوں چوکیداروں سے ملاقات ہو گئی۔ وہ اپنی رائفلیں ایک طرف رکھے بڑی تسلی سے تاش کھیل رہے تھے۔ ایک سیٹ پر شراب کی خالی بوتل لڑھکی ہوئی تھی۔ فرش پر ہڈیوں، مونگ پھلی اور چلغوزوں کے چھلکوں کی بہار تھی۔ بس کی اندرونی روشنی میں چوکیداروں کے چہرے سرسوں کی طرح زرد نظر آنے لگے۔ انہیں فوری طور پر حراست میں لے لیا گیا...... اب رگبیر ہمیں ورکشاپ کے شمالی حصے کی طرف لے گیا۔ یہاں ایک جگہ سفید رنگ کی بے شمار چھوٹی جیپیں کھڑی تھیں۔ یہ بالکل نئی گاڑیاں تھیں لیکن کھلے آسمان تلے ہونے کے سبب گرد و غبار سے اٹی ہوئی تھیں۔ اُن کی حالت دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ وہ طویل عرصے سے یہاں پارک ہیں اور موسم کی سختی سہہ رہی ہیں۔ ان گاڑیوں کا تعلق محکمہ جنگلات سے تھا۔ معلوم نہیں کس وجہ سے یہ ابھی تک بے کار پڑی تھیں۔ رگبیر ہمیں گاڑیوں کی طویل قطاروں میں سے گزار کر عقبی سمت میں لے آیا۔ وہ اس سارے چکر سے بخوبی آگاہ تھا۔ اُس نے ہمیں پانچ ایسی گاڑیاں دکھائیں جن کے بونٹ کھلے ہوئے تھے۔ یہ گاڑیاں آج رات کے ''پوسٹ مارٹم'' کے لیے تیار تھیں۔

میں نے فالتو آدمیوں کو ورکشاپ کے آفس میں واپس بھیج دیا اور خود اے ایس آئی باجوہ اور دو سپاہیوں کے ساتھ محکمہ زراعت کی ایک اسٹیشن ویگن میں گھس کر بیٹھ گیا۔

اُس وقت رات کا ایک بجا تھا جب خاردار تاروں کی طرف کچھ ہلچل محسوس ہوئی۔ ہم چوکنے ہو کر بیٹھ گئے۔ چند سائے تاروں کے قریب متحرک نظر آ رہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے تار کاٹے اور احاطے میں گھس آئے۔ وہ تعداد میں چار تھے۔ اُن میں سے دو کے ہاتھ میں تھیلے تھے۔ یقیناً ان میں اوزار تھے۔ اس مقام پر قریباً تاریکی تھی۔ وہ بڑے اطمینان سے دبے پاؤں چلتے ''کھلے بونٹ'' والی جیپوں کی طرف گئے اور اپنی کارروائی میں مصروف ہو گئے۔ ایک فوٹو گرافر ہمارے ساتھ تھا۔ تیز روشنی والی ٹارچیں بھی تھیں۔ ہم ایک ساتھ اسٹیشن ویگن سے باہر نکلے اور ٹارچیں روشن کر دیں۔ چاروں اچھے روشنی میں نہا گئے۔ اُن میں سے ایک لمبے نوجوان کو دیکھ کر میں چونک گیا۔ بھورے بالوں اور بھوری آنکھوں والا یہ پھرتیلا شخص ان ڈرائیوروں میں موجود تھا جو چند روز پہلے امین فورمین کے کیبن سے باہر بیٹھے

"ٹیکسی دور" کی اور دنیا جہان کی باتیں کر رہے تھے۔ میرے ذہن نے پکار کر کہا کہ یہی بھگتو سنگھ ہے۔ اگلے لمحے میں میرا یہ خیال درست ثابت ہوا۔ میں نے جب سرکاری ریوالور برآمد کیا اور پکار کر "ہینڈز اپ" کا حکم دیا تو سب سے پہلے بھورے نوجوان نے حرکت کی۔ سیکنڈ کا دسواں حصہ ضائع کیے بغیر وہ تیزی سے میری طرف آیا اور دھکا دیتا ہوا خاردار تاروں کی طرف بھاگا۔ اس کا دھکا مجھے ٹھیک طرح نہیں لگا۔ میں لڑکھڑا کر سنبھل گیا۔ "خبردار" میں نے چلا کر کہا۔ اُس نے سنی اَن سنی کی اور دوڑتا چلا گیا۔ میرا اے ایس آئی باجوہ اُس کے پیچھے لپکا تھا۔ وہ اُسے یقیناً پکڑ لیتا لیکن میں نے کوئی خطرہ مول لینا مناسب نہیں سمجھا۔ اگر یہی بھگتو تھا تو اُس سے ہاتھا پائی نقصان دہ ثابت ہوسکتی تھی۔ جو شخص مکا مار کر ایک شخص کی جان لے سکتا ہے۔ وہ اپنی جان خطرے میں دیکھ کر کچھ بھی کرسکتا تھا۔ میں نے ٹریننگ کے مطابق دایاں گھٹنا زمین پر ٹیکا۔ اطمینان سے ریوالور کو دونوں ہاتھوں میں سیدھا کیا اور رفتار سے بھاگنے والے کی ٹانگوں کا نشانہ لے کر یکے بعد دیگرے دو فائر کیے۔ دھماکوں سے رات کا سناٹا لرز اٹھا۔ پوری رفتار سے بھاگتے بھاگتے نوجوان اوندھے منہ گرا اور پختہ زمین پر دور تک لڑھکتا چلا گیا۔ اُس کے باقی ساتھیوں میں سے بھی ایک نے بھاگنے کی کوشش کی لیکن سپاہیوں نے لپک کر اُسے دبوچ لیا اور تلاشی لے کر اُس کے لباس سے ایک دیسی پستول برآمد ہوا۔

گرفتار ہونے والوں میں بھوری آنکھوں والا نوجوان بھگتو سنگھ ہی تھا۔ اُس کے ساتھ ساتھ امین فورمین اور دونوں چوکیدار بھی حوالات میں پہنچ گئے۔ ورکشاپ میں کھڑی محکمہ جنگلات کی گاڑیوں کا معائنہ کیا گیا تو سب کی آنکھیں کھل گئیں۔ ان میں سے بیشتر گاڑیوں کے قیمتی پُرزے غائب ہوچکے تھے۔ ان کے علاوہ بھی کئی گاڑیوں اور چیسز کے پُرزہ جات پر ہاتھ صاف کیا گیا تھا۔ حوالات میں ملزمان سے تفتیش کا آغاز ہوا۔ بھگتو سنگھ خاصا سخت جان تھا لیکن جب تھرڈ ڈگری سے واسطہ پڑا تو اُس نے سب کچھ قبول کرلیا۔ اُس نے تسلیم کیا کہ استاد ملتانی یعنی امین فورمین کو اس غیر قانونی کام پر مجبور کرتا رہا ہے......اب سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ امین فورمین مجبور کیوں ہوا؟ سیدھا سادا جواب یہ تھا کہ بھگتو سنگھ کے پاس امین فورمین کی کوئی کمزوری تھی۔ اس "کمزوری" کی شہ پر بھگتو سنگھ نے اسے بلیک میل کیا اور وہ بلیک میل ہوگیا۔ معمولی رقم کے بدلے میں اُس نے اپنی ملازمت، نیک نامی، عزت، آزادی سب کچھ داؤ پر لگا دیا۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ وہ کمزوری کیا تھی۔ بھگتو سنگھ نے پہلے تو اس سلسلے میں زبان بالکل بند رکھی لیکن جب اسے تھرڈ ڈگری سے چھٹکارے کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو ایک روز اس خبیث نے سب کچھ بک دیا۔ اس نے جو کچھ بتایا وہ اتنا سنسنی خیز تھا کہ مجھے اپنے

کانوں پر یقین نہیں آیا۔ اُس نے انکشاف کیا کہ راپور کا ڈاکٹر گلزار اچھو کے ہاتھوں نہیں امین فورمین کے ہاتھوں قتل ہوا تھا۔ تفصیل بتاتے ہوئے اُس نے کہا کہ اشرف عرف اچھو ڈاکٹر کو شمشان گھاٹ میں مار پیٹ کر چھوڑ گیا تھا۔ بعد میں امین فورمین وہاں پہنچا اور اُس نے ایک ٹائی راڈ کی پے در پے ضربوں سے نیم بے ہوش ڈاکٹر کا سر توڑ دیا۔

میں نے بھگتو سنگھ سے پوچھا۔ "تمہیں اس واقعے کا کیسے علم ہے؟"

جواب میں اُس نے اپنے گنوار لہجے میں کہا۔ "میں ہی وہ ٹیکسی ڈرائیور ہوں جس نے اچھو کے ساتھ مل کر ڈاکٹر گلزار کو دواخانے سے اٹھایا تھا اور شمشان گھاٹ میں اُس کی ٹھکائی کی تھی۔ بعد میں مَیں نے امین فورمین کو جا کر بتا دیا کہ ڈاکٹر گلزار شمشان گھاٹ میں پڑا ہے۔ امین فورمین اپنی موٹر سائیکل پر بیٹھ کر شمشان گھاٹ پہنچا اور ڈاکٹر کے سانس پورے کر دیئے۔"

"لیکن امین کو ایسا کرنے کی کیا ضرورت تھی؟" میں نے پوچھا۔

"وہ......نوری سے شادی کرنا چاہتا تھا۔" بھگتو نے ایک اور انکشاف کیا میں چکرا کر رہ گیا۔ ڈاکٹر گلزار کے قتل کے ڈانڈے کہاں سے کہاں جا ملے تھے۔ میں نے بھگتو سنگھ سے چار گھنٹے تک مغز کھپائی کی۔ راپور تھانے کے اس یخ بستہ حوالات میں "پرالی" پر آمنے سامنے بیٹھ کر میں نے بھگتو سنگھ سے جو کچھ معلوم کیا اس کا خلاصہ اس طرح ہے۔

بھگتو سنگھ اچھو کے علاوہ امین فورمین کا بھی یار بیلی تھا۔ اچھو کے ساتھ مل کر بھگتو سنگھ نے ڈاکٹر گلزار کو کلینک سے اٹھایا۔ پھر اچھو نے اُسے مار پیٹ کر شمشان گھاٹ میں چھوڑ دیا۔ اچھو اور بھگتو سنگھ نے نیم بے ہوش ڈاکٹر گلزار پر تھوکا اور ٹیکسی پر بیٹھ کر شہر روانہ ہوگئے۔ یہاں ایک بس اڈے پر اچھو ٹیکسی سے اُتر گیا۔ اچھو کے ٹیکسی سے اترتے ہی بھگتو سنگھ نے سیدھا امین فورمین کے گھر کا رخ کیا۔ اُس نے امین فورمین کو بتایا کہ ڈاکٹر گلزار......اچھو کے ہاتھوں مار کھا کر کالے شمشان گھاٹ میں بے ہوش پڑا ہے۔ یہ اطلاع سن کر امین فورمین کی آنکھیں چمک اٹھیں......یہ اس کے لیے بڑا سنہری موقع تھا۔ امین نے ایک عرصے سے نوری پر آنکھ رکھی ہوئی تھی......دوسرے لفظوں میں نوری کو حاصل کرنے کی کشمکش صرف اچھو اور ڈاکٹر گلزار میں ہی نہیں تھی، امین فورمین بھی اُس کے امیدواروں میں شامل تھا۔ یہ اور بات ہے کہ اس کی "امیدواری" ڈھکی چھپی تھی اور گاؤں میں کسی کو معلوم نہیں تھا کہ امین نوری پر کتنی لمبی لمبی رالیں ٹپکاتا ہے۔ وہ نوری کے جوبن کا شیدائی تھا اور اُسے دیکھ کر چپکے چپکے دانت کچکچاتا تھا۔ تاہم اُسے معلوم تھا کہ ڈاکٹر گلزار اور اچھو جیسے نوجوانوں کے ہوتے ہوئے وہ کسی گنتی میں نہیں

آتا لہٰذا خاموش رہنا ہی وہ اپنے لیے بہتر سمجھتا تھا۔ اُس کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ حالات پلٹا کھائیں گے اور ''قدرت'' یوں اس پر مہربان ہو جائے گی۔ بھگتو سنگھ کی زبانی ڈاکٹر گلزار کے زخمی ہونے کی خبر سن کر امین فورمین نے فوراً شیطانی منصوبہ بنالیا اور بھگتو سنگھ کو اپنے ساتھ شمشان گھاٹ چلنے کو کہا۔ معمولی پس وپیش کے بعد بھگتو سنگھ تیار ہو گیا۔ برستی بارش میں دونوں موٹر سائیکل پر سوار کالے شمشان گھاٹ پہنچے۔ امین کے پاس ٹائی راڈ کا ایک ٹکڑا تھا۔ موٹر سائیکل گھاٹ سے باہر ہی روک دی گئی۔ بھگتو سنگھ موٹر سائیکل کے پاس کھڑا رہا تھا جب کہ امین اندر گیا اور اس نے زخمی گلزار کا کام تمام کر ڈالا۔

واقعات کی ترتیب ایسی تھی کہ اس قتل کا الزام فوراً اچھو پر آ گیا۔ وہ جان بچا کر مفرور ہو گیا اور ڈاکٹر گلزار جوانی کی موت مرکر قبر میں اُتر گیا۔ امین فورمین کی تو جیسے لاٹری نکل آئی تھی۔ نوری کے باغِ جوانی تک اس کا راستہ صاف تھا۔ کسی کے خواب وخیال میں بھی نہیں تھا کہ یہ راستہ صاف ''کیا گیا'' ہے۔ نوری کے والدین جلد از جلد بیٹی کے بوجھ سے چھٹکارا چاہتے تھے۔ انہیں فوری رشتہ درکار تھا چاہے کیسا بھی ہو۔ امین فورمین نے اپنی بات نوری کے والد مہتا تک پہنچائی اور یوں...... وہ پکی عمر کا کھردرا سا شخص نرم ونازک نوری کا مالک بن گیا۔

دوسری طرف ''مکافات'' کا قانون بھی حرکت میں آ چکا تھا۔ نوری کے حسن سے سیراب ہونے کی قیمت امین کو یہ چکانا پڑی کہ وہ بھگتو سنگھ کے ہاتھوں میں کھلونا بن گیا۔ بھگتو سنگھ اتنا سیدھا سادا نہیں تھا جتنا نظر آتا تھا۔ اُس خاموش طبع ڈرائیور کے اندر ایک گھاگ بدمعاش چھپا ہوا تھا۔ اُس نے حالات کی کروٹ سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کرلیا۔ امین کا راز اُس کی مٹھی میں تھا۔ اُس نے امین کو بلیک میل کرنا شروع کر دیا۔ ایک عرصے سے اُس کی نگاہ ورکشاپ میں کھڑی سرکاری گاڑیوں پر تھی۔ وہ ایک مرتبہ پہلے بھی اپنا منصوبہ امین فورمین کے سامنے پیش کر چکا تھا لیکن اُس وقت امین نے اُسے سختی سے جھڑک دیا تھا۔ وہ جانتا تھا یہ اُس کے لیے سراسر گھاٹے کا سودا ہے۔ بدنامی اور مصیبت کے سوا اُسے اس کام میں اور کچھ نہیں ملے گا لیکن اب اُس کے لیے انکار ممکن نہیں تھا۔ بھگتو سنگھ اگر اپنی زبان کھول دیتا تو وہ ڈاکٹر کے قتل کے الزام میں پھانسی کے تختے پر پہنچ سکتا تھا۔ لہٰذا اُسے ایک ایسی راہ پر چلنا پڑا جس پر وہ ہرگز چلنا نہیں چاہتا تھا۔

امین فورمین بظاہر سیدھا سادا سا شہری نظر آتا تھا لیکن حوالات میں وہ بھگتو سنگھ سے بھی زیادہ ڈھیٹ اور سخت جان ثابت ہوا۔ اُس نے اقبال جرم نہیں کیا۔ مگر اس سے کوئی فرق

پڑنے والا نہیں تھا۔ اُس کے خلاف زیر دفعہ 302 چالان مکمل کرنے کے لیے مجھے کافی ثبوت مل چکے تھے۔ ریمانڈ ختم ہوتے ہی میں نے بھگتو اور امین فورمین کو جوڈیشنل ریمانڈ پر جیل بھیج دیا۔

خاوند کی گرفتاری کے بعد نوری امرتسر سے واپس ''راپور'' آ چکی تھی۔ اسے جیسے کسی پنجرے سے رہائی ملی تھی۔ بلال شاہ بدستور اُن کے گھر آتا جاتا تھا۔ اپنی ''منہ بولی بہن'' سے اُسے تمام حالات کا پتہ چلتا رہتا تھا۔ ایک روز بلال شاہ تھانے آیا تو اُس کی گول مٹول آنکھوں میں کسی اہم اطلاع کی چمک تھی۔ میں نے اُس کا موڈ دیکھتے ہوئے فوراً ملائی والی چائے اور برفی منگوائی۔ نہ بھی منگواتا تو آخر منگوائی تھی اور نخروں میں جو وقت ضائع ہوتا وہ علیحدہ تھا۔

برفی اور چائے کو اپنے منہ میں مکس کرتے ہوئے بلال شاہ نے دبی آواز میں کہا۔ ''خان صاحب کل گاؤں میں ایک بڑا اہم واقعہ ہو گیا ہے۔ آپ کو پتہ ہی نہیں۔''

''کیسا واقعہ؟'' میں نے پوچھا۔

''کل گاؤں میں ایک لڑکی نے خودکشی کی کوشش کی ہے۔ اور پتہ ہے کون ہے وہ لڑکی؟ نوری......'' اُس نے اپنے سوال کا خود ہی جواب دیا۔ میں حیرت کے عالم میں اُس کی طرف دیکھنے لگا۔ اُس نے میری حیرت دیکھ کر برفی کی دو ڈلیاں اکٹھی منہ میں رکھ لیں اور چائے کی چھوٹی سی سُرکی لے کر بولا۔ ''گھر والوں کے علاوہ کسی کو اس بات کی کانوں کان خبر نہیں۔ کل شام نوری نے نیلا تھوتھا کھالیا تھا۔ وہ تو اس کی ماں کو بروقت پتہ چل گیا۔ اس نے مہتے کے ہاتھ فوراً مجھے بلایا۔ ہم نے نمک کھلا کھلا کر پہلے نوری کو الٹیاں کروائیں پھر میں سائیکل پکڑ کر ماچھی پور چلا گیا۔ وہاں ''رکھا'' نام کا بڑا سیانا حکیم ہے۔ اس سے دوا لے کر میں رات بارہ بجے واپس آیا۔ صبح تک دوا کھلاتے رہے۔ اب جا کر اُس کی طبیعت بحال ہوئی ہے......''

بلال شاہ کی اطلاع حیران کن تھی۔ میں نے پوچھا۔ ''تمہارے علاوہ اور کس کس کو خبر ہے؟''

وہ بولا۔ ''مہتے کو، اُس کی بیوی کو، نوری کی ایک بڑی بہن کو اور نوری کی سہیلی گلابو کو۔ یہ گلابو وہی ہے جو نوری کی رخصتی پر بے ہوش ہو گئی تھی اور اُسے ہسپتال لے جانا پڑا تھا۔ بڑا پیار ہے اُسے نوری سے۔ دو جسم ایک جان کی طرح ہیں دونوں...... گلابو سے رات میری بات ہوئی ہے۔ اُس نے مجھے کافی کچھ بتایا ہے نوری کے بارے میں......''

''مثلاً؟'' میں نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

چائے کا آخری گھونٹ لے کر بلال شاہ نے منہ سے چپ چپ کی آواز نکالی اور
زارسی صورت بنا کر بولا۔ ''منہ میں میٹھا ہی میٹھا ہو گیا ہے۔ چائے بھی گڑ کی طرح میٹھی
برفی بھی میٹھی شہد۔''

میں نے اُس کی بات سمجھتے ہوئے سنتری سے کہا کہ وہ خیر دین حلوائی سے ایک پا
گرم پکوڑے اور کچھ نمک پارے لے آئے...... میری بات سن کر بلال شاہ کے چہرے
رونق سی آ گئی۔ اس نے سنتری کو پکار کر کہا۔ ''پکوڑے لانے ہیں تو ساتھ تھوڑی سی لال
لے آنا۔'' چٹنی کا ذکر کرتے ہوئے اس نے بمشکل اپنی رال کو گرنے سے روکا۔

میں نے کہا۔ ''ہاں...... تو تم گلابو کا ذکر کر رہے تھے۔''

اُس نے آنکھیں گھما کر خود کو پھر گلابو کے ''ذکر'' پر پہنچایا اور بولا۔ ''جی ہاں......
جو ہے ناں سب کچھ جانتی ہے نوری کے بارے میں۔ میں نے رات اُس سے پوچھا کہ
نے یہ کام کیوں کیا ہے۔ وہ کہنے لگی کہ بڑی دکھی ہے وہ...... جینا اُس کے لیے عذاب ہ
ہے۔ نہ گھر میں سکھ ہے نہ باہر۔ اٹھتے بیٹھتے موت کی دعائیں مانگتی ہے۔ کہتی ہے میں ہوں
بدنصیب جس پر میرا سایہ پڑے گا اپنی قسمت کو روئے گا۔''

منہ میں انگلی گھما کر بلال شاہ نے برفی کے ریزے گالوں کے اندر سے نکالے اور ان
چباتے ہوئے بولا۔ ''گلابو سے مجھے یہ خاص بات بھی معلوم ہوئی ہے کہ نوری بہت پہلے
اچھو کو پسند کرتی ہے۔ وہ یہ بھی جانتی ہے کہ اچھو بھی اُسے چاہتا تھا لیکن اُن دونوں نے
ایک دوسرے کے سامنے یہ بات نہیں کہی...... اور پھر ڈاکٹر گلزار اُن کے درمیان کود پڑا۔
اپنی غلطی پر بے حد پچھتاتی ہے۔ وہ سمجھتی ہے کہ اُس نے اچھو کے ساتھ بے حد زیادتی ک
اور اس زیادتی کی سزا میں اُسے عمر بھر رونا پڑے گا۔''

میں دھیان سے بلال شاہ کی باتیں سنتا رہا۔ ان باتوں سے مجھے اندازہ ہوا کہ نو
طرف سے خودکشی کی یہ کوشش آخری نہیں ہے۔ وہ زندگی سے بے زار ہے اور کئی طرح
پچھتاوے اُسے گھیرے ہوئے ہیں۔ وہ جلد یا بدیر پھر موت کو گلے لگانے کی کوشش کر
اور ضروری نہیں کہ اس دفعہ بھی ناکام ہو۔ میں سمجھتا ہوں کہ کسی خودکشی کرنے والے کی جا
لینا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اصل کام اُن حالات کو بدلنا ہوتا ہے جن میں وہ شخص اس حرا
مجبور ہوا۔ میرے دل نے گواہی دی کہ ان نازک حالات میں اگر کہیں سے اچھو
آ جائے تو نوری کی ڈانواں ڈول زندگی کو سہارا مل سکتا ہے...... بلکہ خود اچھو بھی تباہ ہو
بچ سکتا ہے، لیکن مسئلہ یہ تھا کہ اچھو کو کہاں ڈھونڈا جائے۔ ڈاکٹر گلزار کو قتل ہوئے آٹھ

ہو چکے تھے۔ اس دوران میں نے اچھو کا کھوج لگانے میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی تھی۔ اچھو
کے اب تک واپس نہ آنے کی ایک وجہ اور بھی ہو سکتی تھی۔ اُن دنوں جرائم کی خبریں اخباروں
میں ایسے زور و شور کے ساتھ نہیں چھپتی تھیں اور وہ تو پھر ایک دیہی علاقہ تھا۔ ڈاکٹر گلزار کا اصل
قاتل گرفتار ہو چکا تھا لیکن اس کی اطلاع نہ تو اخباروں میں آئی تھی اور نہ امرتسر میں اس کا چرچا
ہوا تھا۔ صرف چند قریبی دیہات میں لوگوں کو معلوم ہوا تھا کہ گلزار کا قاتل پکڑا گیا ہے۔ عین
ممکن تھا کہ اچھو بھی اس اطلاع سے بے خبر ہو۔ کسی طرح اُس تک یہ خبر پہنچ سکتی تو وہ خود کو
گرفتاری کے لیے پیش کر سکتا تھا۔ اب اُس پر صرف ضرب پہنچانے کا الزام تھا اور زیر دفعہ
320 یا 323 تعزیراتِ ہند اُس کو بمشکل ڈیڑھ دو سال قید کی سزا ہوتی۔

میں نے سوچا کہ امین فورمین کی گرفتاری کی زیادہ سے زیادہ مشہوری ہونی چاہیے تا کہ
یہ اطلاع اچھو کے کانوں تک بھی پہنچ سکے۔ اس مقصد سے کسی اخبار کو بھی خبر دی جا سکتی تھی۔
''زمیندار'' اخبار کا مقامی نمائندہ میرا واقف کار تھا۔ میں اُس سے رابطے کا سوچ ہی رہا تھا کہ
ایک نئی بات میرے دماغ میں آئی۔ میں ایک دفعہ پہلے بھی اچھو سے ایسی ہی چال چل چکا
تھا۔ گلزار کی گھوڑی چرا کر اچھو غائب ہو گیا تھا اور میں نے اُسے واپس لانے کے لیے فرضی
ملزم کو حوالات میں بند کر دیا تھا...... یقینی بات تھی کہ اچھو وہ واقعہ بھولا نہیں ہو گا۔ اس طرح اُس
نے اب بھی یہی سمجھنا تھا کہ میں اُسے چکر دے رہا ہوں۔ بڑی مشکل سی سچویشن تھی۔ اچھو کو
غائب ہوئے اب نو مہینے ہونے کو آئے تھے۔ معلوم ہوتا تھا وہ پکا ہی غائب ہو گیا ہے...... اُس
کے حالات افسوس ناک تھے یعنی قاتل نہ ہوتے ہوئے بھی وہ خود کو قاتل سمجھنے پر مجبور تھا اور در
در کے دھکے کھا رہا تھا۔ دوسری طرف نوری کا معاملہ تھا۔ نہ جانے کیوں میری چھٹی حس دعویٰ
کر رہی تھی کہ اگر اچھو راپور واپس نہ آیا اور اُس نے نوری کو سنبھالنے کی کوشش نہ کی تو وہ اپنے
دکھوں کی آگ میں جل کر راکھ ہو جائے گی۔

ایک روز میں اپنی سوچوں میں گم دفتر میں بیٹھا ہوا تھا۔ سامنے اخبار کھلا پڑا تھا۔ ایک
صفحے پر نئے ماڈل کی ایک دیسی کار کی تصویر تھی۔ تصویر دیکھتے ہی اچانک میرا دھیان کسی اور
طرف چلا گیا۔ سوچ کے آسمان پر جیسے بجلی سی لپک گئی۔ میں جلدی سے سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔
جسم میں سنسنی پھیل رہی تھی۔ میں اٹھا اور تیز تیز قدموں سے باہر نکل آیا۔ میرے کانوں میں
وہ گفتگو گونج رہی تھی جو چند ہفتے پہلے میں نے امین فورمین کے کیبن میں بیٹھ کر سنی تھی۔ ٹیکسی
ڈرائیور میری موجودگی سے بے پرواہ کسی ٹیکسی ریس کی باتیں کر رہے تھے۔ اس گفتگو میں پیش
پیش جگتو سنگھ ہی تھا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ ٹیکسی دوڑ کا انتظام کرنے والوں میں وہ بھی شریک

ہے۔

بھگتو سنگھ اُس وقت تھانے میں ہی تھا۔ کچھ پوچھ گچھ کرنے کے لیے میں نے اُسے یہ
سے بلایا ہوا تھا۔ میں لاک اَپ میں پہنچا تو وہ پرالی پر بیٹھا اپنی بھوری ڈاڑھی کھجا رہا تھا۔ میں
نے لاک اپ کا دروازہ کھلوایا اور اس کے سامنے پہنچ گیا۔ وہ حیرت سے میری طرف دیکھنے
لگا۔ میں نے کہا۔

''بھگتو! ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں۔ دیکھ سچ سچ بتانا۔'' بھگتو کی اکڑفوں تقریباً ختم
ہو چکی تھی۔ وہ بھلے مانسوں کی طرح اقرار میں سر ہلانے لگا۔ میں نے کہا ''میری اطلاع کے
مطابق امرتسر کے گردونواح میں کہیں ٹیکسی دوڑ ہونے والی تھی۔ اُس دوڑ کا انتظام کرنے
والوں میں تم بھی شامل تھے۔ کیا یہ بات سچ ہے؟'' بھگتو سنگھ نے پہلے تو انکار کیا لیکن جب
میں نے زور دیا تو مان گیا۔ اس نے تسلیم کیا کہ ایک ایسی دوڑ ہونے والی ہے لیکن کہاں اور
کب ہونے والی ہے یہ اُسے معلوم نہیں۔ میں جانتا تھا اُسے یہ بھی معلوم ہے۔ تھوڑی سی مزید
کوشش کر کے میں نے اُس سے سب کچھ اگلوا لیا۔ یہ ٹیکسی دوڑ ٹھیک ایک ہفتے بعد ہونے والی
تھی۔ امرتسر سے کوئی بیس میل شمال کی طرف ڈیک نالے کے ساتھ ساتھ میلوں تک غیر آباد
زمین پڑی تھی۔ کہیں کہیں چٹیل میدان سے بنے ہوئے تھے۔ اس قسم کی دوڑیں ایسے ہی تھور
زدہ میدانوں میں ہوتی تھیں۔ بھگتو سنگھ نے ایک ''اُجاٹبا'' نامی جگہ کا نام لیا اور بتایا کہ یہ دوڑ
ہفتے یا اتوار کی صبح اُس میدان میں ہوگی۔ بھگتو سنگھ نے یہ انکشاف بھی کیا کہ پچھلے تین سال
سے یہ دوڑ ہر سال یہاں ہوتی ہے۔ دوڑ میں حصہ لینے والی ٹیکسیاں بڑی خاموشی سے یہاں
پہنچتی ہیں۔ انہیں درختوں کے درمیان پارک کر دیا جاتا ہے۔ ڈرائیور شراب پیتے ہیں، دنگا
فساد کرتے ہیں اور رات بھر شرطیں لگتی رہتی ہیں۔ صبح آٹھ بجے دوڑ شروع ہوتی ہے اور دن
گیارہ بجے تک تماشا ختم ہو جاتا ہے۔

نہ جانے کیوں مجھے یقین سا تھا کہ اشرف عرف اچھو اس دوڑ میں حصہ ضرور لے گا۔ یہ
زبردست ٹھرکی تھا ٹیکسی دوڑ کا۔ میں نے شدت سے ہفتے کے دن کا انتظار کیا۔ آخر خدا خدا
کر کے وہ دن پہنچا۔ میں نے ایک ٹیکسی کا انتظام پہلے ہی کر رکھا تھا۔ میں اور اے ایس آئی
باجوہ ڈرائیوروں کے بھیس میں دوڑ کے مقام پر پہنچ گئے۔ یہاں کا نقشہ بعین ویسا ہی تھا جیسا
بھگتو سنگھ نے بتایا تھا۔ ڈیک نالے کے کنارے درختوں کے گھنے جھنڈ میں کم و بیش ا...
ٹیکسیاں موجود تھیں۔ ان میں کئی ٹیکسیوں پر لاہور اور جالندھر وغیرہ کے نمبر تھے۔ کچھ ٹیکسیاں
کابلی پٹھانوں کی تھیں اور خوب سجی ہوئی تھیں۔ بیشتر ڈرائیور نشے میں دُھت تھے اور ...

کر باتیں کر رہے تھے۔ دن چڑھ چکا تھا اور اب جوں جوں ریس کا وقت قریب آ رہا تھا حصہ
لینے والوں میں جوش و خروش بڑھتا جا رہا تھا۔ میں بلال شاہ اور باجوہ ہر چہرے میں اچھو کا چہرہ
تلاش کر رہے تھے...... اسی چکر میں آٹھ بج گئے۔ ریس کا آغاز ہو گیا۔ آٹھ آٹھ کی ٹکڑیوں
میں قریباً دس ریسیں ہونی تھیں۔ تمام ریسوں میں پہلے نمبر پر آنے والوں کی فائنل ریس آخر
میں ہونا تھی۔ ریس جہاں سے شروع ہوتی تھی ایک طویل چکر کاٹ کر وہیں پر ختم ہوتی تھی۔
یہ اندازاً چار میل کا چکر تھا۔

تیسری ریس کی ٹیکسیاں واپس آئیں تو پہلے کی طرح گرد و غبار کے بادل آسمان کو
چھونے لگے۔ سب سے آگے ایک ہلمن گاڑی تھی۔ وہ جیسے ہوا میں اُڑتی چلی آ رہی تھی۔ وہ
بڑے فاصلے سے جیت رہی تھی۔ اُس سے قریب ترین ٹیکسی بھی قریباً ایک فرلانگ پیچھے تھی۔
جب یہ گاڑی میرے پاس سے گزری تو میں اُس میں بیٹھے اچھو کو پہچان گیا۔ اُس نے سکھوں
کی طرح چہرے اور سر کے بال بڑھا رکھے تھے۔ حلیہ بھی سکھوں والا تھا لیکن یہ حلیہ میری
آنکھوں کو دھوکا نہیں دے سکا۔ میرے چہرے پر جوش کی لہر دیکھ کر بلال شاہ اور باجوہ چونک
سے گئے۔ میں نے اشارے سے انہیں بتایا کہ اچھو اُس ٹیکسی میں ہے۔ چند ہی لمحے بعد ٹیکسی
اپنے مقررہ مقام پر رک گئی۔ دروازہ کھلا اور اچھو خوشی سے تمتمایا ہوا باہر نکل آیا۔ دیہاتیوں
کے مخصوص انداز میں اُس نے ایک ٹانگ پر ناچ کر منہ پر بند مٹھی رکھی اور ہونٹوں سے ''بب
بب'' کی فاتحانہ آواز نکالی۔ عین اُس وقت اُس کی نظر میرے اور بلال شاہ پر پڑ گئی۔ ایک دم
اُس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ اُس نے آنکھیں سکیڑ کر غور سے ہمیں دیکھا۔ اُس کے حمایتی
شور کرتے ہوئے اُس کی طرف بڑھ رہے تھے۔ وہ اسے شاباش دینا چاہتے تھے لیکن اُن کی
شاباش وصول کرنے سے پہلے ہی اُس نے دوڑ لگا دی۔ یہ بڑا مضحکہ خیز منظر تھا۔ اُس کے
حمایتیوں کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ ایک دم اچھو کو کیا ہوا ہے۔ بڑھکیں مارتا مارتا وہ اچانک بھاگ
کیوں کھڑا ہے۔ اور وہ بھاگ بھی ایسے رہا تھا جیسے موت کو دیکھ لیا ہو۔ اصیل گھوڑے کی طرح
لمبی ٹانگیں تھیں اُس کی، جسم بھی بھوکے بھیڑیئے جیسا تھا۔ لمحوں میں وہ کہیں سے کہیں پہنچ گیا۔
اس دوران باجوہ ٹیکسی سٹارٹ کر کے پہلا گیئر لگا چکا تھا۔ ہم پھرتی سے ٹیکسی میں سوار ہوئے
اور وہ کمان سے نکلے تیر کی طرح اچھو کے پیچھے گئی۔ دور تک چٹیل میدان تھا۔ چھپنے کے لیے
کوئی جگہ نہیں تھی۔ مجھے امید تھی کہ ہم ایک منٹ کے اندر اندر اُسے جا لیں گے لیکن پھر اچھو
بھاگتے بھاگتے اچانک ڈیک نالے کی طرف مڑ گیا اور کنارے کے گھنے درختوں میں گھس
گیا۔ ان درختوں کے بیچ و بیچ ایک برجی سی بنی ہوئی تھی۔ اُس کے ساتھ ہی ایک بارہ دری

ٹائپ چیز تھی۔ کوئی بہت پرانا مقبرہ تھا۔ قبر کا نام ونشان مٹ چکا تھا۔ اندر کثرت سے جھ
جھنکار اُگا ہوا تھا۔ اچھو تیر کی طرح اس پناہ گاہ میں گھس گیا۔ میں نے ٹیکسی بیس تیس گز
رکوائی اور نیچے اتر آیا۔ بلال شاہ اور باجوہ بھی ساتھ اترے۔ دفعتاً اچھو کی للکارتی ہوئی آو
آئی۔

”نواز خان! میرے ہاتھ میں پستول ہے۔ آگے آیا تو مولا قسم لحاظ نہیں کروں گا۔“
اُس کے ساتھ ہی اُس نے ایک ہوائی فائر کر کے اپنے دعوے کا ثبوت پیش کیا۔

ہم نے درختوں کی آڑ لے لی۔ میں نے پکار کر کہا۔ ”اچھو! خواہ مخواہ خود کو مصیبت میں
نہ ڈال۔ گلزار کا قاتل پکڑا جا چکا ہے...... دیکھ میری بات سن۔ میرا یار ہے تو باہر آ جا۔ میں تجھ
سے وعدہ کرتا ہوں، کوئی آنچ نہیں آئے گی تجھ پر۔“

وہ گرج کر بولا۔ ”لعنت ہے تجھ پر اور تیری یاری پر۔ تُو یار نہیں یار مار ہے۔ یاری کو بیچ
میں نہ لا۔ اگر ہمت ہے تو پکڑ لے مجھے آ کر...... اور دیکھ...... اس بہن کے ویر کو پیچھے ہٹا لے
ورنہ میں پیٹ پھاڑ دوں گا اس کا۔“ اس کا اشارہ بلال کی طرف تھا۔

بلال شاہ برجی میں جھانکنے کے لیے تھوڑا سا آگے چلا گیا تھا۔ میں نے اسے ڈانٹ کر
پیچھے بلا لیا تھا۔ اس دوران ٹیکسی دوڑ کے تماشائیوں میں سے بیشتر لوگ بھاگتے ہوئے موقع پر
پہنچ چکے تھے اور یہاں وہاں درختوں کی آڑ میں کھڑے خوفزدہ نظروں سے یہ منظر دیکھ رہے
تھے۔

میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”اچھو! میں تجھ سے جھوٹ نہیں بول رہا۔ ڈاکٹر کا قاتل
پکڑا گیا ہے۔ میں اُس کا چالان بھی مکمل کر چکا ہوں۔ تُو خود کو خواہ مخواہ مصیبت میں نہ ڈال۔“

وہ تلخ لہجے میں بولا۔ ”میں تیری چالبازی جانتا ہوں نواز خان...... اب دھوکا نہیں
کھاؤں گا۔ اگر ہمت ہے تو آگے آ اور پکڑ مجھے۔“

اُس کا لہجہ بڑا تاؤ دلانے والا تھا۔ وہ گفتگو کے دوران مجھے گالیاں بھی دے رہا تھا جو
میں یہاں تحریر نہیں کر رہا لیکن میں یہ بھی جانتا تھا کہ اس میں قصور میرا ہی ہے۔ میں نے ایک
دفعہ اُس سے جو چال چلی تھی وہ اب میرے سامنے آ رہی تھی۔ باجوہ بہت غصے میں تھا۔
بور کا ریوالور اُس کے ہاتھ میں مچل مچل جا رہا تھا لیکن میں نے اشارے سے اُسے سمجھا دیا
وہ کوئی کارروائی نہیں کرے گا۔ میں نے قمیص اٹھا کر کمر سے ریوالور والی پیٹی کھولی اور بلال
شاہ کو تھما دی۔ یقیناً یہ منظر اچھو بھی دیکھ رہا تھا۔ اس کے بعد میں بڑے اعتماد سے خالی
برجی کی طرف بڑھا۔ مجھے یقیناً تھا کہ اب وہ گولی نہیں چلائے گا...... لیکن وہ بھی ایک خر

نکلا۔ ابھی میں برجی سے آٹھ دس قدم دور تھا کہ دھماکہ ہوا اور گولی میرے دائیں کندھے کو
چھوتی ہوئی گزر گئی۔ مجھے صاف اندازہ ہوا کہ بازو کے گوشت سے ایک بوٹی کٹ کر علیحدہ
ہوگئی ہے۔ طیش سے میرا دماغ بھنا اٹھا۔ آخری چند قدم کا فاصلہ میں نے بھاگ کر طے کیا اور
برجی کے اندر گھس گیا۔ اس دوران ایک اور فائر بھی ہوا تھا لیکن یہ گولی میرے پاؤں کے
درمیان کچی زمین میں گھس گئی تھی۔ برجی میں گھستے ہی میں دیوانہ وار اچھو سے لپٹ گیا۔ اُسے
اپنی جسمانی طاقت اور لڑائی میں مہارت پر بہت مان تھا۔ دوسری طرف میں بھی سخت جھنجھلایا
ہوا تھا۔ پہلے ہی ہلے میں مَیں نے ریوالور اچھو کے ہاتھ سے نکال دیا۔ اگلے ایک منٹ کے
دوران برجی کی مختصر سی جگہ میں میرے اور اچھو کے درمیان سخت مارا ماری ہوئی۔ کئی بار میں
نے اُسے اٹھا کر پٹخا، کئی بار اُس نے مجھے رگیدا۔ میرے کندھے کی طرح اُس کا لمبا چوڑا تھوبڑا
بھی خون سے رنگین ہو گیا۔ وہ ایک زبردست ”لڑاکا“ تھا لیکن میں نے کسی موقعے پر اُسے خود
پر حاوی نہیں ہونے دیا۔ یہاں تک کہ باجوہ نے تین چار تماشائیوں کے ساتھ مل کر اُسے
دبوچ لیا...... ہم اُسے گھسیٹ کر برجی سے باہر لے آئے۔

دو روز بعد بہت مشکل سے اچھو کو اس بات کا یقین آسکا کہ وہ واقعی قتل کے الزام سے
بری ہو چکا ہے اور یقین جب آ گیا تو اُس کی آنکھوں میں آنسو چمک گئے۔ وہ مجھ سے لپٹ
گیا اور اپنے رویے پر شرمندگی کا اظہار کرنے لگا۔ میرے دل میں بھی کوئی میل نہیں تھا۔ وہ
سب کچھ تو وقتی غصے کا نتیجہ تھا۔ یہ بات میں کسی وقت ایک لمحے کے لیے نہیں بھولا تھا کہ اچھو
نے میری جان بچائی تھی۔ ”گلے سے مل گئے تو سارا گلہ جاتا رہا“ کے مصداق تمام تلخی ختم
ہوگئی۔ یہ دفعہ 320 کا کیس تھا لیکن معمولی رعایت کے ساتھ دفعہ 323 یا 334 کے تحت
پرچہ کاٹا جا سکتا تھا۔ میں نہ بھی کاٹتا تو پوچھنے والا کوئی نہیں تھا لیکن میں نے قانونی کارروائی
پوری کی۔ اچھو کو چھ ماہ قید اور پانچ سو روپے جرمانے کی سزا سنائی گئی۔ وہ قید بھگتنے جیل چلا گیا
اسی دوران نوری نے امین فورمین سے طلاق حاصل کر لی...... کچھ عرصہ بعد نوری اور اچھو کی
شادی ہوگئی۔ یہ ایک طویل کہانی کا خوشگوار انجام تھا۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ جوڑے آسمانوں پر
بنتے ہیں۔ نوری اور اچھو کا جوڑا بھی جب بنا تو ایسا بنا کہ لوگ دیکھتے رہ گئے۔ لمبے گھنے بالوں
والی دلکش نوری اور لمبا تڑنگا چوڑے شانوں والا شاندار مرد اچھو۔ انہیں دیکھ کر یوں لگتا تھا کہ
وہ دونوں بنے ہی ایک دوسرے کے لیے ہیں۔ اب تک وہ جس جس کے ساتھ تھے غلط تھے،
انہیں صحیح ساتھ اب ملا ہے اور یہی ان کی منزل ہے جہاں وہ کھڑے ہیں۔ میرے اندازوں
کے عین مطابق اچھو دیکھتے ہی دیکھتے بدمعاشی اور داداگیری کی دلدل سے نکل آیا اور شریفانہ

طور پر رزقِ حلال کے لیے تگ و دو کرنے لگا۔ شادی کے تین چار ماہ بعد اُسے کراچی کی ایک
ٹرانسپورٹ کمپنی میں اچھی نوکری مل گئی اور وہ بیوی کو لے کر وہاں چلا گیا۔ (یہ نوکری پولیس کی
نوکری سے کہیں بہتر تھی لہٰذا میں نے اُسے بھرتی کروانے کا ارادہ بدل دیا) میں نہیں سمجھتا کہ
میں نے اشرف عرف اچھو پر کوئی احسان کیا تھا۔ ہاں اتنا اطمینان ضرور ہے کہ جس شخص نے
ایک کڑے موقع پر میری زندگی بچائی اُس کی اپنی زندگی بربادی کے اندھے کنویں میں گرنے
سے بچ گئی۔

☆======☆======☆

اور وہ بدل گئی

ایک عجیب و غریب میم زادی کی کہانی۔ وہ جو بھی کام کرتی،
عجیب ہی کرتی۔ اس کی زندگی کا مقصد ہی دوسروں کو حیران و ششدر
کرنا تھا۔ وہ انوکھی تھی اور اس کا ہر کام انوکھا تھا...... اور پھر ایک روز وہ
اپنی زندگی کا سب سے انوکھا کام کر گئی۔

اس دلچسپ کیس کا تعلق ڈلہوزی سے ہے۔ ڈلہوزی میں میری رہائش بڑی پُرفضا جگہ پر تھی۔ سڑک سے صرف دس بارہ فٹ نیچے ڈھلوان پر بڑے صاف ستھرے کوارٹر تھے۔ عقب میں وسیع و عریض وادی تھی اور وادی میں بکھرے ہوئے خوبصورت مناظر تھے۔ دائیں طرف گھنے درخت تھے جہاں ایک انگریزی سکول تھا اور سکول کے بچوں کے لیے خوبصورت پارک بنا ہوا تھا۔ بائیں طرف چشمے کا پانی ایک آبشار کی صورت میں نشیب میں گرتا تھا۔ اس آبشار کے گرد لوہے کے سُرخ جنگلے لگے ہوئے تھے۔ سیاح ان جنگلوں کے سہارے جھک کر گھنٹوں آبشار کا نظارہ کرتے تھے۔ کوارٹر کے سامنے سڑک تھی اور اس پر صرف پیدل لوگ ہی آ جا سکتے تھے۔ کوارٹروں کے پچھواڑے وادی کے رخ پر چھوٹے چھوٹے خوبصورت کاٹج بنے ہوئے تھے۔ اکثر کاٹج دو یا تین کمروں پر مشتمل تھے۔ جون جولائی میں ان کا کرایہ 300 روپے ہفتہ تک پہنچ جاتا تھا۔ اُس وقت کا 300 آج کل سات آٹھ ہزار سے کم نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ان کاٹجز میں کھاتے پیتے لوگ ہی قیام کرتے تھے۔

ان کاٹجز میں ایک کاٹج گلزار نامی ایک نوجوان کا تھا۔ گلزار چوڑے چکلے جسم کا مالک ایک ہنس مکھ اور سادہ لڑکا تھا۔ اُس کی کل جائیداد اور پونجی یہی ایک کاٹج تھا جو اُسے اپنے باپ سے ترکے میں ملا تھا۔ سال میں چھ مہینے تو یہ کاٹج دوسرے کاٹجز کی طرح ویران ہی پڑا رہتا تھا۔ اصل سیزن جون جولائی ہی ہوتا تھا جب میدانی علاقوں کی گرمی سے گھبرائے ہوئے عوام و خواص پہاڑی مقامات پر بلہ بولتے تھے اور ہر اچھی بری جگہ کرائے پر چڑھ جاتی تھی۔ ان دنوں گلزار کو بھی معقول آمدنی ہو جاتی تھی اور وہ اپنے اور اہلِ خانہ کے لیے سال بھر کا راشن اکٹھا کر لیتا تھا۔

گلزار کی دو چھوٹی بہنیں تھیں اور ایک بڑا بھائی۔ یہ بھائی بیمار رہتا تھا اور کسی کام کاج

کے قابل نہیں تھا۔ اس طرح آٹھ افراد پر مشتمل کنبے کا سارا بوجھ گلزار کے کندھوں پر تھا۔ اس کے اہل خانہ ست دھارا سے آگے ”جاہو“ نامی ایک چھوٹے سے گاؤں میں رہتے تھے۔

ایک سیزن میں میری والدہ مجھ سے ملنے ڈلہوزی آئیں تو ڈھائی تین ماہ میرے پاس کوارٹر میں رہیں۔ مجھے اپنے ہاتھ کی پکی ہوئی روٹی کھلا کر انہیں بڑی تسلی ہوا کرتی تھی۔ کچھ یہی حال میرا بھی تھا۔ رات کو سوتے وقت اُن کے پاؤں دبا کر جو خوشی ملتی تھی وہ ہر خوشی سے بے نیاز کر دیتی تھی۔ پڑوسی ہونے کے ناطے گلزار بھی اکثر ہمارے گھر آ جایا کرتا تھا۔ میری غیر موجودگی میں وہ ماں جی کو تنہائی کا احساس نہیں ہونے دیتا تھا۔ ماں جی بھی اُس کو بہت پیار کرنے لگی تھیں اور بیٹا کہہ کر بلاتی تھیں۔ ماں جی کے آنے سے پہلے میں گلزار کو پڑوسی سے زیادہ اہمیت نہیں دیا کرتا تھا لیکن وہ ماں جی کو اچھا لگنے لگا تو مجھے بھی لگنے لگا۔ ڈھائی تین ماہ بعد ماں جی تو واپس چلی گئیں لیکن میرے اور گلزار کے درمیان قریبی تعلق قائم کر گئیں۔ گلزار اب اکثر میرے کوارٹر میں آ جاتا تھا اور ہم بے تکلفی سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے تھے۔ گلزار کی سب سے بڑی خوبی اس کی سادگی تھی۔ کوئی لالچ دھوکا فریب اس میں نہیں تھا۔ نہ اُس نے کبھی مجھ سے کسی کی سفارش کی۔ نہ کسی پر دباؤ ڈلوایا اور نہ کوئی اور فائدہ اٹھایا۔ وہ بس کام سے کام رکھنے والا اور اپنے حال پر خوش رہنے والا بندہ تھا۔

مجھے یاد ہے وہ ستمبر اکتوبر کے دن تھے۔ سردی نے اپنے پر پُرزے نکالنے شروع کر دیئے تھے اور خزاں دبے پاؤں سرسبز وادیوں کی طرف بڑھ رہی تھی۔ مجھے محسوس ہوا کہ گلزار چند دنوں سے کچھ اُداس اور اُکھڑا اُکھڑا ہے۔ میں نے اُسے کریدنے کی کوشش کی لیکن وہ حسبِ معمول ہنس کر ٹال گیا۔ میں نے سوچا شاید یہ سیزن ختم ہونے کی اداسی ہے۔ سیاحوں کی میزبانی کرنے والے ایسی اُداسی کا اکثر شکار ہو جاتے ہیں لیکن پھر جلد ہی یہ اُداسی ختم بھی ہو جاتی ہے۔ برف باری کا نظارہ کرنے والے اِکا دُکا سیاح ہل سٹیشن پر آنے لگتے ہیں اور سنسان گلیوں میں زیادہ نہیں تو تھوڑی بہت رونق کا سامان ہو جاتا ہے۔ میں نے بھی گلزار سے زیادہ پوچھ تاچھ مناسب نہیں سمجھی اور اُسے اُس کے حال پر چھوڑ دیا۔

پھر ایسا ہوا کہ دو تین ہفتے گلزار سے ملاقات ہی نہ ہو سکی۔ میں تو مصروف تھا مگر گلزار کو ایسی کیا مصروفیت آن پڑی تھی؟ اُس شریف آدمی نے اپنی صورت تک نہیں دکھائی تھی۔ مجھے وسوسہ ہونے لگا کہ شاید میری کوئی بات اُسے بُری لگ گئی ہے جس کی وجہ سے وہ ناراض ہے۔ ایک روز مقامی چھٹی تھی۔ میں نے ایک سنتری کو گلزار کی طرف بھیجا...... سنتری گلزار کو تو نہیں لایا تاہم گلزار کا ایک قریبی دوست جماعت علی خان اس کے ساتھ چلا آیا۔ جماعت علی

ایک کاٹج کا نگران تھا اور گلزار سے اُس کی خاصی بے تکلفی تھی۔ گلزار کے ساتھ وہ ایک دو دفعہ میرے کوارٹر میں بھی آ چکا تھا۔ اس نے مجھے سلام کیا اور جھجکتا ہوا ایک کرسی پر بیٹھ گیا...... یہ کوارٹر کا صحن تھا اور یہاں بڑی مزیدار دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے سنتری سے کہا کہ وہ گرما گرم قہوہ پلائے۔ سنتری چلا گیا تو میں نے جماعت علی سے پوچھا۔ ''ہاں بھئی...... کدھر ہے وہ تمہارا لنگوٹیا۔ مجھے تو اُس کی شکل بھی بھول گئی ہے۔ کہیں ڈلہوزی تو نہیں چھوڑ گیا۔''

جماعت علی کے چہرے پر پھیکی سی مسکراہٹ ابھری۔ پشتو کے لہجے میں بولا ''خو...... وہ ہے تو ڈلہوزی میں لیکن اُس کا دماغ ڈلہوزی میں نہیں ہے۔ ام کئی دن سے سوچ رہا تھا کہ آپ سے بات کرے لیکن موقع ہی نہیں مل رہا تھا۔ اب آپ کا سنتری گلزار کو ڈھونڈتا ہوا اُدھر چشمے پر آیا تو ام نے بولا چلو آؤ ام تمہارے ساتھ چلتا ہے۔''

''لیکن اُس کو بیماری کیا ہے بھائی...... کچھ پتہ بھی چلے۔''

جماعت خان کے چہرے پر ایک دم سنجیدگی کے سائے گہرے ہو گئے۔ کچھ دیر سر کھجاتا رہا۔ پھر دائیں بائیں دیکھ کر ذرا رازداری سے بولا۔ ''کم بخت خود کو روگ لگا بیٹھا ہے خواہ مخواہ ...... ادھر ایک میم صاحبہ ٹھہرا تھا ناں اُس کے کاٹج میں۔ بس اُسی کا نام لے لے کر آہیں بھرتا ہے۔ کہتا ہے وہ ام کو نہ ملا تو ام مر جائے گا۔''

حیرت سے میری آنکھیں کھل گئیں۔ جماعت خان جس میم صاحبہ کا ذکر کر رہا تھا اُس کا نام جینی تھا اور وہ سچ مچ کی میم تھی۔ بے حد تیز طرار اور چلبلی لڑکی تھی۔ اُسے دیکھ کر ہالی وڈ کی کسی حسین دلکش ساحرہ کا تصور ذہن میں آتا تھا۔ مجھے معلوم ہوا تھا کہ اُس کا والد صنعت کار ہے اور لاہور کے نواح میں پُرزے ڈھالنے کی اُس کی بہت بڑی فیکٹری ہے۔ جینی کے ساتھ اُس کی سہیلی بھی تھی۔ اس کے علاوہ ایک شوفر اور خانساماں بھی تھا۔ جینی اور اُس کی سہیلی کے لیے ایک کاٹج بھی ضرورت سے زیادہ تھا لیکن انہوں نے ایک ساتھ تین کاٹج کرائے پر لیے تھے۔ ایک میں جینی اور اُس کی سہیلی نے قیام کیا تھا۔ دوسرے میں شوفر اور خانساماں قیام فرما ہوتے تھے۔ تیسرا کاٹج اس لیے خالی پڑا تھا کہ کہیں کوئی مہمان نہ آ جائے۔ جینی کی سہیلی پریما گو مقامی تھی لیکن انگریزی لباس پہنتی تھی۔ انگریزی بولتی تھی اور انگریزوں سے بڑھ کر ماڈرن تھی۔ وہ کسی اعلیٰ افسر کی بیٹی تھی۔ یہ دونوں لڑکیاں تقریباً دو مہینے ڈلہوزی میں رہی تھیں اور جتنی دیر رہی تھیں اودھم مچائے رکھا تھا۔ لگتا تھا جیسے انہوں نے قسم کھا رکھی ہے کہ کوئی کام سیدھا کرنا ہی نہیں۔ اُن کے پاس نئے ماڈل کی شاندار گاڑی تھی مگر اس گاڑی پر انہوں نے چھ طرح کے رنگ کر رکھے تھے۔ میں نے اس گاڑی کو ڈلہوزی میں جب بھی دیکھا ایسی جگہ کھڑے دیکھا

جہاں ''نو پارکنگ'' کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ جینی اور پریما کا لباس بھی اپنی مثال آپ ہوتا تھا۔ کبھی دس سال پیچھے کا فیشن کبھی دس سال آگے کا فیشن۔ ایک روز میں نے جینی کو ایسے لباس میں شاپنگ کرتے دیکھا کہ سکتے میں رہ گیا۔ میں ہی کیا جس نے بھی دیکھا ہوگا سانس لینا بھول گیا ہوگا۔ لباس کے نام پر اس نے مشکل سے ڈیڑھ دو گز کپڑا استعمال کیا ہوگا۔ اسکرٹ جسم سے چپکا ہوا تھا اور کولہوں سے نیچے اترتے ہی ختم ہو جاتا تھا۔ یہی حال بازوؤں اور گریبان وغیرہ کا تھا۔ لوگ رُک رُک کر اسے دیکھ رہے تھے۔

میں نے جماعت خان کی زبانی گلزار کے بارے میں سنا تو حیران رہ گیا۔ کہاں وہ اونچی سوسائٹی کی نخرے باز لڑکی کہاں یہ نچلے سے نچلے طبقے کا معمولی سا لڑکا۔ گلزار سے زیادہ آن بان والے تو جینی کے ملازم تھے۔ فوراً میرے ذہن میں آیا کہ گلزار کے ساتھ ضرور کوئی شرارت ہوئی ہے یا پھر وہ بیوقوف خود ہی کسی غلط فہمی کا شکار ہو گیا ہے۔ شکل وصورت سے وہ بڑا رومان پسند نظر آتا تھا۔ خاص طور پر اُس کی سوئی سوئی آنکھیں تو جیسے ہر وقت خواب دیکھتی رہتی تھیں۔ میں نے جماعت خان سے پوچھا۔ ''کیا اُسے پاگل کتے نے کاٹا ہے کہ آہیں بھرتا پھرتا ہے۔ جس لڑکی کا وہ نام لے رہا ہے اُس کے تو ملازم بھی اُس سے کہیں زیادہ حیثیت والے ہیں۔ میرے خیال میں تو وہ میرے تمہارے جیسے بندوں سے بات کرنا بھی گوارا نہ کرتی ہوگی۔''

جماعت خان نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ ''آپ ٹھیک کہتا ہے نواز صاحب۔ وہ امارے تمہارے جیسے بندوں سے بات کرنا بھی گوارا نہیں کرتی...... لیکن...... یہ حرامی گلزار تو اُس کے ساتھ سو چکا ہے۔''

میں سکتے میں رہ گیا۔ جماعت خان کے ہونٹوں سے نکلے ہوئے الفاظ دھماکوں کی طرح میرے کانوں میں گونجنے لگے۔ جماعت خان نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''ام جھوٹ نہیں بولتا نواز صاحب۔ ام کو جھوٹ بولنے کی ضرورت بھی کیا ہے۔ ام نے اب تک کسی کو نہیں بتایا۔ آپ کو بھی صرف اس لیے بتا رہا ہوں کہ آپ اس کا سچا دوست ہے۔ اُس پاگل کو اس مصیبت سے نکالنے کا کوئی چارہ کرے گا۔ ام سولہ آنے سچ کہہ رہا ہے جناب...... آپ کا یہ بات بالکل ٹھیک ہے کہ میم صاحبہ جیسا اعلیٰ لوگ اور ام جیسا گھٹیا لوگ کے درمیان ہزاروں میل کا پاصلہ ہوتا ہے۔ پر یہ پاصلہ مٹ گیا جناب...... اور مٹانے والا خود وہ میم صاحبہ ہے۔ ام کو خبر نہیں اُس نے ایسا کیوں کیا پر اُس نے کیا اور گلزار کو نیم پاگل بنا کر چلا گیا۔''

میں نے اٹھ کر بیرونی دروازہ بند کر دیا اور جماعت خان سے کہا کہ وہ مجھے اس واقعے

کی پوری تفصیل بتائے۔ جماعت خان نے اپنے مخصوص لہجے میں بولنا شروع کیا اور دھیرے دھیرے اس واقعے کے اسرار و رموز سے پردہ ہٹانے لگا۔ اُس نے بتایا کہ یہ ڈیڑھ ماہ پہلے کا واقعہ ہے میم صاحبہ کو ڈلہوزی میں آئے چار ہفتے ہو چکے تھے۔ وہ ہر دوسرے تیسرے دن اپنی سہیلی پریما کے ساتھ گھڑسواری کے لیے نکلتی تھی۔ جینی اُس گھوڑے پر سوار ہوتی تھی جو گلزار کے پاس ہے۔ (گلزار کے پاس دو تین گھوڑے بھی تھے۔ اُن میں سے ایک گھوڑا بڑا شاندار تھا۔ کاٹج میں ٹھہرنے والے لوگ اکثر اُس سے یہ گھوڑا کرائے پر لے لیتے تھے) جینی نے پورے دو ماہ کے لیے اس گھوڑے کا ایڈوانس کرایہ گلزار کو دے رکھا تھا اور اُسے حکم تھا کہ ان دو مہینوں کے دوران گھوڑا ہر وقت تیار رہے گا۔ جینی کے علاوہ کوئی اس پر سوار نہیں ہوگا، خود گلزار بھی نہیں۔ گلزار اس حکم کی پوری پابندی کرتا تھا۔ ہر روز نو بجے کے قریب گھوڑے کو بنا سنوار کر لگام سے تھامتا تھا اور کاٹج میں لے آتا تھا۔ اگر میم صاحبہ نے گھڑسواری کے لیے جانا ہوتا تو شوفر گلزار کو بتا دیتا تھا۔ دوسری صورت میں گلزار اُسے واپس لے جاتا تھا۔ ایک روز گلزار گھوڑا لے کر کاٹج پہنچا تو شوفر اور خانساماں کہیں گئے ہوئے تھے۔ کاٹج میں صرف پریما اور میم صاحبہ تھیں۔ پریما نے گلزار سے کہا کہ وہ لان میں بیٹھ جائے۔ میم صاحبہ ابھی باتھ روم میں ہیں۔ تھوڑی دیر میں نکلیں گی تو بتائیں گی کہ گھوڑا چاہیے یا نہیں۔

گلزار وہیں لان کے ایک گوشے میں گھاس پر بیٹھ گیا۔ گھوڑا اُس نے کاٹج کے گیٹ سے باندھ دیا تھا۔ وہ قریباً ایک گھنٹہ وہاں بیٹھا انتظار کرتا رہا۔ نہ میم صاحبہ کی صورت دکھائی دی نہ اس کی سہیلی کی۔ دوسرے گھوڑے والا بھی کہیں دکھائی نہیں دیا۔ ساڑھے دس پونے گیارہ بجے کے قریب پریما باہر نکلی اور اس نے گلزار سے کہا کہ میم صاحبہ تمہیں اندر بلا رہی ہیں۔ گلزار کا اوپر کا سانس اوپر رہ گیا۔ اُسے اندیشہ ہوا کہ ضرور اُس سے کوئی غلطی ہوگئی ہے۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ اس طرح میم صاحبہ کی موجودگی میں وہ کاٹج کے اندر قدم رکھ رہا تھا۔ دھڑکتے دل اور کانپتی ٹانگوں سے وہ اندر پہنچا اور اس کے ساتھ ہی اس پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹنے شروع ہوگئے۔ وہ جیسے ایک حسین اور عجیب و غریب خواب میں کھو گیا۔ اُس نے کبھی تصور بھی نہ کیا تھا کہ میم صاحبہ اُس سے اس طرح پیش آئیں گی۔ کہاں وہ آسمان کا ستارہ کہاں وہ زمین کا کنکر...... لیکن آسمان کا ستارہ کنکر سے کھیلنے زمین پر آ گیا تھا۔ وہ کھیل تھا خواب تھا یا فریب تھا۔ گلزار کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ خواب گاہ کی نیم تاریک فضا میں وہ تھی اور میم صاحبہ کی مہربان مسکراہٹیں تھیں۔ ایک حسین جسم ریشمی تھان کی طرح گلزار کے سامنے کھلتا چلا گیا۔ یہ خود سپردگی اُسے ہوش و حواس سے بیگانہ نہ کرتی تو کیا اور ہوتا...... اور وہ بیگانہ

ہوتا چلا گیا...... اُس کی کون سی خواہش تھی جو اُس روز پوری نہ ہوئی۔ اُس سے خدمت کرانے والی اُس کی خدمت گار بنی ہوئی تھی۔ دل و جان سے اُس کی میزبانی کر رہی تھی۔ اُس روز گلزار نے اپنی زندگی کا بہترین کھانا کھایا۔ بہترین سگریٹ پیئے۔ بہترین بستر پر لیٹا اور بہترین عورت کی قربت حاصل کی۔ یہاں تک کہ شام کے سات بج گئے۔ میم صاحبہ نے خواب گاہ کی گہری تاریکی میں گلزار کو مخاطب کیا۔ ”آج جو کچھ ہوا اُسے بھول جاؤ...... ہمیشہ کے لیے۔“ اگلے روز جب گلزار پھر نو بجے گھوڑا لے کر آیا تو میم صاحبہ بالکل اجنبی نظر آ رہی تھی۔ نہ وہ مسکراہٹ نہ وہ نرم لہجہ نہ وہ ناز و ادا۔ کچھ بھی کل والا نہیں تھا۔ یوں لگتا تھا کل کا دن میم صاحبہ کی زندگی میں آیا ہی نہیں لیکن یہ دن گلزار کی زندگی میں تو آیا تھا اور ایسے آیا تھا کہ وہ مر کر بھی اُسے بھول نہیں سکتا تھا۔ اس واقعے کے بعد میم صاحبہ تین چار ہفتے مزید ڈلہوزی میں رہیں لیکن پھر کبھی انہوں نے گلزار سے آنکھ ملائی اور نہ مطلب کے علاوہ بات کی۔ یہاں تک کہ اگست کے آخر میں وہ واپس چلی گئیں۔ اب گلزار تھا اور اُس کی بے قراریاں تھیں۔ وہ میم صاحبہ کے عشق میں گرفتار ہو چکا تھا اور رات دن آہیں بھرتا تھا۔

یہ ایک عجیب کہانی تھی جو جماعت خان کی زبانی مجھ تک پہنچی۔ ایسے واقعات عموماً جنوں پریوں کی کہانیوں میں ملتے ہیں اور کسی ہوش مند آدمی کے لیے اُن پر یقین کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ شاید میں بھی اس کہانی کو سنتے ہی جھوٹ اور خرافات قرار دے دیتا لیکن چند ہفتے پہلے ایک بات ایسی ہو چکی تھی جس کے سبب میں ایسا نہیں کر سکا اور جماعت خان کی باتیں سن کر میری رگوں میں سنسناہٹ سی دوڑنے لگی۔ مجھے لگا جیسے یہ واقعہ حقیقت سے زیادہ دور نہیں ہے۔

اب میں آپ کو چند ہفتے پہلے کا وہ واقعہ بتاتا ہوں جو اسی تھانے میں اسی سیزن میں میرے سامنے پیش آیا تھا اور وقت گزرنے کے باوجود میرے ذہن میں پہلے روز کی طرح تازہ تھا۔ قریبی آبادی سے میرا عملہ سیوک سنگھ نامی ایک شخص کو پکڑ کر لایا۔ یہ شخص راج مزدور تھا اور آبادی میں تعمیر ہونے والی ایک عمارت میں مزدوری کر رہا تھا۔ ٹھیکیدار نے سیوک پر الزام لگایا تھا کہ اُس نے اُس کے کوٹ سے سو روپے چوری کیے ہیں۔ یہ کوٹ ٹھیکیدار نے اُتار کر کرسی کی پشت پر ڈالا ہوا تھا۔ میرا اے ایس آئی سیوک کو پکڑ کر تھانے لے آیا۔ سیوک شکل و صورت سے ہی آوارہ سا نظر آتا تھا۔ اُس کی عمر بائیس سال کے لگ بھگ تھی۔ ہاتھ پاؤں مضبوط اور شانے چوڑے تھے۔ اُس کے ساتھیوں نے بتایا کہ یہ ٹھرا پیتا ہے اور جو پیسے باقی بچتے ہیں اُن سے ٹاکی (فلم) دیکھ لیتا ہے۔ میرے اے ایس آئی نے تھانے میں سیوک کو مار لگوائی تو اُس نے سو روپے کے علاوہ چھوٹی موٹی چند اور چوریاں بھی قبول کر لیں۔ جب

حوالاتی اعتراف کرنے لگے تو تفتیش کرنے والے کا حوصلہ بلند ہو جاتا ہے اور اُسے اطمینان ہو جاتا ہے کہ وہ ایک بے گناہ شخص کو مار پیٹ کا نشانہ نہیں بنا رہا۔ وہ زیادہ اعتماد کے ساتھ اُسے پھینٹی لگاتا ہے اور اس پھینٹی کا نتیجہ کبھی کبھی کسی انکشاف کی صورت میں نکل آتا ہے۔ سیوک سنگھ کے معاملے میں بھی یہی کچھ ہوا۔ مار پیٹ سے جان بچانے کے لیے سیوک سنگھ نے انکشاف کیا کہ وہ ایک بہت بڑی میم صاحبہ کے ساتھ اُس کے گھر میں رات گزار چکا ہے اور وہ سب کچھ کر چکا ہے جو ایک جوان مرد اور عورت کرتے ہیں۔ اے ایس آئی نے اُس سے میم صاحبہ کا نام پوچھا تو سیوک نے یہ بتا کر اے ایس آئی کے چھکے چھڑا دیئے کہ وہ ''پال کالونی'' کے آٹھ نمبر گیٹ میں رہتی ہے۔ یہ پتہ لکھ پتی انگریز صنعت کار کی حسین و جمیل بیٹی جین شیلڈ عرف جینی کا تھا۔ اے ایس آئی فوراً میرے پاس آیا اور بتایا کہ سیوک نامی حوالاتی یہ بات کہتا ہے۔ میں نے خود جا کر سیوک سے پوچھ گچھ کی۔ وہ حلفیہ کہہ رہا تھا کہ ایسا ہو چکا ہے۔ اُس نے بتایا کہ ایک روز میں ڈاک خانے کے سامنے بتی والے چوک میں دوسرے مزدوروں کے ساتھ دیہاڑی لگانے کے لیے بیٹھا ہوا تھا۔ سُرخ رنگ کی ایک کار آئی اُس میں دو میم صاحب تھیں۔ انہوں نے مجھے پاس بلایا۔ دیہاڑی طے کی اور کار میں بٹھا کر پال کالونی لے آئیں۔ یہاں کوئی خاص کام نہیں تھا میں سارا دن ایک باغیچے میں مٹی اِدھر سے اُدھر کرتا رہا۔ دوپہر کو مجھے بڑا لمبا چوڑا کھانا بھی کوٹھی والوں نے ہی کھلایا۔ شام کو میں واپس جانے لگا تو انگریز میم صاحبہ مجھے اندر لے گئی۔ اُس کے بعد جو کچھ ہوا وہ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ میں خود کو میم صاحبہ کی جوتیوں میں بیٹھنے کے قابل بھی نہیں سمجھتا تھا پر اُس نے مجھے سر آنکھوں پر بٹھا لیا۔ صبح میں جانے لگا تو اُس نے پچاس روپے میری جیب میں رکھ دیئے اور کہا کہ جو کچھ ہوا اُسے بھول جاؤ اور آئندہ کبھی اس طرف آنے کی کوشش نہ کرنا۔ نہ ہی کسی کو اس واقعے کے بارے میں بتانا...... میں چند دن حیران پریشان پھرتا رہا۔ پھر میں نے اپنے مزدور دوستوں کو اس بارے میں بتا دیا۔ وہ مجھ پر ہنسنے لگے۔ انہوں نے کہا کہ میں نشہ کر کے ساری رات کسی گندی نالی میں پڑا رہا ہوں اور انہیں سبز پری کی کہانی سنا رہا ہوں۔ انہیں میری کسی بات پر یقین نہیں آیا۔ تھک ہار کر میں چپ ہو گیا۔ جن دو مزدور ساتھیوں کو میں نے اپنی کہانی سنائی تھی انہوں نے میری بات پر یقین نہیں کیا لیکن انہوں نے جس تیسرے شخص کو اس بارے میں بتایا وہ بے وقوف قسمت آزمانے کے لیے ''پال کالونی'' کے آٹھ نمبر گیٹ پر چلا گیا۔ وہ وہاں گیٹ کے سامنے ٹہل رہا تھا کہ دو آدمیوں نے اُسے پکڑ لیا اور مار مار کر کپڑے پھاڑ دیئے۔ پھر اُسے سڑک پر مرغا بنا دیا اور چھڑیوں سے پیٹا۔ بعد میں اُس پر کتے چھوڑ دیئے

جو اُسے پال کالونی سے دو فرلانگ دور چھوڑ کر آئے۔

سیوک سنگھ کا وہ بیان آج دو تین مہینے بعد حرف بحرف میرے کانوں میں گونج رہا تھا۔ اب اس بیان پر یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ یہ بات اب ثابت ہو رہی تھی کہ ایک مہینہ پہلے گلزار کے خوبصورت کاٹج میں کچھ ''بدصورت'' کام ہوتے رہے ہیں۔ مزدور سیوک سنگھ ان دنوں جوڈیشل ریمانڈ پر جیل میں تھا اور مجھے تسلی تھی کہ ضرورت پڑی تو میں اُس سے تفصیلی بیان لے سکوں گا۔

☆======☆======☆

بڑے لوگوں کی بڑی غلطیاں ہوتی ہیں اور وہ چھپ جاتی ہیں۔ چھوٹے لوگ اگر چھوٹی سی غلطی کرتے ہیں تو وہ بھی چھپ نہیں سکتی۔ میم صاحبہ نے گلزار کے کاٹج میں جو ''کارنامے'' دکھائے وہ معمولی نہیں تھے لیکن نہ تو اس پر پکڑ ہوئی اور نہ کسی نے اس بات کو اچھالا۔ کسی اور کی بات تو رہی ایک طرف خود میں نے اس معاملے کو دبانے کی کوشش کی۔ سب سے پہلے جب سیوک سنگھ نے میم کے بارے میں بیان دیا تو میں نے اُسے سختی سے ڈانٹ دیا تھا کہ وہ اپنی اس بکواس کو اپنے تک رکھے اور کسی کے سامنے زبان نہ کھولے۔ جینی کوئی معمولی لڑکی نہیں تھی۔ اُس نے جو کچھ کیا تھا بغیر کوئی ثبوت چھوڑے کیا تھا۔ اب اگر کوئی اُس پر الزام لگاتا تو یہ سمجھا جاتا کہ وہ اُسے بدنام کر رہا ہے۔ اور ایک بارسوخ انگریز کی بیٹی کو بدنام کرنا کوئی معمولی ''جرم'' نہیں تھا۔ میں تو رہا ایک طرف اس جرم میں ہمارے ایس پی صاحب تک کی پیٹی اُتر سکتی تھی...... سیوک کے بعد گلزار کے ساتھ بھی ایسا ہی واقعہ پیش آیا تھا۔ میں نے گلزار کو اپنے کوارٹر میں بلایا اور دو ڈھائی گھنٹے لگا کر اطمینان سے اُسے سمجھایا کہ جو کچھ ہو گیا ہے وہ اب اُسے بھول جائے۔ یہ ایک بڑا خطرناک معاملہ ہے اور جہاں رک گیا ہے اُسے وہیں رک جانا چاہیے۔ میں نے اُس سے یہ بھی کہا کہ وہ بھول کر بھی اس واقعے کا ذکر کسی اور سے نہ کرے۔

گلزار نے مجھے جو جواب دیا وہ بڑا بیوقوفی کا تھا۔ کہنے لگا۔ ''لالہ جی! میں یہ نہیں کہتا کہ میم صاحبہ پاک صاف ہے اور مجھ سے پہلے وہ کسی اور سے نہیں ملی لیکن ایک بات کا مجھے یقین ہے۔ اُس نے مجھے پسند کیا ہے اور یہاں سے جا کر وہ دن رات مجھے یاد کرتی ہو گی۔'' (وہ مجھے لالہ کہتا تھا)

میرا جی چاہا کہ جوتا اتار کر گلزار کے سر پر ماروں تا کہ اُس کے دماغ سے عشق کے کیڑے جھڑیں۔ وہ خود کو پرلے درجے کا چغد ثابت کر رہا تھا۔ اُس کا رویہ اُس نوخیز لڑکے جیسا تھا جو پہلی بار کسی طوائف کے پاس جاتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اب یہ طوائف اپنا کاروبار بند

کر کے بیٹھ جائے گی اور ساری عمر اُس کی راہ تکتی رہے گی...... میں نے گلزار کو سمجھانے کی کوشش کی۔ وہ ''ہوں ہاں'' میں سر ہلاتا رہا مگر کوئی بات بھی اُس کے دل پر اثر نہیں کر رہی تھی...... میں نے اندازہ لگایا کہ میم صاحبہ اس کی زندگی میں آنے والی پہلی عورت ہے اور اُس سے مل کر گلزار نے جو انوکھا تجربہ حاصل کیا ہے وہ روگ کی طرح اُس کے ذہن سے چمٹ گیا ہے۔ سب کچھ جانتے بوجھتے بھی وہ خیال کر رہا تھا کہ میم صاحبہ اُس سے خاص الخاص انداز میں ملی ہے اور کبھی اُسے بھول نہیں پائے گی۔ اُس نے بڑے فخر سے مجھے بتایا کہ برف باری کے سیزن میں میم صاحبہ پھر یہاں آ رہی ہے اور اُس نے وعدہ کیا ہے کہ وہ میرے ہی کاٹیج میں ٹھہرے گی۔

دن گزرتے رہے۔ اکتوبر کا سارا مہینہ سرد اور خشک ہوائیں چلتی رہیں۔ نومبر میں خنکی کچھ اور بڑھ گئی۔ درختوں کے پتے زرد ہو کر گرنے لگے۔ خزاں جو دبے پاؤں ان حسین چوٹیوں کی طرف بڑھ رہی تھی۔ ایک دم جست لگا کر نشیب و فراز پر چھا گئی۔ نومبر کے ختم ہوتے ہی برف باری کے آثار نمودار ہونے لگے۔ دسمبر کے پہلے ہفتے میں شدید برف باری ہوئی اور ''ڈلہوزی'' نے برف کا خوبصورت لباس پہن لیا۔ اس لباس کو دیکھنے کے لیے میدانی علاقوں سے لوگ ٹولیوں کی صورت میں یہاں پہنچنے لگے۔ اِکا دُکا ہوٹل کھل گئے اور گلیوں بازاروں کی ویرانی دور ہونے لگی۔ گلزار بڑی شدت سے میم صاحبہ کا انتظار کر رہا تھا۔ کچھ عجیب سی حالت ہو چکی تھی اُس کی...... ہر وقت کھویا کھویا رہتا۔ گھنٹوں چشمے کے کنارے خاموش بیٹھا رہتا۔ کبھی گھوڑے پر بیٹھ کر وادی میں نکل جاتا اور دو تین روز بعد لوٹتا۔ میم صاحبہ نے اُس سے دسمبر کے تیسرے ہفتے میں آنے کا وعدہ کیا تھا۔ جوں جوں دسمبر کا تیسرا ہفتہ نزدیک آ رہا تھا اُس کی بے قراری بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ جب بھی مجھ سے ملتا سب سے پہلے تاریخ پوچھتا کہ لاہور میں موسم کیسا ہوگا۔ بارشوں کی وجہ سے راستے خراب تو نہیں ہو گئے ہوں گے۔ وغیرہ وغیرہ۔ صاف طور پر پتہ چلتا تھا کہ وہ میم صاحبہ کے انتظار کی ایک ایک گھڑی گن گن کر گزار رہا ہے...... مگر اب زبانی طور پر وہ اس کا اقرار نہیں کرتا تھا۔ کم از کم مجھ پر یہی ظاہر کر رہا تھا کہ میم صاحبہ کے متعلق اُس نے سوچنا چھوڑ دیا ہے۔ مجھ سے اُس نے یہ بھی کہا تھا کہ اپنی ماں کے کہنے پر عمل کرتے ہوئے وہ اس ماہ اپنی منگنی بھی کرا لے گا۔ اُس کا رشتہ اپنی ہی برادری میں ایک قبول صورت لڑکی سے ہو رہا تھا۔

دسمبر کا تیسرا ہفتہ گزرا اور چوتھا ہفتہ بھی گزر گیا لیکن میم صاحبہ نہیں آئی۔ گلزار کی حالت قابلِ رحم تھی۔ وہ ظاہر کچھ نہیں کرتا تھا لیکن ایسی ''بیماریاں'' چھپی کب رہتی ہیں۔ اُس کا

پتا چھوٹا ہوا تھا۔ رنگ زرد ہو چکا تھا اور رت جگے سے آنکھیں دھندلائی رہتی تھیں۔ ہر روز علی الصبح وہ اپنے ہاتھوں سے کاٹیج کی جھاڑ پونچھ کرتا، جھاڑو دیتا، گراؤنڈ میں پانی وغیرہ لگاتا۔ پھر گھوڑے کے کھانے دانے اور مالش سے فارغ ہو کر چشمے کے کنارے جا بیٹھتا اور اپنی نگاہیں دور نیچے وادی میں بل کھاتی ہوئی سیاہ سڑک پر لگا دیتا...... یہاں تک کہ شام ہو جاتی۔

یہ جنوری کی دو یا تین تاریخ کی بات ہے۔ چھٹی کا دن تھا۔ میں اپنے کوارٹر کے صحن میں سورج اور بادلوں کی آنکھ مچولی دیکھ رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میرے ملازم نے دروازہ کھولا۔ سرگودھے سے آئے ہوئے ایک پارسی ڈاکٹر صاحب مجھ سے ملنا چاہتے تھے۔ ساتھ میں ان کے بیوی بچے بھی تھے۔ میں نے ذہن پر زور دیا تو اُن کی صورت یاد آ گئی۔ وہ ڈیڑھ سال پہلے گرمیوں کے سیزن میں یہاں چند روز قیام کر چکے تھے۔ ''یہاں'' سے میری مراد گلزار کا کاٹیج ہے۔ اس قیام کے دوران مجھ سے اُن کی تھوڑی سی علیک سلیک ہو گئی تھی۔ میں نے ڈاکٹر صاحب کو اندر بلا لیا۔ انہوں نے اپنا مسئلہ بیان کرتے ہوئے کہا کہ اُن کی بیوی بچے ایک بار گلزار کے کاٹیج میں رہ چکے ہیں اب وہ ضد کر رہے ہیں کہ گلزار کے کاٹیج میں ہی رہیں گے۔ دوسری طرف گلزار کاٹیج خالی ہونے کے باوجود انہیں دینے پر رضامند نہیں ہے۔

میں نے گلزار کو بلایا۔ وہ کچھ برہم دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے اُسے ایک طرف لے جا کر کہا۔ ''کیا بات ہے بھئی۔ کیوں انکار کر رہے ہو ڈاکٹر صاحب کو؟''

وہ بولا۔ ''لالہ! تم دیکھتے نہیں ہو۔ چھ بچے ہیں ان کے ساتھ۔ بچوں والی فیملی تو کباڑہ کر دیتی ہے ہر چیز کا۔''

میں نے کہا۔ ''بھلے مانس، آدھا سیزن گزر گیا ہے۔ باقی جو آدھا رہ گیا ہے وہ بھی خالی گزر گیا تو کیا کرو گے۔ کسٹمر تو کہیں نظر نہیں آ رہا۔ تمہیں قسمت سے مل رہا ہے تو کیوں ٹھکرا رہے ہو؟''

وہ جل کر بولا۔ ''لالہ! ایسے کسٹمر سے کاٹیج خالی ہی رہے تو بہتر ہے۔''

میں نے کہا۔ ''گلزارے! کسٹمر تو وہی ہے جسے تم نے پچھلے سال بڑے شوق سے کاٹیج دیا تھا مگر اب تمہاری سوچ وہ نہیں ہے...... بڑی بیوقوفی کا کام کر رہے ہو تم...... یہ بھی نہیں سوچتے کہ پورے ایک گھرانے کا بوجھ تمہارے کندھوں پر ہے۔''

''کیا مطلب؟'' وہ تنگ کر بولا۔

''مطلب یہ کہ عشق سے خالی پیٹ نہیں بھرتا...... جس کا انتظار کر رہے ہو، وہ نہیں آئی

اور نہ ہی آئے گی۔ یہ لکھ لو میری طرف سے کاغذ پر۔"

اُس کا رنگ ایک دم پھیکا پڑ گیا۔ کچھ دیر خاموش رہا، پھر ذرا سنبھل کر بولا۔

"لالہ! تم بالکل غلط سمجھ رہے ہو۔ ایسی بات نہیں ہے۔ یہ لو چابی...... جس کو مرضی دے دو کاٹج۔" وہ چابی میرے سامنے میز پر رکھتے ہوئے تیز قدموں سے باہر نکل گیا۔

اُسی ہفتے وہ بیمار پڑ گیا۔ پہلے سر میں درد ہوا پھر تیز بخار چڑھ گیا۔ پانچ چھ روز اُس نے ڈاکٹر کی دوائی کھائی پھر کاٹج کا کام اپنے دوست جماعت علی کے سپرد کر کے گاؤں چلا گیا۔ گاؤں سے اُس کی واپسی کوئی ایک ماہ بعد ہوئی۔ میں نے اُسے دیکھا تو بہت حیران ہوا۔ بے حد کمزور نظر آ رہا تھا۔ آنکھوں میں جیسے ایک مستقل آگ سی جل رہی تھی۔ اُس نے بتایا کہ وہ جہلم جا رہا ہے۔ وہاں اُس کا ایک چچازاد بھائی ویلڈنگ کا کام کرتا ہے۔ ابھی ڈلہوزی میں تو کوئی کام ہے نہیں وہ سوچ رہا ہے کہ وہاں جہلم میں چچازاد بھائی کے ساتھ تین ماہ لگا آئے۔

میں جانتا تھا بات کچھ اور ہے...... پولیس والوں کا واسطہ دن رات جھوٹ بولنے والوں سے رہتا ہے۔ انہیں جھوٹ سچ کی پہچان عام آدمی سے زیادہ ہوتی ہے۔ مجھے شبہ تھا کہ جہلم صرف بہانہ ہے۔ گلزار داتا کی نگری لاہور جائے گا اور وہاں میم صاحبہ کو تلاش کرے گا...... اگر جہلم گیا بھی تو بہت جلد وہاں سے بستر بوریا اٹھا کر لاہور پہنچ جائے گا۔ لاہور سے جہلم فاصلہ ہی کتنا ہے۔ زیادہ سے زیادہ سو میل۔ میں نے سوچا کہ گلزار کو روکنا چاہیے۔ وہ آگ سے کھیلنے کی کوشش کر رہا تھا اور اس کا جلنا یقینی تھا کیونکہ حالات نے اُس کے لباس پر تیل چھڑک رکھا تھا۔ گلزار میری والدہ کو اچھا لگتا تھا اس لیے مجھے بھی اچھا لگتا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ جسے ماں جی نے بیٹا کہہ کر پکارا ہے وہ اجنبی شہر میں رسوا ہو اور ایک فاحشہ کی خاطر اپنی عزت اور جان خطرے میں ڈالے۔ میں نے ارادہ کیا کہ آج رات اپنی نیند گلزار کی بہتری کے لیے قربان کروں، چھٹی کے بعد گلزار کے گاؤں پہنچوں اور اُس کے گھر والوں سے کہوں کہ وہ منگنی شنگنی چھوڑیں اور سیدھے سبھاؤ دو بول پڑھوا کر گلزار کے پاؤں میں بیوی کی زنجیر ڈال دیں۔ یہ حقیقت ہے کہ شادی، عشق کے بڑے بڑے ڈھیٹ بھوتوں کو بھی مار دیتی ہے۔ عاشق "شوہر" بن کر گھر گرہستی کے ایسے چکروں میں الجھتا ہے کہ دھیرے دھیرے سب کچھ بھول جاتا ہے۔ خود میرے پیارے مخبر بلال شاہ کے ساتھ بھی اس سے ملتا جلتا واقعہ ہوا تھا۔ آغازِ شباب میں وہ ایک لڑکی کے عشق میں گرفتار ہوا تھا۔ وہ بھیڑ بکریاں پالنے والے لوگ تھے۔ جب بلال شاہ کی شادی کسی اور جگہ ہونے لگی تھی تو اُس نے محبوبہ سے کہا

"پیاری! میری جان تو تمہارے پاس ہے۔ میرا باپ مجھے نہیں میری لاش کو سہرا باندھ رہا ہے۔" لاش نے سہرا باندھا تھا۔ اپنی شادی کے چاول کھائے تھے...... اور پھر اس لاش نے دس عدد بچے پیدا کیے تھے۔ اب یہ لاش سب کچھ بھول چکی تھی۔ دودھ جلیبیاں کھاتی تھی۔ ادھ رڑکے پیتی تھی۔ اور بالکل "زندہ انسانوں کی طرح" لمبے لمبے ڈکار لیتی تھی۔

رات آٹھ بجے کے قریب جب میں اپنی سرکاری جیپ پر گلزار کے گاؤں "جاہو" جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ جماعت خان میرے پاس آیا اور اُس نے بتایا کہ گلزار جہلم جانے کے لیے آج تین بجے ڈلہوزی سے روانہ ہو گیا ہے...... میں سر پکڑ کر رہ گیا۔

☆======☆======☆

دو ہفتے بعد میں نے جہلم کے ایڈریس پر گلزار کا پتہ کرایا۔ میرے ہیڈ کانسٹیبل کو گلزار کے چچازاد بھائی نے بتایا کہ گلزار اُس کے پاس آیا تھا۔ پانچ چھ روز اُس نے کام کیا۔ بیماری سے اٹھا تھا ابھی کمزوری باقی تھی اُسے پھر بخار چڑھنے لگا۔ کہنے لگا لاہور جا کر بڑے اسپتال میں دکھاؤں گا۔ بس میں بیٹھا اور لاہور چلا گیا۔ ابھی تک واپس نہیں آیا۔

یہ اطلاع میری توقع کے عین مطابق تھی۔ مجھے گلزار کی بیماری کا پتہ تھا اور اُس "بڑے اسپتال" کا بھی جہاں اُس نے جانا تھا۔ وہ یقیناً جین عرف جینی کی تلاش میں گیا تھا۔ وہ کوئی بچہ ہوتا تو میں اُسے ڈانٹ ڈپٹ کر سمجھا لیتا۔ وہ عاقل بالغ اور اپنے اچھے برے کا ذمے دار تھا۔ میں اُسے کہاں تک رسی ڈال کر رکھتا اور پھر میری اپنی مصروفیات بھی تھیں۔ تھانیدار کو تو بعض اوقات آٹھوں پہر ڈیوٹی پر رہنا پڑتا ہے۔ میرے لیے بھی اُس تھانے میں سو طرح کے بکھیڑے تھے۔ ہر تیسرے چوتھے روز کوئی نہ کوئی سنگین واردات ہو جاتی تھی۔ مارچ کے آخر میں ست دھارا کے نزدیک ڈکیتی کی ایک بڑی واردات ہوئی اور میں اُس میں ایسا الجھا کہ دو تین ہفتے اردگرد کی خبر نہ رہی۔ پٹھانکوٹ اور چمبا میں تفتیش کرنے کے بعد ایک روز میں ڈلہوزی واپس آیا تو میرے اے ایس آئی نے کئی دوسری اطلاعات کے ساتھ ساتھ گلزار کے بارے میں بھی اطلاع دی۔ اُس نے بتایا کہ گلزار کی ماں گاؤں سے آئی ہوئی ہے اور میرے ہی کوارٹر میں رہائش پذیر ہے۔ وہ گلزار کے بارے میں بہت پریشان تھی اور چاہتی تھی کہ لاہور میں گلزار کا پتہ کرایا جائے۔ میرے اے ایس آئی نے مجھ سے پوچھے بغیر ہی دو کانسٹیبل روانہ کر دیئے تھے تاکہ وہ گلزار کا اتہ پتہ معلوم کریں۔

اے ایس آئی اس کے سوا اور کر بھی کیا سکتا تھا۔ بہرحال میں گھر پہنچا۔ گلزار کی ماں کے ساتھ اُس کی بڑی بیٹی بھی آئی ہوئی تھی۔ دونوں زار و قطار رو رہی تھیں۔ گلزار نے ڈلہوزی سے

جانے کے بعد کوئی پیسہ نہیں بھیجا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا تھا کہ گھر میں فاقے چل رہے تھے۔ یہ فاقے بھی برداشت کیے جاسکتے تھے مگر یہ تو پتہ چلتا کہ گلزار ہے کہاں۔ جہلم سے گلزار کے چچا نے جو خط لکھا اُس میں یہی بتایا تھا کہ وہ چندروز اُس کے پاس ٹھہرنے کے بعد لاہور چلا گیا ہے۔ میں نے ماں بیٹی کو ہر طرح تسلی دی اور انہیں خود واپس گاؤں چھوڑ کر آیا۔ میں نے انہیں کہا کہ جیسے ہی گلزار کا اتہ پتہ معلوم ہوتا ہے میں انہیں خود بتا کر جاؤں گا۔ واپس آتے ہوئے میں نے گلزار کے بھائی کی جیب میں چپکے سے چندروز کا خرچہ ڈال دیا۔

لاہور گئے ہوئے کانسٹیبل پورے ایک ہفتے بعد واپس آئے۔ یہ بڑے ہوشیار کانسٹیبل تھے اور سادہ کپڑوں میں سن گن لینے کا انہیں وسیع تجربہ تھا۔ ان میں سے ایک کانسٹیبل نے ''شاہی'' والے کیس میں بڑی مدد کی تھی۔ ان کانسٹیبلوں نے گلزار کے متعلق جو اطلاع دی ہرگز تسلی بخش نہیں تھی۔ انہوں نے بتایا کہ پچھلے مہینے گلزار نہ صرف لاہور پہنچا تھا بلکہ میم صاحب سے ملنے اُس کی رہائش گاہ تک گیا تھا۔ یہ وسیع وعریض رہائش گاہ ماڈل ٹاؤن کے ایک شاندار علاقے میں تھی اور اس علاقے میں کوئی ایرا غیرا شخص قدم بھی نہیں رکھ سکتا تھا۔ میرے کانسٹیبلوں کی حاصل کردہ معلومات کے مطابق میم صاحبہ کے والد گرامی کا نام الفریڈ تھا۔ الفریڈ پکی عمر کا ایک لمبا چوڑا انگریز تھا۔ وہ کئی گز لمبی کار میں گھومتا تھا اور اُس کی کار میں ہر وقت ایک نہایت خوفناک صورت کا براؤن کتا موجود رہتا تھا۔ الفریڈ کی رہائش گاہ کے نزدیک ہی ایک کوٹھی میں کوئی کرنل صاحب رہتے تھے۔ کرنل کی کوٹھی کا چوکیدار پولیس کا ریٹائرڈ ملازم تھا۔ میرے کانسٹیبلوں نے اسی ملازم سے رابطہ کر کے گلزار کے بارے میں سن گن لی تھی۔ کرنل کے چوکیدار نے بتایا تھا کہ پچھلے مہینے پندرہ سولہ تاریخ کو انگریز الفریڈ کی کوٹھی میں کوئی پارٹی تھی۔ گیٹ پر روشنیاں لگی ہوئی تھیں اور پندرہ بیس گاڑیاں کھڑی تھیں۔ شام سے تھوڑی دیر پہلے شلوار قمیص والا ایک نوجوان گیٹ پر آیا اور چوکیدار سے باتیں کرنے لگا۔ (اس نوجوان کا حلیہ گلزار سے ملتا جلتا تھا) اُس نے پہاڑی چپل پہن رکھی تھی اور سر پر چترالی طرز کی ٹوپی تھی۔ وہ کافی دیر مسٹر الفریڈ کے چوکیدار سے باتیں کرتا رہا۔ پھر ان باتوں نے بحث کی شکل اختیار کرلی۔ ایک دو ملازم اور بھی اکٹھے ہوگئے اور انہوں نے نوجوان کو دھکے دے کر گیٹ سے ہٹا دیا۔ اگلے روز کرنل کے چوکیدار نے اس پہاڑی نوجوان کو پھر کوٹھی کے گرد منڈلاتے دیکھا۔ اس سے پہلے کہ وہ اُس سے پوچھ گچھ کرتا مسٹر الفریڈ کی کوٹھی سے سُرخ رنگ کی گاڑی نکلی......نوجوان نے ہاتھ دے کر گاڑی کو روکا۔ اُس کی کھڑکی میں جھک کر کچھ دیر باتیں کرتا رہا۔ اس کا انداز بڑا خوشامدی تھا۔ تھوڑی دیر بعد گاڑی کا دروازہ کھلا

نوجوان اُس میں بیٹھ کر چلا گیا۔ اس واقعے کے بعد کرنل کے چوکیدار نے اُسے پھر نہیں دیکھا...... کرنل کے چوکیدار نے جو کچھ بتایا تھا اُس کے مطابق سُرخ رنگ کی وہ گاڑی ماڈل ٹاؤن کے سب سے امیر اور بااثر شخص لالہ ہر پرشاد کے اکلوتے بیٹے پرتھی پال کی تھی۔ چوکیدار کے مطابق پرتھی پال ایک بہت پڑھا لکھا اور فیشن ایبل نوجوان ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایک بہت بڑا غنڈہ بھی ہے۔ درجنوں لوگوں کے ہاتھ پاؤں توڑ چکا ہے اور اُسے جاننے والے اُس کے نام سے کانپتے ہیں۔ یہ پرتھی پال مسٹر الفریڈ کی بیٹی جین کا منگیتر ہے اور اکثر مسٹر الفریڈ کے گھر آتا جاتا رہتا ہے۔ اُس کی گاڑی میں پہاڑی نوجوان کا بیٹھ کر چلے جانا خطرے کی نشانی ہے۔

دونوں کانسٹیبلوں نے اپنے طور پر بہت کوشش کی تھی کہ گلزار کا کوئی سراغ ملے لیکن پرتھی پال کی گاڑی میں بیٹھ کر چلے جانا اُس کا آخری سراغ ثابت ہوا تھا۔

☆======☆======☆

کانسٹیبلوں کی دی ہوئی اطلاع کسی طور بھی تسلی بخش نہیں تھی۔ حالات بالکل ویسا رخ اختیار کر رہے تھے جیسا میں نے اندازہ لگایا تھا۔ گلزار میم کی سنہری زلفوں میں الجھ کر لاہور پہنچا تھا اور وہاں سے گم شدہ ہوگیا تھا۔ ادھر ڈلہوزی میں اُس کے گھر والوں پر قیامت گزر رہی تھی۔ میں نے گلزار کی ماں سے وعدہ کیا تھا کہ جلد گاؤں آ کر اُسے گلزار کی خیر خیریت سے آگاہ کردوں گا اور ہوسکتا ہے گلزار کو اپنے ساتھ ہی لے آؤں، اب سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس منہ سے گاؤں جاؤں اور انہیں تسلی دوں۔ گلزار کو ڈلہوزی سے نکلے اب قریباً سات ہفتے ہو چکے تھے اور گزرنے والے ہر دن کے ساتھ اُس کی گمشدگی سنگین ہوتی جارہی تھی۔

دو تین روز کے اندر میں نے تھانے میں اپنے ضروری کام نبٹائے اور کانسٹیبل احسان الٰہی کو لے کر ڈلہوزی سے عازم لاہور ہوگیا۔ ہم پٹھانکوٹ سے ٹرین میں پنڈی پہنچے اور وہاں سے بذریعہ بس ایک دشوار سفر کے بعد لاہور آ گئے۔ یہ اپریل کا مہینہ تھا۔ لاہور میں ابھی گرمی کا زور نہیں ہوا تھا لیکن ڈلہوزی کی ٹھنڈی ٹھار ہواؤں سے نکل کر آئے تھے لہٰذا ہمیں کافی گرمی محسوس ہو رہی تھی۔ لاہور پہنچتے ہی مقامی تھانے کا رخ کیا۔ ایس ایچ او ناتھا سنگھ ایک مددگار شخص تھا۔ میرے دونوں کانسٹیبل پہلے ہی اُس سے مل چکے تھے لہٰذا اس کیس کی الف ب اُسے معلوم تھی۔ وہ مجھے کچھ ڈرا ڈرا سا لگا۔ اس ڈر کی وجہ کوئی ڈھکی چھپی نہیں تھی۔ میں جس معاملے کی چھان بین کے لیے یہاں آیا تھا اُس میں مسٹر الفریڈ اور لالہ ہر پرشاد جیسے لوگوں کا نام آ رہا تھا۔ اگر خدانخواستہ یہ معاملہ بگڑ جاتا تو ناتھا سنگھ کے لیے تو قیامت ہی آ جانا تھی۔ میں

نے فیصلہ کیا کہ کوئی بھی کارروائی کرنے سے پہلے ناتھا سنگھ کو سب کچھ بتا کر پوری طرح
میں لے لوں۔ میں نے اُسے گلزار اور جین (میم صاحبہ) کی پوری سٹوری سنائی۔ جب
نے ناتھا سنگھ کو بتایا کہ مسٹر الفریڈ کی یہ خوبصورت بیٹی گھر سے دور جا کر کیا گل کھلاتی رہی
وہ بھی ششدر رہ گیا...... ناجائز تعلقات اور وہ بھی بالکل معمولی قسم کے لوگوں سے......
کی بات تھی۔ جین جیسی لڑکیاں تو جس پھل کی طرف ہاتھ بڑھائیں۔ وہ شاخ سمیت
آتا ہے۔ اعلیٰ خاندانوں کے حسین وجمیل نوجوان جین جیسی لڑکی سے دوستی کے خواہش
ہو سکتے تھے۔ پھر وہ کیوں راج مزدوروں، ڈرائیوروں اور چوکیداروں پر نگاہ کر رہی تھی
ناتھا سنگھ میری بات سن کر گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ کہنے لگا۔

''نواز خان! میری سمجھ میں ایک ہی بات آتی ہے۔ یہ جو کُڑی ہے ناں پُٹھی (الٹی)
پیدا ہوئی ہے۔ تھوڑا بہت میں بھی جانتا ہوں اسے۔ اس میں کوئی گل سیدھی ہے ہی نہیں
دوسروں کو حیران کرنا چاہتی ہے۔ چاہے اس کے لیے سارے کپڑے اتار کر بھرے بازار
کھڑا ہونا پڑے۔ یہ پچھلی دیوالی کی بات ہے۔ وہ اور اُس کی سہیلی حرامجادی...... کیا نام
اُس کا...... ہاں پریما...... وہ دونوں اپنی دس گز لمبی کار میں بیٹھ کر پرانی انار کلی میں دہی
کھانے پہنچ گئیں۔ اوپر سے لباس ایسا پہن رکھا تھا کہ چھ سال کا بچہ بھی دیکھے تو ایک دم اٹھ
سال کا ہو جائے۔ وہاں تو بھئی مجمع لگ گیا تماش بینوں کا۔ ایک سے بڑھ کر ایک بھن
تھا۔ راہگیر بھی رک رک کر دیکھنے لگے۔ ٹریفک جام ہو گئی۔ میرا ایک سب انسپکٹر اُدھر سے گ
رہا تھا۔ اُس نے اُن دونوں کو سمجھایا کہ وہ کیوں اپنا اور دوسروں کا تماشا بنا رہی ہیں۔ بازار
میں اچھے برے ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ یہ نہ ہو کہ کوئی مصیبت پڑ جائے۔ اگر دہی
کھانے کا اتنا ہی شوق ہے تو وہ گھر جا کر کھالیں...... بس اتنی سی بات پر حرامجادیاں آگ بگ
ہو گئیں۔ سب انسپکٹر کی بے عزتی کر ڈالی۔ وہ تو بندہ سمجھ دار تھا ہوا کا رخ دیکھ کر پیچھے ہٹ
ورنہ ہو سکتا تھا تھپڑ شپڑ ہی پڑ جاتے بے چارے کو۔''

انسپکٹر ناتھا سنگھ اور میں دیر تک باتیں کرتے رہے۔ ناتھا سنگھ نے بڑی ہمدردی
ساتھ مجھے یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ یہ معمولی لوگ نہیں ہیں اور اگر میں ان سے پوچھ گچھ
ہی چاہتا ہوں تو اپنے آپ کو پوری طرح تیار کر لوں۔ ناتھا سنگھ کی بات میں وزن تھا۔ میں
اُسی روز ہیڈ کوارٹر میں انگریز ایس ایس پی صاحب سے رابطہ قائم کیا تھا اور انہیں تمام صور
حال بتائی۔ عام طور پر انگریز افسر اپنے کسی ہم وطن کے خلاف کسی مقامی کو کارروا
اجازت نہیں دیا کرتے تھے لیکن ایس ایس پی صاحب مجھے عرصے سے جانتے تھے او

کیسوں میں میری مدد کر چکے تھے۔ انہوں نے میری بات تسلی سے سنی۔ پھر کہنے لگے۔ ''مسٹر
الفریڈ اور لالہ ہر پرشاد دونوں شہر کے معزز لوگوں میں سے ہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ قانون
سے بالاتر کوئی نہیں۔ تم اگر ہر پرشاد کے بیٹے سے پوچھ گچھ کرنا چاہتے ہو تو ضرور کرو۔
ہاں...... یہ بات ہے کہ وہ بہت مصروف شخص ہے۔ میں فون پر بات کر کے اُس سے وقت
لے لوں گا۔ پھر تمہیں بتا دوں گا۔''

مجھے بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ جہاں اتنے دن انتظار کیا تھا وہاں ایک آدھ دن مزید
انتظار کرنے سے کیا فرق پڑتا تھا۔ تیسرے روز ایس ایس پی صاحب نے انسپکٹر ناتھا سنگھ کو
فون کر کے بتایا کہ انسپکٹر نواز خان آج سہ پہر ٹھیک تین بجے پرتھی پال کے آفس واقع ڈیوس
روڈ پر پہنچ جائے۔

میں ٹھیک تین بجے پرتھی پال کے دفتر پہنچ گیا۔ یہ دفتر ایک بہت بڑی عمارت میں تھا۔
عمارت کی پیشانی پر دھات کے بڑے بڑے خوبصورت الفاظ میں ''ونڈر کارپٹس ڈیلرز'' کے الفاظ
آویزاں تھے۔ پرتھی پال نے ایک آراستہ پیراستہ دفتر میں مجھے ملاقات کا ''اعزاز'' بخشا۔ وہ
شکل وصورت سے ہی ایک بگڑا ہوا رئیس زادہ نظر آتا تھا۔ گلے میں سونے کی موٹی زنجیر۔
ہاتھوں میں ڈائمنڈ کی انگوٹھیاں۔ آنکھوں میں سنہری فریم کی عینک۔ وہ ایک وسیع میز کے پیچھے
بیٹھا مجھے خشمگیں نظروں سے گھور رہا تھا۔ جیسے پوچھ رہا ہوں۔ اچھا...... تو یہ تم ہو وہ دو ٹکے کے
انسپکٹر جس نے مجھ سے پوچھ تاچھ کرنے کی جرأت کی ہے۔

''بیٹھو۔'' اس نے اپنے بھاری بھرکم لہجے میں کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
میں بیٹھ گیا۔ ''کہو، میں کیا سیوا کر سکتا ہوں تمہاری۔'' وہ اکھڑے ہوئے لہجے میں بولا۔ اُس
کے انداز سے لگتا تھا جیسے ملزم میں ہوں اور وہ تھانیدار ہے۔

میں نے کہا۔ ''پرتھی پال صاحب! ڈلہوزی کا ایک نوجوان گلزار پچھلے ڈیڑھ ماہ سے
لاپتہ ہے ہم اُسی کی تلاش میں یہاں آئے ہوئے ہیں۔ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ یہ نوجوان مسٹر
الفریڈ کی رہائش گاہ کے آس پاس دیکھا گیا تھا۔ میں اسی سلسلے میں آپ سے چند سوال کرنا
چاہتا ہوں۔''

وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔ ''میں آپ کے سوالوں کے جواب دینے کے لیے ہی تو یہاں
بیٹھا ہوا ہوں۔ اب آپ منہ سے کچھ نکالیں گے تو مجھے پتہ چلے گا ناں کہ مجھے کیا جواب دینا
ہے۔''

میں نے کہا۔ ''پچھلے مہینے سولہ تاریخ کو بروز جمعرات مسٹر الفریڈ کی رہائش گاہ پر ایک

سالگرہ پارٹی تھی۔ کیا آپ اُس پارٹی میں شریک ہوئے تھے؟''

''بالکل ہوا تھا۔'' پرتھی پال نے جواب دیا۔ ''ہوتا کیوں نہ۔ وہ جینی کی سالگرہ تھی اور جینی میری ہونے والی لائف پارٹنر یعنی کیا کہتے ہیں بیوی ہے۔''

''آپ اُس پارٹی میں کب سے کب تک رہے؟''

''شروع سے آخر تک۔''

''میں ٹائم پوچھنا چاہتا ہوں۔''

پرتھی پال مجھے گھورتے ہوئے بولا۔ ''بال کی کھال اتارنا چاہتے ہو تو یہ کوئی اچھا شوق نہیں ہے۔''

''گستاخی معاف۔ میں شوق کے لیے نہیں قانونی ضرورت کے تحت پوچھ رہا ہوں۔''

وہ گہری سانس لے کر بولا۔ ''پارٹی قریباً ساری رات چلتی رہی تھی۔ صبح دم اکثر مہمان انیکسی میں ہی سو گئے تھے۔ میں بھی صبح دس گیارہ بجے اٹھ کر آیا تھا۔''

میں نے پوچھا۔ ''کیا اس سے پہلے بھی ایسا ہوتا رہا ہے کہ آپ نے اپنی منگیتر کے گھر شب بسر کی ہو؟''

وہ تیکھے لہجے میں بولا۔ ''بالکل ہوتا رہا ہے۔ نچلے لوگوں جیسی تنگ نظری ہمارے گھرانوں میں نہیں ہوتی۔ ہم اکٹھے گھومتے پھرتے ہیں۔ پارٹیوں میں جاتے ہیں۔ اکثر پارٹیاں رات دیر تک چلتی رہتی ہیں اور شام کو گئے ہوئے مہمان صبح ہی واپس آتے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''پرتھی پال صاحب! آپ کے بیان سے ظاہر ہے کہ شام کے وقت آپ مسٹر الفریڈ کی کوٹھی میں تھے۔ چند گواہیوں کے مطابق شام کے وقت کوٹھی کے گیٹ پر چھوٹا سا جھگڑا ہوا تھا۔ ایک اجنبی نوجوان کوٹھی میں جانا چاہتا تھا۔ چوکیداروں نے اُسے روکا تھا اور بحث تکرار کے بعد دھکے دے کر اُسے وہاں سے چلتا کیا تھا۔ آپ کو اس جھگڑے کے بارے میں پتہ ہے؟''

پرتھی پال بولا۔ ''تم نے ذکر کیا ہے تو مجھے یاد آیا ہے۔ شام کے وقت گیٹ پر کچھ ہلا گلا ہوا تھا۔ یہ ایک خبطی سا پہاڑی لڑکا تھا۔ کپڑے بوسیدہ تھے اور داڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ غالباً اُس نے کچھ نشہ وغیرہ بھی کر رکھا تھا۔ کہہ رہا تھا کہ میں نے میم صاحبہ سے ملنا ہے۔ میم صاحبہ سے اُس کی مراد غالباً جینی ہی تھی۔ چوکیدار نے پوچھا کہ میم صاحبہ سے تمہارا کیا واسطہ ہے؟ وہ بولا میں میم صاحبہ کا خادم ہوں اُن کا سیوک ہوں۔ انہوں نے میرا بنگلہ بک کر رکھا ہے۔ میں نے اُن سے پوچھنا ہے کہ وہ میرے بنگلے میں رہنے آئیں گی یا نہیں...... پتہ نہیں کیا واہی تباہی

بک رہا تھا۔ چوکیدار پہلے تو اُسے سمجھاتے رہے وہ باز نہیں آیا تو انہوں نے اس کی مرمت کر دی اور دھکے دے کر وہاں سے ہٹا دیا۔''

میں نے پوچھا۔ ''موقع پر موجود مہمانوں کا نوجوان کے بارے میں کیا خیال تھا؟''

وہ بولا۔ ''خیال کیا ہونا تھا۔ وہ اُسے ولی اللہ سمجھنے سے تو رہے۔ سب دیکھ رہے تھے کہ وہ پاگل سا نشے باز ہے۔''

میں نے پوچھا۔ ''اُس نوجوان سے آپ کی دوسری ملاقات کب ہوئی؟''

وہ بولا۔ ''ابھی تک تو نہیں ہوئی۔ اگر ہو گئی تو میں سب سے پہلے تمہیں اطلاع دوں گا۔''

''لیکن کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ وہ نوجوان پارٹی سے اگلے روز دس بجے کے قریب آپ کی گاڑی میں بیٹھ کر آپ کے ساتھ گیا تھا۔''

وہ سگریٹ کا کش لے کر بولا۔ ''جن لوگوں کا یہ خیال ہے انہیں چار نمبر بس پر بٹھا کر پاگل خانے پہنچا دو...... یا پھر انہیں باؤلے کتے نے کاٹا ہوگا اُن کا علاج شلاج کراؤ......''

پرتھی پال کا لہجہ بڑا تند و تیز تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ اگر میں نے اُسے مزید کریدنے کی کوشش کی تو وہ بھڑک اٹھے گا۔ میں نے موضوع بدل دیا اور تھوڑی دیر اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے اُس کے پاس سے اٹھ آیا۔

پرتھی پال سے ملاقات کے بعد میں نے ضروری سمجھا کہ اُس چوکیدار سے ملاقات کی جائے جس نے ایک مہینہ پہلے گلزار کو پرتھی پال کی سُرخ کار میں سوار ہوتے دیکھا تھا۔ اُس چوکیدار سے ملاقات کرنل کی کوٹھی میں ہی ہو سکتی تھی۔ شام کو میں سادہ لباس میں کرنل کی کوٹھی جا پہنچا۔ چوکیدار کا نام محمد حسین تھا اور وہ پنجاب پولیس میں حوالدار رہ چکا تھا۔ مہندی رنگے بالوں والا یہ ادھیڑ عمر شخص مجھے بڑے تپاک سے ملا۔ میرے کانسٹیبلوں سے اُسے میرے بارے میں سب کچھ معلوم ہو چکا تھا۔ کرنل کی کوٹھی کے گیٹ پر لکڑی کا بنا ہوا ایک سبز رنگ کا کیبن تھا۔ اس کیبن میں دو کرسیاں اور ایک چارپائی پڑی تھی۔ ایک تھری ناٹ تھری رائفل، گولیوں والا ایک بیلٹ، ایک ٹارچ، چائے کے برتن اور چابیوں کا ایک بڑا گچھا۔ یہ اس کیبن کی کل کائنات تھی۔

میں محمد حسین کے ساتھ چارپائی پر جا بیٹھا۔ کوٹھی میں مکمل تاریکی تھی۔ معلوم ہوا کہ کرنل صاحب بمعہ اہل و عیال کہیں گئے ہوئے ہیں...... کیبن کی ایک کھڑکی سے تارکول کی صاف ستھری سڑک نظر آتی تھی۔ اس سڑک کی دوسری جانب کوئی سو گز کے فاصلے پر مسٹر الفریڈ کی

کوٹھی کا جہازی سائز گیٹ تھا۔ چوکیدار محمد حسین نے مجھے تفصیل سے بتایا کہ وہ کہاں بیٹھا تھا۔ شلوار قمیص والا پہاڑی نوجوان کہاں گھوم رہا تھا اور پرتھی پال نے کس جگہ گاڑی روک کر نوجوان کو گاڑی میں سوار کرایا تھا۔

میں نے چوکیدار محمد حسین سے کہا۔ ”تم جو کچھ بتا رہے ہو اس سے ثابت ہوتا ہے کہ 17 مارچ کی صبح پرتھی پال نے گلزار کو کسی برے ارادے کے ساتھ اپنی گاڑی میں بٹھایا اور کہیں لے کر چلا گیا۔ اب دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ وہ اُسے قتل کر چکا ہے یا پھر کسی محفوظ جگہ پر حبس بے جا میں رکھا ہوا ہے۔ اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ ایسی محفوظ جگہ کون سی ہو سکتی ہے۔“

محمد حسین نے کہا۔ ”جناب! اس بارے میں مَیں نے بھی سوچ بچار کی ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ کو کالا شاہ کاکو والی فیکٹری سے پتہ کرنا چاہیے۔“

میں کالا شاہ کاکو کی فیکٹری کا ذکر پہلی بار سن رہا تھا۔ میں نے پوچھا۔ ”یہ کس کی فیکٹری ہے؟“

محمد حسین نے بتایا۔ ”جناب! میرے علم کے مطابق اس فیکٹری کی زمین پرتھی پال صاحب کو اپنی منگنی کے تحفے میں ملی ہے۔ اب اُس زمین پر وہ اپنے خرچے سے فیکٹری بنوا رہے ہیں۔ بڑی لمبی چوڑی عمارت ہے۔ سیلاب کی وجہ سے فیکٹری میں پانی چلا گیا تھا۔ اس لیے پچھلے پانچ سات مہینے سے وہاں کام رکا ہوا ہے۔ پرتھی پال صاحب وہاں اکثر آتے جاتے رہتے ہیں۔ سنا ہے وہاں رنگ رلیاں بھی ہوتی ہیں۔ پرتھی پال صاحب نے وہاں دو تین کمرے بنوا رکھے ہیں جہاں اپنے دفتر کی ملازم لڑکیوں کو ”نوکری پکی کرنے“ کے لیے لے جاتے رہتے ہیں...... میرا دل گواہی دے رہا ہے جی کہ اگر پرتھی پال صاحب نے اُس لڑکے کو کسی بُری نیت سے گاڑی میں بٹھایا تھا تو ضرور اس فیکٹری میں لے گئے ہوں گے۔ وہاں ایک تو کیا پچاس بندے بڑے آسانی سے قید رکھے جا سکتے ہیں اور اگر کسی کو قتل کر کے مدعا غائب کرنا ہو تو بھی وہ جگہ بڑی مناسب ہے۔“

☆======☆======☆

رات خنک اور پُرسکون تھی۔ چودھویں تاریخ تھی اپریل کی اور چاند کی بھی غالباً چودھویں پندرھویں ہی تھی۔ زرد چاندنی گندم کے سنہری کھیتوں پر گر کر کچھ اور بھی زرد نظر آ رہی تھی۔ میں نے اپنی جیپ فیکٹری کے بلند و بالا گیٹ سے کوئی ایک فرلانگ دور جنتر اور کیکر کے گھنے درختوں میں روک دی۔ میں سادہ لباس میں تھا۔ قمیص کے نیچے میں نے ہولسٹر

باندھ رکھا تھا اور اُس میں بھرا ہوا سرکاری ریوالور تھا۔ فیکٹری کا اندر باہر مکمل تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ صرف لوہے کے زنگ آلود گیٹ کے قریب کچھ روشنی نظر آ رہی تھی۔ روشنی کی موجودگی سے اشارہ ملتا تھا کہ شاید فیکٹری میں چوکیدار موجود ہو لیکن یہ کوئی ضروری بھی نہیں تھا۔ میں گیٹ کے قریب سے گزرا اور درختوں میں ٹہلتا ہوا چار دیواری کے ساتھ ساتھ آگے بڑھنے لگا۔

جونہی میں فیکٹری کے پچھواڑے پہنچا مجھے ٹھٹک کر رک جانا پڑا۔ فیکٹری کی دیوار کے ساتھ ہی مزدوروں کی چند جھونپڑیاں نظر آ رہی تھیں۔ ایک شخص لپک کر میرے سامنے آیا اور بڑے ادب سے جھک کر سلام کی۔ وہ ایک ادھیڑ عمر شخص تھا۔ جسم پر فقط ایک لنگوٹی تھی اور چاندنی میں پسلیاں نمایاں نظر آ رہی تھیں۔ وہ ہاتھ جوڑ کر بولا۔ ”معاف کرنا صاحب! اُس کا بچہ بیمار تھا۔ وہ آ نہ سکی۔ آج آپ نہ آتے تو میں ابھی خود چھوڑ کر آتا اُسے۔ معاف کر دیں صاحب۔ وہ بالکل تیار ہے۔ میں ایک سیکنڈ میں حاجر کرتا ہوں اُسے......“ پھر وہ تیزی سے مڑا اور جھونپڑے کی طرف منہ کر کے دبی آواز میں بولا۔ ”او راجی...... او راجی...... چل آ جا باہر۔ بابو صاحب آئے ہیں......“

میں حیرت میں گم یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ دو سیکنڈ بعد جھونپڑے کا پردہ ہلا اور ایک ہیولا سا نکل کر میرے سامنے کھڑا ہو گیا۔ وہ چوبیس پچیس سال کی ایک عورت نما لڑکی تھی۔ رنگ گندمی، آنکھیں بڑی بڑی اور جسم نازک لیکن فاقہ زدہ۔ مدقوق بوڑھا مجھے اور لڑکی کو آمنے سامنے چھوڑ کر گناہ گار انداز میں جھونپڑے کے اندر غائب ہو گیا۔ میں چند سیکنڈ تو مبہوت کھڑا رہا۔ پھر تیزی سے فیصلہ کیا اور ایک طرف چل دیا۔ لڑکی پائل اور چوڑیاں چھنکاتی میرے ساتھ آئی۔

کیسی سادگی تھی قربان ہونے کو دل چاہ رہا تھا۔ نہ نام پتہ پوچھا، نہ آنے کی وجہ، نہ کوئی سوال اور لڑکی میرے ساتھ روانہ کر دی...... چینی مفکر کنفیوشس کہتا ہے کہ معدہ خالی ہو تو عقل دماغ سے نکل کر معدے میں اُتر جاتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ بھوکا شخص روٹی سے آگے کی نہیں سوچتا۔ اس بھوکے ننگے شخص کو بھی شاید صرف روٹی نظر آ رہی تھی جو اُسے اپنی بہو بیٹی کی عزت کے بدلے میں ملتی تھی۔ میں لڑکی کو درختوں میں چلاتا ہوا جیپ کی طرف لے گیا۔ پولیس جیپ کو دیکھ کر وہ ایک دم حیران بلکہ خوفزدہ نظر آنے لگی۔ اُس کے ہونٹوں سے ڈری سہمی آواز نکلی۔ ”بابو صاحب! کہاں جانا ہے؟“

”تھانے میں۔“ میں نے تسلی سے جواب دیا۔

لڑکی کا زرد چہرہ ایک دم تاریک نظر آنے لگا۔ مجھے محسوس ہوا کہ وہ ایک دم بھاگ
گی۔ میں نے لپک کر اس کا بازو پکڑ لیا۔ وہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔ روہانسی آواز میں
''میرا اس میں کوئی قصور نہیں ہے تھانیدار جی۔ میرے گھر والے کا باپ جو کہتا ہے میں
ہوں۔ میرا گھر والا ہسپتال میں ہے جی۔ اُس کی گردن میں جھرباد کا پھوڑا ہے۔ ہمارے
کھانے کو کچھ نہیں ہے۔ خالی پیٹ ہم کسی سے ٹکر کاہے کو لے سکتے ہیں۔ وہ بابو لوگ
جور والے ہیں۔ ہم اُن کا کہنا نہ مانیں گے تو کیا کرلیں گے۔ عجت تو پھر بھی جائے گی
چند روپے پیٹ کا دوخ بجھانے کو ملتے ہیں وہ بھی نہیں ملیں گے۔'' وہ چہرہ ہاتھوں میں چھپا
زاروقطار رونے لگی۔

میں نے اُس سے پوچھا۔ ''کون ہیں وہ بابو لوگ؟''

وہ روتے روتے بولی۔ ''اس کارخانے کے مالک۔ وہ جو بڑی بڑی گاڑیوں میں
آتے ہیں۔''

صورتِ حال کافی حد تک میری سمجھ میں آرہی تھی۔ میں نے لرزتی کانپتی لڑکی
شانے پر ہاتھ رکھا اور بڑی نرمی کے ساتھ اُسے گاڑی کے اندر لے آیا۔ میں نے اُسے
کہ بابو اور اُس کے ساتھیوں پر زبردست چھاپہ پڑنے والا ہے۔ اگر وہ تھانے کچہریوں
چکر سے بچنا چاہتی ہے تو ہر بات صاف صاف بتا دے...... میری یہ بات دبلی پتلی لڑکی کی
میں آگئی۔ وہ پہلے تو ہچکچاتی رہی پھر اُس نے ہمت کر کے سب کچھ میرے گوش گزار کر دیا

اُس کا نام حسنہ تھا اور کوئی ایک برس پہلے اُس کی شادی ہوئی تھی۔ اُس نے جو کہا
وہ مختصراً اس طرح ہے۔ فیکٹری میں سیلاب آنے سے پہلے بابو پرتھی پال اور اس کے
دوست ہر ہفتے اس جگہ محفل جماتے تھے۔ شراب اور جواء وغیرہ تو اس محفل میں ہمیشہ ہو
کبھی کبھار کوئی لڑکی بھی بلالی جاتی تھی۔ ایک مرتبہ انہیں کوئی لڑکی نہ ملی تو وہ حسنہ کو زبردستی
کر اپنی محفل میں لے گئے۔ شیر کے سامنے کوئی احتجاج کرسکتا ہے۔ یہ بھوکے ننگے مزدور
لہو کے گھونٹ پی کر چپ ہو رہے۔

حسنہ اس جھونپڑا بستی کی سب سے خوبصورت لڑکی تھی۔ وہ ایک بار فیکٹری گئی تو
جانے لگی۔ پہلے وہ روتی منہ بسورتی جاتی تھی لیکن جب نوٹ وغیرہ ملنے لگے تو اپنی مرضی
جانے لگی۔ بلکہ ایک موقع ایسا آیا کہ بستی کی دوسری لڑکیاں اُس پر رشک کرنے لگیں
دنوں فیکٹری میں سیلاب کا پانی گھس گیا اور کئی مہینوں کے لیے یہ خرمستیاں دم توڑ گئیں
اب مہینے ڈیڑھ مہینے سے یہ سلسلہ پھر شروع ہو گیا تھا۔ کل بھی فیکٹری میں محفل جمی ہوئی

بڑے بابو صاحب نے چوکیدار کے ہاتھ پیغام بھیجا تھا کہ حسنہ فیکٹری میں آجائے۔ اُسے سخت
بخار تھا اور پھر بارش بھی شروع ہو گئی تھی۔ وہ نہ جاسکی۔ آج وہ اور اُس کا سُسر خوف سے
کانپ رہے تھے۔ اتنے میں مَیں وہاں پہنچ گیا۔ حسنہ کا سسر مجھے اندھیرے میں دیکھ کر یہی
سمجھا کہ بڑے بابو صاحب نے اپنی کسی ساتھی کو بھیجا ہے۔ اُن کے سوا یہاں اور آ بھی کون سکتا
تھا۔ اُس نے فوراً بہو کو میرے ساتھ روانہ کر دیا۔

میں نے حسنہ نامی اس لڑکی سے اندر کی تمام معلومات حاصل کرلیں۔ اُس نے بتایا کہ
آج کل فیکٹری میں صرف ایک چوکیدار ہے اور وہ بڑے گیٹ کے پاس لیٹا رہتا ہے یا کرسی
پر بیٹھا رہتا ہے۔ بڑے بابو صاحب (پرتھی پال) کے ساتھ تین یا چار لڑکے ہوتے ہیں۔ اُن
کے پاس کوئی اسلحہ وغیرہ نہیں ہوتا۔ ہاں بڑے بابو کی گاڑی میں ایک عجیب سا پستول پڑا رہتا
ہے...... میں نے حسنہ کو پوری طرح اعتماد میں لے لیا تھا۔ میں نے اُسے بتایا کہ آج سے کوئی
ایک مہینہ پہلے پرتھی پال نے ڈلہوزی سے آئے ہوئے ایک لڑکے کو اغوا کیا ہے۔ ہم اُسی کو
تلاش کر رہے ہیں۔ کیا وہ اس سلسلے میں ہماری کوئی مدد کرسکتی ہے؟

وہ ڈری ہوئی آواز میں بولی۔ ''صاحب جی! اپنے بچے کی قسم، مجھے اس بارے میں کچھ
پتہ نہیں۔ پچھلے ایک ڈیڑھ مہینے میں صرف تین بار کارخانے میں گئی ہوں۔ مجھے تو وہاں بڑے
بابو اور اُس کے یاروں کے سوا اور کوئی نجر نہیں آیا۔''

میں نے پوچھا۔ ''کارخانے میں کوئی ایسی جگہ ہے جہاں کسی کو بند رکھا جاسکے اور
کارخانے میں آنے جانے والے اُسے دیکھ بھی نہ سکیں؟''

وہ بولی۔ ''ہاں جی۔ جرور ہے ایسی جگہ اور......'' ایک دم وہ کچھ کہتے کہتے چپ ہو گئی۔
مجھے اُس کے چہرے پر گہری سوچ اور تحیر کے آثار نظر آئے۔ صاف محسوس ہوتا تھا کہ اُسے کوئی
بہت اہم بات یاد آئی ہے۔ پوچھنے لگی۔ ''صاحب جی! یہ جو آپ نے اغوا والی بات بتائی ہے۔
یہ کب کی ہے......''

میں نے کہا۔ ''پچھلے مہینے سترہ اٹھارہ تاریخ کی۔''

وہ بولی۔ ''مجھے انگریجی مہینے کا تو پتہ نہیں جی...... چاند کی وہ پندرہ تاریخ تھی، مجھے اچھی
طرح جاد ہے۔ اُس رات بڑی دیر تک کارخانے کے اندر سے چیکوں کی آواجیں آتی رہی
تھیں۔ آپ نے دیکھا ہی ہے ہمارے جھونپڑے کارخانے کی دیوار کے بالکل ساتھ ہیں اندر
کی ساری آواجیں باہر آتی رہی تھیں۔ ہمارا خیال ہے اُس رات بڑے بابو اندر کسی کو مار رہے
تھے۔ وہ جور جور سے روتا تھا اور ''ہائے ہائے'' کرتا تھا۔ بڑا ڈر لگتا تھا اُس کی آواج سن کر۔''

لڑکی کا بیان بڑا اہم تھا۔ میں نے حساب لگایا وہ چاند کی جو تاریخ بتا رہی تھی اُس کے مطابق عین سترہ مارچ کی رات آتی تھی۔ ایک طرح سے اب بات واضح ہوتی جا رہی تھی۔ 16 تاریخ کی شام مسٹر الفریڈ کی کوٹھی پر ہنگامہ ہوا تھا اور چوکیدار محمد حسین نے ہنگامہ کرنے والے نوجوان کا جو حلیہ بتایا تھا وہ سو فیصد گلزار کا تھا۔ اگلے روز دس بجے یہی گلزار اپنے رقیب پرتھی پال کی سُرخ گاڑی میں بیٹھ کر کسی نامعلوم مقام کی طرف چلا گیا۔ یہ سترہ تاریخ تھی۔ سترہ اور اٹھارہ تاریخ کی درمیانی شب کو پرتھی پال کی زیرِ تعمیر فیکٹری سے چیخوں کی آوازیں باہر تک سنی گئیں......اس کے بعد کیا ہوا؟ یہ ابھی اندھیرے میں تھا۔ مجھے اسی اندھیرے کا پردہ چاک کرنا تھا۔

میں نے حسنہ نامی اس لڑکی کو حفاظت کی ضمانت دی اور پوری طرح اعتماد میں لینے کے بعد کہا کہ وہ آج رات کسی طرح فیکٹری کے اندر جانے میں میری مدد کرے۔ وہ بہت ڈری ہوئی تھی پہلے تو اُس نے انکار کیا لیکن پھر یہ بات اُس کے دماغ میں آ گئی کہ میری بات مان کر وہ پولیس کی مدد کرے گی اور بڑا بابو کتنا بھی زور آور ہے پولیس سے زور آور تو نہیں ہو سکتا۔

اُس نے بتایا کہ فیکٹری کے اندر شمالی دیوار کے ساتھ بڑے بابو نے ایک چھوٹا سا مکان بنا رکھا ہے۔ اس میں تین چار کمروں کے علاوہ کام کرنے کا دفتر، غسل خانہ اور باورچی خانہ وغیرہ بھی ہے۔ اس مکان کا ایک چھوٹا سا دروازہ فیکٹری سے باہر کھیتوں میں کھلتا ہے۔ حسنہ نے بتایا کہ اس دروازے میں اندر کی طرف اکثر تالا پڑا رہتا ہے لیکن کبھی کبھی تالا نہیں بھی ہوتا۔ وہ بولی۔ ”صاحب جی! اگر مجھے اُس طرف آنے کا موقع مل گیا اور دروا جے پر تالا نہ ہوا تو میں اندر کی کنڈی گرا دوں گی۔ آپ دروا جا دھکیل کر اندر چلے آنا۔“

......اور اُس کمزور سی لڑکی نے یہ مشکل کام کر دکھایا۔ اُس کے فیکٹری میں چلے جانے کے ایک گھنٹے بعد میں نے اپنی جگہ سے حرکت کی اور فیکٹری کی بلند و بالا دیوار کے ساتھ چلتا ہوا شمالی رخ پر اُس چھوٹے سے آہنی دروازے کے سامنے پہنچ گیا جو اپنے گیرواں رنگ کی وجہ سے دیوار کا ہی حصہ نظر آ رہا تھا۔ قمیص تھپتھپا کر میں نے ریوالور کی موجودگی کا یقین کیا اور پھر بہ آہستگی دروازے کو دھکیلا۔ وہ بڑی روانی کے ساتھ بے آواز کھلتا چلا گیا۔ میں نے اندر قدم رکھا اور اس کے ساتھ ہی مجھے احساس ہوا کہ میں نرم قالین پر کھڑا ہوں اور جس کمرے میں کھڑا ہوں وہ ایک دفتر ہے۔ میں نے دفتر کے اندرونی دروازے کو دھکیلا اور اُسے کھول کر ایک برآمدے میں آ گیا۔ اس برآمدے کے سامنے فیکٹری کا وسیع و عریض احاطہ نظر آ رہا تھا۔ یہ قریباً چار پانچ ایکڑ جگہ تھی۔ ہر طرف تعمیر کا سامان بکھرا ہوا تھا۔ کچھ حصے تعمیر ہو چکے تھے، کچھ

ادھورے تھے اور کچھ ابھی شروع ہی ہوئے تھے۔ برآمدے کے عین سامنے مجھے تین گاڑیاں نظر آئیں۔ ایک ہیوی جیپ تھی اور دو کاریں تھیں۔ ان میں سے ایک سُرخ رنگ کی کار میں پرتھی پال کے ڈیوس روڈ والے دفتر میں پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ یہ پرتھی پال کی پسندیدہ کار تھی۔ میں کچھ دیر برآمدے میں کھڑا سن گن لیتا رہا۔ مکان کے کسی اندرونی کمرے سے ہنسنے بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ یقیناً یہ پرتھی پال اور اُس کے دوست تھے۔ میں بڑی احتیاط سے چلتا ہوا ایک لمبوترے سے کمرے سے گزرا اور ایک ایسی کھڑکی کے سامنے پہنچ گیا جہاں سے روشنی چھن چھن کر باہر نکل رہی تھی۔ میں نے کھڑکی کی ایک درز سے کمرے میں جھانکا۔ یہ کمرہ خالی تھا۔ محفل ساتھ والے کمرے میں جمی ہوئی تھی۔ پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے [illegible] خالی کمرے میں حسنہ داخل ہوئی۔ وہ ننگے پاؤں تھی۔ سر سے اوڑھنی غائب تھی۔ الماری کے پاس رک کر اُس نے بوتل سے چار گلاسوں میں وہسکی انڈیلنی شروع کی۔ روشنی میں مَیں نے اُسے غور سے دیکھا۔ سانولی ہونے کے باوجود خاصی پُرکشش تھی۔ اُس کا جسم گداز تو نہیں تھا لیکن دبلے پن میں بھی ایک نزاکت تھی۔ یقیناً پرتھی پال وغیرہ کے ہتھے چڑھنے سے پہلے وہ اس سے زیادہ پُرکشش رہی ہو گی۔ میں نے کھڑکی سے نگاہیں ہٹا کر ایک دوسری کھڑکی میں جھانکا۔ یہاں تاریکی کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ محتاط انداز میں مَیں نے سارا مکان دیکھ لیا مگر ڈرائنگ روم کے علاوہ اور کہیں زندگی کے آثار نظر نہیں آئے۔ مجھے گلزار کی تلاش تھی اور اگر وہ زندہ تھا تو عین ممکن تھا کہ اس وقت فیکٹری کی چار دیواری میں کہیں موجود ہو۔

مکان سے باہر نکل کر میں نے ایک خاموش سائے کی طرح فیکٹری کے طول و عرض میں گھومنا شروع کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ رہائشی مکان اور ایک زیرِ تعمیر گودام کے سوا مجھے فیکٹری میں کوئی ایسی جگہ نظر نہیں آئی جہاں کسی شخص کو چھپایا جا سکے اور وہ دونوں جگہیں خالی تھیں۔ میں گھومتا ہوا سُرخ کار کی طرف آ گیا۔ دفعتاً مجھے اندازہ ہوا کہ کار کا ایک دروازہ لاک نہیں ہے۔ میں نے مڑ کر دیکھا فیکٹری کا مین گیٹ قریباً دو سو فٹ کی دوری پر تھا۔ لازمی بات تھی کہ وہاں رائفل بردار چوکیدار موجود تھا مگر وہ مجھے نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے آہستگی سے دروازہ کھولا اور گاڑی کے اندر گھس گیا۔ مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں تھا کہ گاڑی کے ڈیش بورڈ میں وہ ”عجیب سا پستول“ دیکھوں جس کا ذکر حسنہ نے کیا تھا۔ ڈیش بورڈ بغیر تالے کے تھا۔ میں نے اُسے کھولا تو فلالین کے کپڑے میں لپٹا ہوا پستول مجھے نظر آ گیا اور اس کے ساتھ ہی مجھے پتہ چل گیا کہ حسنہ نے اُسے عجیب کیوں کہا تھا۔ اس پستول کے آگے کوئی آٹھ انچ لمبا سائیلنسر لگا ہوا تھا۔ پستول اور سائیلنسر دونوں امپورٹڈ تھے اور اُن کی قیمت موجودہ حساب سے

چودہ پندرہ ہزار سے کم نہیں تھی۔ میں ڈیش بورڈ بند کر کے گاڑی سے نکلنا ہی چاہتا تھا کہ
شے پر میری نگاہ پڑی اور میں ٹھٹک سا گیا۔ یہ ایک سیاہ ڈائری تھی جس کا ایک کونہ ڈیش
کے نچلے خانے سے جھانک رہا تھا۔ بوسیدہ سی جلد تھی۔ میں نے چاند کی روشنی میں اُ
ورق گردانی کی تو انکشاف ہوا کہ یہ سچ مچ کی ڈائری ہے۔ یعنی ہر صفحے پر تاریخ اور روزم
مصروفیات لکھی ہوئی تھیں۔ تحریر انگریزی میں تھی اور کافی شکستہ تھی تاہم اچھی روشنی میں پڑ
جاسکتی تھی۔ اس گاڑی میں اس سے قیمتی شے میرے لیے بھلا کیا ہوسکتی تھی۔ میں نے یہ ڈائ
اپنے لباس میں رکھ لی اور گاڑی سے باہر نکل آیا...... تھوڑی ہی دیر بعد میں دوبارہ فیکٹری
آفس میں کھڑا تھا۔ میں نے بیرونی دروازہ کھولا اور جس خاموشی سے آیا تھا اسی خاموشی سے
باہر نکل آیا۔

☆======☆======☆

ڈائری میرے سامنے میز پر پڑی تھی اور میں سر پکڑے بیٹھا تھا۔ اس ڈائری نے میر
تفتیش کو آگے بڑھانے کی بجائے فل اسٹاپ لگا دیا تھا۔ میں نے اس ڈائری کو کئی جگہ
پڑھا تھا خاص طور پر سترہ مارچ والا صفحہ میرے زیرِ مطالعہ رہا تھا۔ مارچ کی دوسری تاریخوں
طرح اس تاریخ میں بھی پرتھی پال نے ایک مصروف دن گزارا تھا۔ صبح دس بجے سے رات
بجے تک کی مصروفیات لکھی ہوئی تھیں۔ اس ڈائری میں پرتھی پال نے جو کچھ بھی لکھا تھا
احتیاط سے لکھا تھا۔ کم از کم اس ڈائری کی وجہ سے اُس پر کوئی حرف نہیں آ سکتا تھا اور اُ
سترہ تاریخ کی مصروفیات تو ویسے بھی سیدھی سادی تھیں۔ اُس نے لکھا تھا۔ ''رات پارٹی
سے ختم ہوئی تھی۔ اس لیے دیر سے سویا اور دیر سے اٹھا۔ سر بہت بھاری تھا۔ سوچا گھر
نہاتا ہوں لیکن باہر پورچ میں آیا تو پتہ چلا کہ گاڑی سونا لے کر گئی ہے۔ سونا ایسی ہی حرکتیں
کرتی ہے۔ وہ ساڑھے گیارہ بجے کے قریب واپس آئی۔ میں اُس وقت تک نہا دھو کر
کر چکا تھا۔ پھر بھی اپنے شیڈول سے آدھا گھنٹہ لیٹ تھا۔ پہلی کی بجائے دوسری فلائٹ
پنڈی جانا پڑا۔ وہاں میٹنگ بھی کافی دیر تک چلی یوں رات گیارہ بجے سے پہلے واپسی
ہوسکی۔ کالا شاہ کاکو جانے کا تو اب سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ فلیٹیز میں ڈنر کیا وہاں
رائے سے ملاقات ہوگئی۔ اُن کی خوبصورت وائف بھی ساتھ تھی۔ ڈاکٹر رائے اپنے
والے پلاٹ کا ذکر لے بیٹھے۔ اُن کا خیال ہے......'' اس سے آگے پلاٹ کے جھگڑے
طویل ذکر تھا جس کا اس کہانی سے تعلق نہیں۔

یہ تحریر دیکھنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ سترہ اور اٹھارہ مارچ کی درمیانی شب

بجے تک اور غالباً اس کے بعد بھی پرتھی پال فلیٹیز ہوٹل میں تھا...... اب سوچنے کی بات یہ تھی کہ
اُس رات کالا شاہ کاکو کی فیکٹری میں ایک نامعلوم شخص پر تشدد کرنے والا کون تھا اور کیوں تشدد
کر رہا تھا۔ میرا دھیان رہ رہ کر اس تحریر کی ابتدائی سطروں کی طرف جا رہا تھا اور مجھے احساس
ہو رہا تھا کہ ان سطروں میں ایک اہم نکتہ چھپا ہوا ہے۔ پرتھی پال نے لکھا تھا کہ وہ پورچ میں
پہنچا تو پتہ چلا کہ گاڑی سونا لے گئی ہے...... یہ کوئی دس بجے کا عمل تھا۔ اور یہی وقت تھا جب
کرنل کے چوکیدار محمد حسین نے سُرخ گاڑی کو گیٹ سے نکلتے اور آگے جا کر اُس میں گلزار کو
سوار ہوتے دیکھا۔ میں پرتھی پال کی سُرخ گاڑی کو اچھی طرح دیکھ چکا تھا۔ اُس کی پچھلی
کھڑکیوں اور بیک اسکرین پر پردے پڑے ہوئے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ چوکیدار محمد حسین
نے جب اپنے کیبن سے اس گاڑی کو دیکھا ہوگا تو اُسے ٹھیک سے پتہ نہیں چل سکا ہوگا کہ
گاڑی کون چلا رہا ہے لیکن چونکہ یہ پرتھی پال کی گاڑی تھی اور وہ اسی پر یہاں پہنچا تھا لہٰذا محمد
حسین نے تصور کیا کہ گاڑی پرتھی چلا رہا ہے۔

اب اس ڈائری کی تحریر بتا رہی تھی کہ گاڑی پرتھی پال نہیں وہ سونا نامی لڑکی چلا رہی تھی۔
سونا نامی یہ لڑکی کون تھی اور پرتھی پال سے اُس کا کیا رشتہ تھا؟ اس بارے میں ڈائری کچھ نہیں
بتاتی تھی۔ میں نے ڈائری کی اچھی طرح ورق گردانی کی۔ پچھلے ڈھائی مہینوں کی روداد میں
تین چار جگہ اس سونا نام کی لڑکی کا ذکر آیا تھا لیکن اس ''ذکر'' کے حدود اربعے پر کوئی روشنی نہیں
پڑتی تھی۔

میں اپنی سوچوں میں گم بیٹھا تھا۔ یہ انسپکٹر ناتھا سنگھ کا کمرہ تھا۔ وہ کسی تفتیش پر گیا ہوا تھا۔
اُس کا سنتری دروازے پر چوکس کھڑا تھا۔ دفعتاً مجھے محسوس ہوا کہ سنتری کسی عورت سے باتیں
کر رہا ہے۔ چند لمحے بعد سنتری نے اندر آ کر کھٹاک سے سیلوٹ کیا اور مجھے اطلاع دی کہ
ایک میم صاحبہ مجھ سے ملنا چاہتی ہیں۔ میم صاحبہ کا نام سن کر میری رگوں میں سنسناہٹ دوڑ
گئی۔ دھیان سیدھا جین عرف جینی کی طرف گیا۔ میرا اندازہ درست نکلا۔ وہ جینی ہی تھی۔
سنتری نے چق اٹھائی تو وہ جھک کر اندر آ گئی۔ میں اُسے پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ آج وہ پہلے
سے زیادہ خوبصورت اور ماڈرن نظر آ رہی تھی۔ اُس نے پتلون کے اوپر ایک پتلی سی بنیان
پہن رکھی تھی۔ اس ''بے چاری بنیان'' سے میم صاحبہ کا جوبن سنبھالے نہیں سنبھلتا تھا۔ حد یہ تھی
وہ اپنا گدھے کے سائز کا کتا بھی ساتھ ہی لیتی چلی آئی تھی۔ یہ بلڈاگ بڑی خونخوار نظروں
سے اردگرد کی چیزوں کو گھور رہا تھا۔ ظاہر ہے میں اور سنتری بھی ''ان چیزوں'' میں شامل تھے۔
اچھی طرح اطمینان سے بیٹھنے کے بعد جینی نے گفتگو کا آغاز کیا۔ وہ ٹوٹے پھوٹے

لفظوں میں اردو بولتی تھی۔ کہنے لگی۔ ''انسپکٹر نواز خان! ہم نے تم کو ڈلہوزی میں دیکھا تو
یہاں دیکھا تو بڑا خوشی ہوا۔ ہم کو مالوم ہوا ہے کہ تم گول زار (گلزار) کا انوسٹی گیشن کر
کے لیے ادھر آیا۔ گاڈ جانتا ہے ہم کو اُس کے لاپتہ ہونے کا بڑا دکھ ہے۔ وہ گڈ مین تو
اچھا آدمی تھا۔ ہم کو مالوم ہوتا کہ وہ ہم سے ملنے آیا ہے تو ہم خود اُس کو اپنے پاس بلاتا۔ ٹیگر
پاگل واچ مین سے جھگڑا کرتا رہا۔ پھر مالوم نہیں کدھر چلا گیا۔''

میں نے کہا۔ ''مس جین! وہ گیا نہیں اُسے لے جایا گیا ہے اور لے جانے والی کار
کے منگیتر محترم پرتھی پال صاحب کی ہے۔''

''یہ تم کو کس نے بتایا؟'' اُس نے ماتھے پر شکنیں ڈال کر پوچھا۔

میں نے چوکیدار محمد حسین کا نام ظاہر کیے بغیر جینی کو بتایا کہ سترہ مارچ کی صبح کوٹھی
نکلنے والی سُرخ کار کو گلزار نے ہاتھ دے کر روکا تھا اور کار چلانے والا اُسے اپنے ساتھ
کر کے لے گیا تھا۔ اس کے بعد سے گلزار کا کچھ پتہ نہیں۔

وہ بولی۔ ''سُرخ کار تو پرتھی کا ہی ہے لیکن ہم کو یقین نہیں آرہا کہ وہ ایسا کر
ہاں......وہ کہیں نشے میں نہ ہو۔ نشے میں اُس کو کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ تم نے اس بارے
اُس سے بات کیا؟''

میں نے کہا۔ ''بات کی ہے لیکن وہ ایسا بھلا مانس کہاں ہے کہ آسانی سے بتادے۔''

جینی کے چہرے پر اب سوچ کی گہری پرچھائیاں تھیں۔ یہ وہ سیلانی لڑکی نظر نہیں
تھی جو راہ چلتے مردوں کو پکڑ کر ''پرستان'' کی سیر کرا دیتی تھی۔ وہ دبے لہجے میں بو
''انسپکٹر! ہم مانتا ہے کہ پرتھی ہمارا منگیتر ہے مگر ہم انصاف کا گلا کاٹنا نہیں مانگتا۔ ہم چاہتا
کہ جو بھی سچ ہے وہ سامنے آئے۔ ہم تم سے درخواست کرتا ہے کہ تم اس کیس کو اچھی
دیکھو......''

جینی کی باتوں سے یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ جیسے وہ خود بھی پرتھی پال کے متعلق شبے میں
ہوئی ہے اور سمجھتی ہے کہ گلزار کے غائب ہونے میں پرتھی یا اُس کے کسی ساتھی کا ہاتھ
ہے۔ کتنے گھٹیا کردار کے لوگ تھے یہ اور کتنے کمزور تھے ان کے رشتے۔ وہ ایک دوسرے
دھوکہ دے رہے تھے اور ساتھ ساتھ اس خیال سے بھی ڈر رہے تھے کہ اُن سے دھوکا
جینی سے میری باتوں کے دوران ہی ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ میں نے ریسیور اٹھایا تو
جانب سے ایک جانی پہچانی آواز آئی۔ یہ پرتھی پال تھا۔ وہ مجھے انسپکٹر ناتھا سنگھ سمجھ
پوچھ رہا تھا کہ جینی ادھر پولیس سٹیشن تو نہیں آئی۔ جینی نے فوراً اندازہ لگا لیا کہ یہ پرتھی

فون ہے اور وہ اُس کے متعلق پوچھ رہا ہے۔ وہ اشاروں سے مجھے منع کرنے لگی کہ میں اُسے
کچھ نہ بتاؤں۔ میں نے پرتھی پال سے کہہ دیا کہ نہیں، یہاں کوئی نہیں آیا۔ پرتھی پال نے فون
بند کر دیا۔

پرتھی پال سے گفتگو کر کے میرے ذہن میں آندھیاں سی چلنے لگیں۔ چند لمحوں کے اندر
اندر ''گلزار'' کی الجھی ہوئی گتھی سلجھ گئی تھی۔ دراصل اس گفتگو کے دوران پرتھی پال کے
ہونٹوں سے ایک ایسا لفظ ادا ہوا تھا جس نے اس کیس کے سارے انجر پنجر ڈھیلے کر کے مجرم کو
چاروں شانے چت کر دیا تھا۔

میں نے اطمینان سے سگریٹ سلگایا اور جینی سے کہا۔ ''مس جین! آپ اطمینان سے
گھر جائیں۔ میرا خیال ہے میں آج شام تک اس معمے کو حل کرلوں گا۔ بلکہ ہوسکتا ہے میں
جب شام کو آپ کے پاس آؤں تو گلزار بھی برآمد ہو چکا ہو۔''

''او گاڈ۔'' وہ حیرانی سے بولی۔ ''اتنی جلدی؟......یہ کیسے ہوسکتا ہے؟''

''یہ ایسے ہی ہوگا۔'' میں نے اسے یقین دلایا پھر گھڑی دیکھتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔
''ویری ساری......مجھے ذرا جلدی نکلنا ہے۔'' اُس نے کتے کی زنجیر کھینچ کر اُسے جلدی سے
میرے راستے سے ہٹالیا۔ میں لمبے ڈگ بھرتا ہوا باہر صحن میں آگیا۔ جینی میرے پیچھے ہی نکل
آئی۔

☆======☆======☆

شام آٹھ بجے میں مسٹر الفریڈ کی کوٹھی میں اُن کے شاہانہ ڈرائنگ روم میں بیٹھا تھا۔
یوں لگتا تھا وکٹوریہ دور کے کسی محل میں آگیا ہوں۔ مسٹر الفریڈ خود گھر میں نہیں تھے۔ اُن کی
شوخ و شنگ بیٹی بڑی ادا سے میرے سامنے بیٹھی تھی۔

''ہاں کیا رپورٹ ہے مسٹر انسپکٹر۔ کچھ اتہ پتہ چلا؟''

''میں نے آپ سے جو وعدہ کیا تھا، وہ پورا کیا ہے۔''

''او مائی گاڈ'' جینی نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھا۔ ''کہاں ہے گول زار۔ ہم اُس کے
بارے میں بڑا اوری ہے۔ بڑا بے قرار تھا ہم۔ کہاں ہے گول زار۔ کس نے اغوا کیا تھا اُس
کو۔''

میں سگریٹ کا کش لے کر اطمینان سے کہا۔ ''تم نے مس جین......تم نے اغوا کیا تھا
اُسے اور پھر کالا شاہ کاکو کی فیکٹری میں اُس پر تشدد کر کے ختم کر ڈالا۔''

وہ حیرت سے منہ پھاڑے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ ''کک......کیا کہتا ہے انسپکٹر......

تمہارا برین تو خراب نہیں ہو گیا۔"

"میرا دماغ خراب نہیں ہے مس جین...... اور ابھی تمہارا دماغ بھی ٹھکانے پر آ جائے گا۔" میں نے سب انسپکٹر کو آواز دی۔ وہ ڈرائنگ روم سے باہر بیٹھا تھا۔ اندر آ کر اُس نے سلیوٹ کیا۔ میں نے کہا "جاؤ...... گاڑی سے چوکیدار کو لے آؤ۔"

وہ میرے کہنے سے پہلے ہی چوکیدار کو اندر لا چکا تھا۔ دروازہ کھول کر اُس نے چوکیدار کو ڈرائنگ روم میں داخل کر دیا۔ یہ کالا شاہ کاکو والی زیر تعمیر فیکٹری کا چوکیدار تھا۔ اس کا نام کیکر سنگھ تھا۔ تھانے میں کیکر سنگھ کے سارے کس بل نکل چکے تھے۔ اُس کے نچلے ہونٹ سے خون رس رہا تھا اور پیشانی پر بڑا سا گومڑ پڑا ہوا تھا۔

میں نے کہا۔ "ہاں کیکر سنگھ۔ سترہ اور اٹھارہ تاریخ کی درمیانی شب رات نو بجے کیا ہوا تھا؟"

کیکر سنگھ گلوگیر آواز میں بولا۔ "میم صاحبہ اپنی گاڑی میں ایک شخص کو لے کر آئی تھیں۔ ان کے ساتھ پریما بی بی بھی تھیں۔ میں اُس وقت نشے میں تھا۔ انہوں نے پہلے مجھے جھاڑیں پلائیں پھر پوچھا کہ پرتھی پال صاحب کہاں ہیں۔ میں نے کہا انہوں نے آنا تو تھا لیکن آئے نہیں سنا ہے پنڈی گئے ہوئے ہیں۔ میم صاحبہ غصے میں بڑبڑانے لگیں۔ پھر انہوں نے گیٹ کھلوایا اور گاڑی اندر لے گئیں۔ میں گیٹ پر بیٹھا رہا اور وہ گاڑی میں ساتھ آنے والے بندے کو لے کر مکان میں چلی گئیں۔ میرے اوپر نشہ زور مار رہا تھا۔ چارپائی پر بیٹھے بیٹھے میں پھر سو گیا۔ گہری نیند میں مجھے کبھی کبھی چیخوں کی آوازیں آتی رہیں۔ ان آوازوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ میم صاحبہ اُس شخص کی دھنائی کر رہی ہیں۔ ایسی مار پیٹ اس فیکٹری میں کوئی نئی بات نہیں تھی۔ کئی دفعہ ایسا ہوا تھا کہ پرتھی پال صاحب کسی بندے کو پکڑ کر یہاں لے آئے اور اس کی خوب مرمت بنائی۔

اُن کا ایک پارٹی سے کاروباری جھگڑا چل رہا ہے اور اس جھگڑے میں کئی بار مار پیٹ تک نوبت آ چکی ہے۔ میں نے سمجھا شاید یہ بھی کوئی ایسا ہی معاملہ ہے۔ پتہ نہیں کیا وقت تھا جب میم صاحبہ اور ان کی سہیلی گاڑی لے کر واپس چلی گئیں۔ جس شخص کو مارا پیٹا گیا تھا وہ مجھے گاڑی میں نظر نہیں آیا۔ ہو سکتا ہے وہ میم صاحبہ کے جانے سے پہلے ہی فیکٹری سے نکل گیا ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ پچھلی سیٹ پر لمبا پڑا ہو اور مجھے نظر نہ آیا ہو۔"

اس بیان کے بعد جینی سکتے کی حالت میں بیٹھی رہی۔ اُس کا رنگ ہمیشہ سے زیادہ سفید نظر آ رہا تھا۔ چند منٹ پہلے اُس کی آنکھوں میں ناچنے والی تمام تیزی طراری رخصت ہو چکی

تھی۔ میں نے کہا۔ "مس جین! اب تم سوچو گی کہ میں تم تک کیسے پہنچ گیا...... دراصل مجھے معلوم تھا کہ سترہ تاریخ کی صبح گلزار جس گاڑی میں بیٹھ کر گیا تھا وہ پرتھی پال کی ضرور تھی مگر اُسے پرتھی پال نہیں چلا رہا تھا۔ اُسے "سونا" نام کی کوئی لڑکی یا عورت چلا رہی تھی۔ اب مجھے معلوم نہیں تھا کہ سونا نامی یہ لڑکی یا عورت کون ہے۔ اس سے پہلے کہ میں اس بارے میں معلومات حاصل کرتا تم تھانے پہنچ گئیں اور مجھ سے کیس کے بارے میں بات چیت کرنے لگیں۔

تمہیں یاد ہو گا صبح ہونے والی اس بات چیت کے دوران ہی پرتھی پال کا فون آیا تھا اور یہ فون سننے کے فوراً بعد میں نے تمہارے سامنے دعویٰ کیا تھا کہ شام تک میں یہ معمہ حل کر لوں گا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مجھے "سونا" کا پتہ چل گیا تھا۔ سونا تمہارا ہی "نک نیم" ہے اور یہ "نک نیم" پرتھی پال نے رکھا ہوا ہے۔ وہ بے تکلفی سے تمہیں "سونا" کہتا اور لکھتا ہے۔ میرا خیال ہے اب پوری بات تمہاری سمجھ میں آ گئی ہو گی۔"

جینی نے ہونٹوں پر زبان پھیر کر ایک بہت گہری سانس لی اور بولی۔ "تم جو کچھ کہہ رہا ہے اس کا قیمت تم کو بہت زیادہ ادا کرنا پڑے گا۔ واچ مین (چوکیدار) کے بیان سے یہ بات کیسے ثابت ہوتا ہے کہ ہم نے گلزار کو اغوا کیا یا مارا ہے؟"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اس میں اب شک شبے کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہے مس جین شیلڈ...... تمہیں پتہ چل چکا تھا کہ گلزار رات کو کوٹھی پر آیا ہے اور اُس نے تمہارا نام لے کر ہنگامہ کیا ہے۔ یہ صورتِ حال تمہارے لیے کسی طرح بھی خوشگوار نہیں تھی۔ اتفاقاً اگلے روز صبح دس بجے ہی تمہیں اپنے بیوقوف عاشق سے نپٹنے کا موقع مل گیا۔

تمہیں اپنی ایک دوست کو سی آف کرنے ہوائی اڈے جانا تھا۔ تم شرارت کے طور پر اپنے منگیتر پرتھی کی گاڑی لے گئیں۔ اس واقعے کا ذکر پرتھی نے اپنی ڈائری میں کیا ہے اور یہ ڈائری اس وقت بھی میرے پاس موجود ہے۔ تم گاڑی لے کر گیٹ سے باہر نکلیں تو گلزار نے آگے بڑھ کر تمہارا راستہ روک لیا اور تم سے باتیں کرنے لگا۔ وہ تمہارے عشق میں نیم دیوانہ ہو رہا تھا اُسے پتہ نہیں تھا کہ وہ کس پتھر سے سر پھوڑ رہا ہے، تم ایک ایسی عورت ہو جو مرد کے سینے پر اپنا حسین پاؤں رکھ کر گزرتی ہے اور پھر کبھی مڑ کر نہیں دیکھتی۔ تمہیں گلزار کے والہانہ پن سے زبردست خطرہ محسوس ہوا۔ اُس کی بے وقوفی اور ہٹ دھرمی کی سزا دینے کے لیے تم نے اُسے گاڑی میں بٹھایا اور اپنی سہیلی پریما کے فلیٹ میں لے گئیں۔ تم نے اُسے شام تک وہیں رکھا۔ شام کو پریما اور تم نے اُسے گاڑی میں بٹھایا اور کالا شاہ کاکو والی فیکٹری جا

پہنچیں...... وہاں تم دونوں نے مل کر پہلے اُسے ظالمانہ تشدد کا نشانہ بنایا اور پھر مار کر زمین پر گاڑ دیا۔''

جینی نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھاما اور چیخ پڑی۔ ''نہیں...... نہیں...... یو آر رانگ...... یہ بالکل غلط ہے۔ ہم نے ایسا کچھ نہیں کیا...... کچھ بھی نہیں کیا۔ تم یہاں سے چلے جاؤ...... آئی سے گیٹ آؤٹ۔'' اُس پر جیسے اچانک ہی ہسٹریا کا دورہ پڑ گیا تھا۔ چہرہ اپنے بازوؤں میں چھپا کر وہ ہچکیوں سے رونے لگی۔

میں نے کہا۔ ''مس جین! تمہارے ماننے یا نہ ماننے سے اب کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تم نے جرم کیا ہے اور یہ جرم عدالت میں ثابت ہو کر رہے گا...... میں تمہیں اقبالِ جرم کا ایک موقع دے رہا ہوں۔ سارے معاملے پر ٹھنڈے دل سے غور کرو اور فیصلہ کرو کہ تمہیں اپنا جرم چھپانا چاہیے یا نہیں...... خدا حافظ۔'' اس کے ساتھ ہی میں چوکیدار کیکر سنگھ کو لے کر ڈرائنگ روم سے باہر آ گیا۔

☆======☆======☆

منظر تھانے کا تھا۔ میں انسپکٹر ناتھا سنگھ کے ساتھ اُسی کے کمرے میں بیٹھا تھا۔ ناتھا سنگھ نے اپنی بھوری ڈاڑھی کو کھجاتے ہوئے کہا۔ ''کیا واقعی مس جین گلزار کو ٹھکانے لگا چکی ہے؟''

میں نے سگریٹ کا گہرا کش لیتے ہوئے کہا۔ ''یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ صرف ایک بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ سترہ مارچ کی صبح گلزار جس کے ساتھ گاڑی میں سوار ہو کر گیا تھا وہ مس جین تھی۔ اب وہ اُسے کہاں لے کر گئی۔ اُس کا کیا کیا اور اب وہ کہاں ہے یہ سب کچھ فی الحال تاریکی میں ہے۔''

ناتھا سنگھ بولا۔ ''لیکن تم نے تو بڑے دعوے کے ساتھ جین پر قتل کا الزام لگا دیا ہے۔''

''صرف اُسے بھڑکانے کے لیے...... تاکہ وہ سچ بول دے۔ میں نے......''

ابھی میری بات منہ ہی میں تھی کہ سنتری نے اندر آ کر کھٹاک سے سیلوٹ کیا اور اطلاع دی کہ میم صاحبہ مجھ سے ملنا چاہتی ہیں۔ چند لمحے بعد مس جین اندر آئی۔ آج خوفناک صورت والا بلڈاگ کتا اُس کے ساتھ نہیں تھا۔ وہ خود بھی بڑی خاموش اور آزردہ سی دکھائی دے رہی تھی۔ گردن جھکا کر میرے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی۔ میں نے معنی خیز انداز میں ناتھا سنگھ کو باہر جانے کا اشارہ کیا۔ ناتھا سنگھ چلا گیا تو وہ گلوگیر آواز میں بولی۔ ''ہم تم سے اکیلے میں بات کرنا مانگتا۔''

میں نے کہا۔ ''تم جو کچھ کہنا چاہو، یہاں پوری تسلی سے کہہ سکتی ہو۔''

اُس نے اپنا خوبصورت رومال ناک پر رکھ کر سوں سوں کی آواز نکالی اور بولی۔ ''انسپکٹر صاحب! تم ٹھیک کہتا ہے سترہ تاریخ کو گلزار ہمارے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر گیا تھا لیکن گاڈ جانتا ہے ہم نے اُس کو کوئی تکلیف نہیں دیا۔ اُس کو انگلی تک نہیں لگایا۔ وہ...... وہ اس وقت زندہ سلامت ہمارے پاس موجود ہے...... ہمارا مہمان ہے وہ۔''

گلزار کے زندہ ہونے کی اطلاع میرے لیے خوش کن تھی۔ اُس کی بوڑھی والدہ اور بہنوں کے چہرے میری نگاہوں میں گھوم گئے...... اور یہ امید پیدا ہو گئی کہ میں ڈلہوزی واپس جا کر اُن کے سامنے سرخرو ہو سکوں گا۔ میں نے مس جین سے پوچھا کہ وہ کہاں ہے؟ وہ بولی۔ ''پریما کے فلیٹ میں ہی ہے۔ پریما نے ایک کمرہ اس کو دے رکھا ہے اور وہاں وہ بڑے سکون سے رہ رہا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''اگر میں تمہاری بات مان لوں تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ تم نے اُسے یوں منظر سے غائب کیوں کیا؟''

میرے اس سوال پر جینی کی حسین آنکھوں میں ایک دم آنسو امڈ آئے۔ وہ روتے ہوئے بولی۔ ''اس لیے کہ ہم اُس سے سچ مچ محبت کرنے لگا تھا...... ہم بہت برا گرل ہے انسپکٹر ہم مرد کو کھلونا سمجھتا تھا۔ کسی اجنبی مرد کے ساتھ وقت گزارتا تھا۔ اُسے سرپرائز دیتا تھا اور حیران و پریشان چھوڑ کر آگے بڑھ جاتا تھا۔ پھر گاڈ نے ہمیں ہمارے کیے کا سزا دیا۔ ہمیں ایک ایسا مرد ملا جس نے الٹا ہم کو سرپرائز دیا اور ہمیں حیران و پریشان کر دیا۔ وہ مرد گول زار (گلزار) ہے انسپکٹر۔ آج ہم تم کو سب کچھ سچ سچ بتائیں گا۔ گلزار ایک معمولی شخص تھا۔ مگر معلوم نہیں اُس میں کیا بات تھی ہم ایک بار اُس سے مل کر پھر بھول نہ سکا۔ دن رات اُس کا خوبصورت فیس ہماری نگاہوں میں رہا۔

ڈلہوزی سے واپس آ کر ہم دن رات اُس سے ملنے کو ترستا رہا اور ساتھ ساتھ اپنے دل کو سمجھاتا رہا کہ وہ یہ نادانی نہ کرے...... ہم جانتا تھا کہ پرتھی پال جیسا کروڑ پتی شخص ہم سے شادی بنانا چاہتا ہے اور یہ شادی ضرور ہونی ہے...... پھر ہم کیوں ایک فلش لڑکی کی طرح سوچ رہا ہے۔ ہم اپنے دل کو سمجھانے کی بہت کوشش کرتا رہا اور اس میں بہت حد تک کامیاب بھی ہو گیا۔

لیکن پھر ایک دن اچانک گلزار پھر ہمارے سامنے آن کھڑا ہوا۔ ہم کو مالوم ہوا کہ اُس نے ہماری خاطر کوٹھی کے گیٹ پر جھگڑا کیا ہے اور چوکیدار مہابت خان نے اُسے بری طرح مارا ہے اور ذلیل کر کے نکال دیا ہے۔ ہم گلزار کی مصیبت پر تڑپ اٹھا۔ ہم بہت ورّی تھا۔ ہم

کو پرتھی پال کی نیچر (خصلت) کا بھی معلوم تھا۔ ہم کو معلوم تھا وہ گلزار سے بہت بری طرح پیش آئے گا اور یہ بھی کوئی بڑا بات نہیں کہ اُس کا دماغ ٹھکانے لگاتے لگاتے اُسے جان سے ہی مار ڈالے۔ وہ بہت ہی سخت آدمی ہے۔ ہمارا فکرمندی بڑھتا جا رہا تھا، پھر گاڈ نے ہمارا مدد کیا۔ ہم صبح ایئرپورٹ جانے کے لیے پرتھی پال کی گاڑی لے کر نکلا تو تھوڑا آگے جا کر گلزار نے ہمارا راستہ روک لیا۔ ہم نے اُسے اپنے ساتھ سوار کیا اور پریما کے فلیٹ پر لے گئے...... ہم نے اُسے فلیٹ میں ہی رکھا اور اب تک وہ وہیں ہے......''

مس جین کی روداد حیران کن تھی۔ وہ عجیب و غریب لڑکی تھی اور اُس نے عجیب و غریب کام کیا تھا۔ شاید وہ ٹھیک کہہ رہی تھی کہ قدرت نے اُسے سزا دی ہے اور وہ ایک ایسے شخص کی محبت میں گرفتار ہو گئی ہے جس سے محبت کرنے کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔

میں نے اُس سے پوچھا۔ ''اگر تمہاری یہ ساری باتیں درست ہیں تو پھر چوکیدار کیکر سنگھ کا بیان کس خانے میں فٹ ہوتا ہے؟ کیا تم اُس رات کسی شخص کے ساتھ فیکٹری میں نہیں گئی تھیں؟''

وہ بولی۔ ''ہاں...... ہم گیا تھا لیکن ہمارے ساتھ اُس وقت گلزار نہیں چوکیدار مہابت خان تھا۔ وہی مہابت خان جس نے ایک روز پہلے گلزار کو مارا پیٹا تھا اور ذلیل کیا تھا۔ یہ بڑا بدبخت چوکیدار ہے۔ اس نے ڈلہوزی میں بھی ایک مزدور کو بہت مارا تھا اور اس کا کپڑا اپھاڑ کر اُس کا مرغا بنا دیا تھا۔ ہم کو اس بدبخت پر بہت غصہ تھا۔ ہم اور پریما اس کو گاڑی میں ڈال کر فیکٹری لے گیا۔ ہمارا ارادہ اُسے پرتھی پال کے حوالے کرنے کا تھا لیکن وہ فیکٹری میں نہیں تھا۔ ہم نے خود ہی مہابت خان کا مرمت کیا اور جب اُس کی حالت بہت برا ہو گیا تو اُسے ایک انڈرویئر میں فیکٹری سے بھگا دیا...... ہم نے کسی کا مرڈر نہیں کیا انسپکٹر اور نہ ہی ہم ایسا کر سکتا ہے۔'' وہ ایک بار پھر سسکنے لگی۔

مس جین کی نشاندہی پر گلزار کو پریما کے فلیٹ سے برآمد کر لیا گیا۔ وہ ہشاش بشاش اور صحت مند تھا۔ اس ڈیڑھ مہینے کے عرصے میں اُسے نہ صرف لباس پہننے کا سلیقہ آ گیا تھا بلکہ وہ اپنی گفتگو میں کہیں کہیں انگریزی کے لفظ بھی ٹھونک دیتا تھا۔

اُس نے تھانے میں آ کر اپنا جو طویل بیان قلمبند کرایا اس میں واضح طور پر کہا کہ وہ کسی کی حبس بے جا میں نہیں تھا۔ اس نے علیحدگی میں مجھے جو باتیں بتائیں وہ خاصی اہم تھیں۔ اُس نے انکشاف کیا کہ میم صاحبہ اور ان کے منگیتر پرتھی پال کے تعلقات کئی ماہ سے خراب تھے اور اب وہ مزید خراب ہو گئے ہیں۔ پرتھی پال کی نظر میم صاحبہ کی دولت و جائیداد پر تھی اور

وہ ہر صورت یہ دونوں چیزیں حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اپنے اس لالچ میں وہ کسی کی جان لے سکتا ہے اور اپنی جان دے بھی سکتا ہے۔ (یہی خوف تھا جس کے سبب مس جین نے گلزار کو موقعے سے غائب کر دیا تھا اور بعد میں پرتھی پال سے جان چھڑانے کے لیے میری تفتیش کا رخ پرتھی کی طرف موڑنے کی کوشش کی تھی) میرے ساتھ اپنی بات چیت میں گلزار نے جو سب سے بڑا اور دھماکہ خیز انکشاف کیا وہ یہ تھا کہ مس جین اُس سے شادی کرنا چاہتی ہے۔

میں فوری طور پر اس بات پر یقین نہیں کر سکا۔ کوئی ہوش مند بھی نہیں کر سکتا تھا۔ کہاں ایکسٹرا ماڈرن جین اور کہاں دس جماعتیں پاس گلزار۔ کوئی جوڑ کوئی جواز ہی نہیں تھا لیکن ایک بات میں بھول رہا تھا اور ہم سب بھول رہے تھے۔ یہ بات کسی عام لڑکی نے نہیں کہی تھی۔ مسٹر الفریڈ کی بیٹی نے کہی تھی۔ وہ بیٹی جس نے آج تک جو کام کیا تھا عجیب کیا تھا۔ شاید اُس کی زندگی کا مقصد ہی دوسروں کو حیران اور ششدر کرنا تھا۔ وہ انوکھی تھی اور اُس کے ہر کام میں انوکھا پن تھا...... اور پھر ایک روز وہ اپنی زندگی کا سب سے انوکھا کام بھی کر گئی۔ وہ ''سبز پری'' جس کے لیے لکھ پتی نوجوانوں کے رشتے قطار باندھے کھڑے تھے اس نے ڈلہوزی کے ایک مقامی نوجوان سے کورٹ میرج کی اور اُسی کاٹج میں جا کر آباد ہو گئی جہاں سے اُس کی انوکھی محبت کا آغاز ہوا تھا۔

میں اُسی کاٹج کے پچھواڑے میں رہتا تھا اور گلزار کی شادی کے بعد بھی قریباً ایک سال رہا لیکن شادی کے بعد میں نے مس جین کو کبھی نہیں دیکھا۔ وہ سات پردوں میں رہتی تھی۔ اُس نے ماضی سے ہر ناطہ توڑ لیا تھا۔ نہ کسی سے ملتی تھی نہ کوئی اُس سے ملنے آتا تھا۔ صرف مسٹر الفریڈ کی ''چھ گز'' لمبی کار کبھی کبھی کاٹج کے دروازے پر کھڑی نظر آتی تھی۔ وہ بھی جس طرح خاموشی سے آتے تھے اُسی طرح خاموشی سے چلے جاتے تھے۔ مس جین نے اپنا مذہب تبدیل نہیں کیا تھا لیکن ذہنی طور پر وہ بالکل بدل چکی تھی اور گلزار بتاتا تھا کہ اتوار کو اپنی عبادت کرنے کی بجائے وہ نماز پڑھتی ہے۔ گلزار اُس سے بہت خوش تھا اور اُسے پختہ یقین تھا کہ ایک روز وہ اپنی رضا و رغبت سے کلمہ بھی پڑھ لے گی۔

مجھے ڈر تھا کہ کہیں گلزار کی یہ خوشیاں عارضی ثابت نہ ہوں...... یہ نہ ہو کہ امیرزادی کی آنکھوں سے وقتی محبت کی پٹی اُترے اور وہ چیخ مار کر اپنی دنیا میں لوٹ جائے۔ مگر میرے یہ تمام اندیشے اور اندازے الٹ ثابت ہوئے۔ گزرنے والے وقت کے ساتھ جین خود کو نئے ماحول میں ڈھالتی چلی گئی۔

پہلے وہ گلزار کے گھر والوں سے علیحدہ رہنا چاہتی تھی پھر اُس نے انہیں بھی ڈلہوزی میں

بلا لیا۔ گلزار نے بتایا کہ اُس نے مغربی لباس بالکل چھوڑ دیا ہے اور مقامی رواج کے مطابق کپڑے پہنتی ہے۔ پھر گلزار کا پہلا بچہ پیدا ہوا تو اس کا نام جینی نے اپنی مرضی سے رحمان رکھا۔ یہ درحقیقت اسلام کی طرف اُس کا سفر تھا۔ آخر ایک روز یہ سفر مکمل ہوا۔ شام کا وقت تھا......گلزار بھاگتا ہوا تھانے میں داخل ہوا۔ اُس نے مجھے بے تکلفی سے بازوؤں میں بھینچ لیا اور لرزتی سرگوشی میں بولا۔ ''لالہ......لالہ جینی مسلمان ہوگئی ہے۔''

بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے

سچ کہا ہے کسی نے کہ برا شخص جب دل کی گہرائی سے اچھا بنتا ہے تو اچھوں کو پیچھے چھوڑ دیتا ہے۔

☆======☆======☆

صغراں

زیادہ سے زیادہ دولت کے حصول کی ہر انسان کو خواہش ہوتی ہے۔ کچھ لوگ اس خواہش کو پورا کرنے کے لیے ہر حد سے گزر جاتے ہیں۔ ایسے دو دولت مندوں کی ہوسِ زر کی کہانی جو ایک غریب کو اچانک مل جانے والی دولت اس سے ہتھیانا چاہتے تھے۔ اس کشمکش سے ایک جذبات کو ہلا دینے والی کہانی نے جنم لیا۔

لاش بالکل سیدھی پڑی تھی۔ سینے پر دو زخم تھے۔ ایک گردن کے قریب ہنسلی کے جوڑ
میں، دوسرا دل سے ذرا نیچے۔ یہ کافی گہرا زخم تھا اور کسی بھی تنومند شخص کی جان لے سکتا تھا
لیکن یہ زخم لگا کر بھی قاتل کی تسلی نہیں ہوئی تھی اور اُس نے مقتول کے بال مٹھی میں جکڑ کر اُس
کی شہ رگ کاٹ دی تھی۔ فرش پر نیلی دری بچھی ہوئی تھی۔ اس پر جہاں خون کے بہت سے
دھبے تھے وہاں مقتول کے سر کے کچھ سفیدی مائل بال بھی بکھرے ہوئے تھے۔ یہ واردات
امرتسر کے ایک مضافاتی قصبے ڈھاب نہال سنگھ میں ہوئی۔ قصبے کا نام کافی طویل تھا اس لیے
لوگ اسے صرف ''ڈھاب'' ہی کہتے تھے۔ ڈھاب امرتسر سے قریباً تیس میل کے فاصلے پر
تھا۔ یہاں سے ایک کچی سڑک گزرتی تھی۔ قصبے کا چوہدری شام سنگھ کافی خوشحال شخص تھا۔
اردگرد کے دیہات میں اُس کی دوستیاں بھی بہت تھیں اور دشمنیاں بھی۔ ہلاک ہونے والے
شخص کا شام سنگھ سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس شخص کا نام نرنجن سنگھ تھا۔ عمر قریباً پینتیس برس تھی۔
کچھ عرصہ پہلے تک نرنجن سنگھ قصبے میں معمولی دکان کرتا تھا لیکن پھر اچانک اُس کے پاس پیسے
آ گئے۔ اُس نے نہ صرف چھوٹی سی حویلی خرید لی بلکہ اُسے ٹھیک ٹھاک طرح سجا بنا بھی لیا۔
اب وہ پچھلے پانچ چھ مہینے سے اپنے اس نئے مکان میں رہتا تھا اور شہر جا کر آڑھت بھی کرتا
تھا۔ یہ بھی پتہ چلا کہ تین مہینے پہلے اُس نے اپنی اکلوتی بیٹی کی شادی بڑے ٹھاٹ باٹ سے کی
تھی۔

نرنجن کا قتل اُس کے نئے مکان میں ہی ہوا تھا۔ اُس کے دو بیٹے تھے اور دونوں علیحدہ
رہتے تھے۔ باپ سے اُن کا ملنا جلنا نہیں تھا اور باپ کے پاس پیسہ آنے کے بعد بھی وہ اُس
سے دور ہی رہے تھے۔ بیوی تین سال پہلے مر چکی تھی۔ ایک بیٹی تھی جسے نرنجن نے بیاہ دیا تھا۔
اب وہ گھر میں اکیلا ہی رہتا تھا۔ گھر کا کام کاج پہلے تو بیٹی کرتی تھی اب اس نے ایک نوکرانی

رکھی ہوئی تھی۔ وہ دوپہر کے بعد نرنجن کے گھر آتی تھی۔ اس وقت نرنجن عموماً کام پر ہوتا تھا۔
نوکرانی صغراں جھاڑ پونچھ کرتی تھی، کپڑے دھوتی تھی اور نرنجن کا کھانا وغیرہ پکا کر اور گھر کو تالا
لگا کر واپس چلی جاتی تھی۔ اس تالے کی دو چابیاں تھیں ایک نرنجن کے پاس اور دوسری صغراں
کے پاس رہتی تھی۔

قتل کے روز بھی حسبِ معمول صغراں نرنجن کا کھانا وغیرہ پکا کر چلی گئی تھی۔ رات کو کسی
وقت نرنجن آیا اور پیٹ پوجا کر کے سو گیا۔ صبح سویرے ساتھ والے گاؤں سے ایک شخص اُسے
ملنے آیا۔ وہ کافی دیر دروازہ کھٹکھٹاتا رہا۔ نرنجن کو آوازیں دیتا رہا لیکن اندر خاموشی کے سوا اور
کچھ نہیں تھا۔ آخر ایک پڑوسی چھت پر سے نرنجن کے گھر میں گھسا اور اُس نے نرنجن کی خون
میں لت پت لاش دریافت کی۔

میں نے بڑی احتیاط سے جائے وقوعہ کا معائنہ کیا۔ کمرے میں دھینگا مُشتی کے آثار
بالکل صاف نظر آتے تھے۔ دو یا دو سے زیادہ افراد میں زبردست کھینچا تانی ہوئی تھی۔ کئی
چیزیں اِدھر اُدھر بکھری ہوئی تھیں۔ ان میں ریزگاری بھی تھی، جو قاتل یا مقتول کی جیبوں سے
نکل کر فرش پر بکھر گئی تھی۔ میں نے ضروری شہادتیں اکٹھی کرنے کے بعد لاش پوسٹ مارٹم
کے لیے اٹھوا دی اور گواہوں کے بیان قلمبند کرنے میں مصروف ہو گیا۔

سب سے پہلے پڑوسی چانن دین کا بیان لیا گیا۔ اُس نے دعویٰ کیا کہ رات کے کسی
حصے میں اُن کے گھر کے کسی فرد کو کوئی آواز وغیرہ سنائی نہیں دی۔ اُس نے بتایا کہ نوکرانی
صغراں روز کی طرح آئی تھی اور کام کر کے چلی گئی تھی۔ اس کے بعد نرنجن کے سوا اور کوئی گھر
میں نہیں آیا۔ اگر رات نو بجے کے بعد آیا ہو تو وہ کچھ کہہ نہیں سکتے۔ چانن دین کی باتوں سے
معلوم ہوا کہ مقتول نرنجن بیٹی کے بوجھ سے فارغ ہو کر اپنی شادی کرنے کا ارادہ رکھتا تھا اور
اُس نے ایک دو بندوں کو کہہ بھی رکھا تھا کہ وہ اُس کے لیے کوئی مناسب رشتہ ڈھونڈیں۔ یہ
بڑا اہم نکتہ تھا۔ میں نے اس بارے چانن دین سے کرید کرید کر سوال پوچھے۔ ان سوالوں کے
جواب میں پتہ چلا کہ نرنجن کے دونوں بیٹے باپ سے صلح کرنا چاہتے تھے لیکن وہ جان بوجھ کر
ان سے صلح نہیں کرتا تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ بیٹے اُس کی دولت پر رال ٹپکا رہے ہیں۔ وہ کہتا
تھا کہ اگر واہگرو نے مجھے دیا ہے تو میں اُسے اپنی ذات پر خرچ کروں گا۔ آخری عمر میں وہ
بیٹوں اور بہوؤں کا محتاج نہیں ہونا چاہتا تھا اس لیے گھر بسانے کے لیے رشتہ ڈھونڈ رہا تھا۔
بیٹے اور خاص طور پر بڑا بیٹا اس شادی کے خلاف تھا۔ وہ ایک دو مرتبہ باپ کے گھر آ کر اُس
سے لڑ بھی چکا تھا۔ میں نے چانن دین سے ایک اور اہم سوال پوچھا۔ میں نے کہا۔ ''چانن! تم

نے ابھی بتایا ہے کہ چھ مہینے پہلے تک نرنجن قصبے میں کریانے کی دکان کرتا تھا۔ پھر واہگرو نے اُسے پیسہ دیا اور وہ ٹھاٹ باٹ سے رہنے لگا۔ واہگرو چھپڑ پھاڑ کر تو نہیں دیتا، آخر کوئی حیلہ بہانہ ہوتا ہے...... نرنجن اس بارے میں کیا کہتا تھا؟''

جانن بولا۔ ''وہ تو شروع سے یہی کہتا رہا ہے جی کہ شہر میں اُس نے آڑھت سے نفع کمایا ہے۔ چائے کی کھلی پتی کا کوئی زبردست سودا مار لیا تھا اُس نے۔ دو دن بعد چائے کا بھاؤ آسمان پر چڑھ گیا۔ ایک ہی دن میں نرنجن نے ہزاروں کما لیے۔''

میں نے کہا۔ ''یہ تو نرنجن کا بیان ہوا۔ کیا اس بیان پر تمہیں اور قصبے والوں کو بھی یقین ہے؟''

جانن دین گڑبڑا سا گیا۔ قریب بیٹھا ایک محلے دار بولا۔ ''تھانیدار صیب سچی بات یہ ہے کہ اس بارے میں کسی کو بھی ٹھیک طرح پتہ نہیں۔ کوئی کہتا ہے نرنجن نے چائے میں نفع کمایا ہے، کوئی کہتا ہے اُس نے امرتسر میں جواء کھیلا ہے اور کچھ کا خیال ہے کہ اُسے کوئی گھڑا شڑا ملا ہے۔''

''گھڑا ملنے'' سے مطلب اُن دنوں یہ لیا جاتا تھا کہ کسی کو زمین میں دبائے ہوئے پیسے یا زیورات وغیرہ ملے ہیں۔ اُن دنوں آج کی طرح بینک اور فنانس کے ادارے تو تھے نہیں اور دیہات میں تو کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایک چھوٹی سی پرچی کے بدلے کسی کو اپنی پونجی دی جا سکتی ہے۔ اور بعض لوگ تو ایسے بھی ہوتے تھے کہ بیوی بچوں کو بھی اپنی جمع پونجی سے بے خبر رکھتے تھے۔ زیادہ تر چاندی کے روپے اور اشرفیاں وغیرہ ہوتی تھیں۔ انہیں گھڑے میں بند کر کے گھر میں یا گھر سے باہر کہیں چھپا دیا جاتا تھا۔ کئی دفعہ ایسا ہوتا تھا کہ چھپانے والا مر جاتا اور یہ دولت کسی کے کام نہ آتی...... یا پھر مدتوں بعد کسی اجنبی کے کام آ جاتی۔ قصبے میں بھی یہ ہوا سی اُڑی ہوئی تھی کہ نرنجن کو کہیں سے کوئی گھڑا مل گیا ہے۔

میرا دھیان رہ رہ کر نوکرانی صغراں کی طرف جا رہا تھا۔ اُس سے ابھی تک ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ شام کو ضروری کارروائی سے فارغ ہونے کے بعد میں نے بلال شاہ سے کہا کہ ''صغراں اور اُس کے خاوند کو ذرا خاموشی کے ساتھ تھانے لے آئے۔''

میری بات سن کر بلال شاہ بولا۔ ''آپ نے میرے دل کی بات کی ہے جی...... یہ صغراں نامی لڑکی کچھ مشکوک سی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''ابھی تمہیں یہاں آئے جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے ہیں اور لوگوں کے گھروں میں جھانکنا شروع کر دیا ہے تم نے۔''

بولا۔ ''خان صاحب! چم کسی کو پیارا نہیں ہوتا۔ سب کو کم ہی پیارا ہوتا ہے۔ لوگوں کی ٹوہ رکھنا میرا کام ہے۔ کام نہ کروں گا تو چوتھے دن ہی آپ لال جھنڈی دکھا دیں گے۔''

''اچھا...... اچھا چلو بتاؤ کیا شک ہے تمہیں؟'' میں نے اُس کی لمبی چوڑی تقریر سے ڈر کر کہا۔

وہ بولا۔ ''کچھ لوگ کہتے ہیں جی کہ نرنجن کے ساتھ صغراں کا کوئی ٹانکا تھا۔ نرنجن، صغراں اور اُس کے خاوند پر بڑا مہربان تھا۔ صغراں نت نئے کپڑے پہنتی تھی اور نرنجن کے گھر میں اُسے کھانے پینے کی کھلی چھٹی تھی۔''

میں نے بلال سے پوچھا۔ ''یہ صغراں شکل وصورت سے کیسی ہے؟''

وہ بولا۔ ''شکل وصورت تو میں نے ابھی نہیں دیکھی، بس اُس کی باتیں ہی سنی ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''کیا زبردست مخبری کر رہے ہو۔ بندے کو ابھی دیکھا نہیں اور شک پہلے ہو گیا اُس پر...... چلو جاؤ...... لے کر آؤ میاں بیوی کو یہاں۔''

بلال شاہ گیا اور آدھ پون گھنٹے میں دونوں کو لے آیا۔ صغراں کی عمر بائیس تیئس سال تھی۔ اس نے ڈیڑھ سال کا ایک گورا چٹا بچہ گود میں اٹھا رکھا تھا۔ وہ خود بھی خوبصورت تھی۔ یہ اور بات ہے کہ غریبی اور بھوک ننگ نے اس خوبصورتی کا ستیاناس کر رکھا تھا۔ اُس کا لباس بوسیدہ تھا اور دوپٹے میں بڑے بڑے سوراخ نظر آ رہے تھے۔ کچھ ایسا ہی حال اُس کے خاوند کا بھی تھا۔ اُس کے ایک بازو پر بڑی سی پٹی بندھی ہوئی تھی۔ وہ دونوں سخت خوفزدہ تھے۔ میں نے انہیں بیٹھنے کا حکم دیا۔ لرزتی کانپتی ٹانگوں سے وہ کرسیوں پر ڈھیر ہو گئے۔ صغراں کے خاوند کا نام عزیز تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

''تمہارے ہاتھ میں چوٹ کیسی ہے؟''

کہنے لگا۔ ''خراد مشین میں آ گیا تھا جی...... چار جگہ سے ہڈی ٹوٹ گئی ہے۔ دو تین اپریشن ہو چکے ہیں، پر ابھی تک پوری طرح ٹھیک نہیں ہوا بازو۔''

''اپنا خراد ہے تمہارا؟''

''نہیں جناب۔ ملازمت کرتا ہوں، بیس روپے مہینہ پر۔''

''مالک نے علاج نہیں کروایا تمہارا؟''

''نہیں جناب۔'' جواب دیتے دیتے اُس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

''اکیلے رہتے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''پہلے تو اکیلا نہیں تھا جی...... لیکن شادی کے بعد اکیلا ہونا پڑا۔ میں نے...... میں نے

اپنی مرضی کی شادی کی تھی۔ ابا اس بات پر سخت ناراض تھا۔ اُس نے کہا کہ میں تمہیں زہر سے عاق کردوں گا۔ اِدھر میں نے نکاح پڑھوایا اُدھر اس نے مجھے عاق کر دیا۔ پر بندہ ہمت کرے جی تو سب کچھ کر لیتا ہے۔ میں نے اِدھر اُدھر سے قرض لے کر دو خراد مشینیں لگا لیں اور دو کاریگر رکھ کر کام شروع کر دیا۔ اللہ نے برکت دی۔ چار سال میں میری پانچ مشینیں ہوگئیں اور میں نے کارخانے کی جگہ بھی خرید لی۔ اللہ کا دیا سب کچھ تھا۔ چھوٹا سا گھر تھا، بچے تھے، زندگی کی ساری لوڑیں پوری ہو رہی تھیں۔ پھر جی ایک دم بُرے دن آ گئے۔ میرے سب سے چھوٹے بیٹے کی گردن میں پھوڑا ہو گیا۔ حکیموں جراحوں نے کہا کہ یہ گھمبیر ہے۔ بہت علاج کرایا۔ امرتسر اور لاہور تک گئے۔ پانی کی طرح پیسہ بہایا لیکن کچھ فرق نہیں پڑا۔ دس ماہ کا ہو کر وہ بچہ فوت ہو گیا۔ اُس کی بیماری نے ہمیں ادھ مواء کر ڈالا تھا۔ کاروبار بھی ٹھپ ہو کر رہ گیا تھا۔ اوپر سے قرضے سر چڑھ گئے تھے، مجھے اپنی مشینیں بیچنی پڑیں۔ پھر کارخانے کی چار مرلے کی زمین بھی بیچنی پڑی۔ پھر یہ وقت آیا کہ مجھے اپنے ہی کارخانے میں بیس روپے مہینے کی نوکری کرنی پڑی۔ زندگی کی گاڑی جیسے تیسے چل رہی تھی شاید میں اسی طرح چلاتا رہتا لیکن پھر میرا بازو مشین میں آ گیا۔ نہ صرف ملازمت گئی بلکہ علاج معالجے پر بھی خرچا ہونے لگا۔ تین چار مہینے میں ہم نے گھر کے برتن بیچنے شروع کر دیئے۔ جب گھر میں فاقے پڑنے لگے تو مجبوراً میری بیوی کو لوگوں کے ہاں کام کرنا پڑا......'' اپنی روئداد سناتے سناتے عزیز کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں اور اس کی بیوی بھی ناک سے سوں سوں کی آوازیں نکالنے لگی۔

پولیس کے سامنے پیش ہونے والے لوگ اپنی مجبوری اور تنگی ترشی کی کہانیاں سنایا ہی کرتے ہیں۔ اگر ہر ایک پر رحم کھانا شروع کر دیا جائے تو کبھی کسی واردات کا مجرم نہ پکڑا جائے۔ عزیز نے اپنی بے پناہ غریبی کی کہانی سنائی تھی۔ دوسرے لفظوں میں وہ بے پناہ ضرورت مند تھا۔ اور کسی بندے کی ضرورت جتنی بڑی ہوتی ہے اس کے مجرم بننے کا امکان بھی اتنا ہی زیادہ ہوتا ہے۔ صغراں اونچی لمبی ٹھیک ٹھاک رنگ روپ کی مالک تھی۔ اگر تنگ دستی اور مصیبت کے سائے نہ ہوتے تو وہ جگمگ کرتی نظر آتی۔ کوئی بھی ضرورت مند مرد اُسے دیکھ کر ڈانواں ڈول ہو سکتا تھا اور نرنجن سنگھ بھی ضرورت مند تھا۔ چند سال پہلے اُس کی بیوی فوت ہو چکی تھی۔ وہ گھر میں اکیلا رہتا تھا اور صغراں وہاں کام کاج کرتی تھی۔ ممکن تھا لوگ جو باتیں بنا رہے تھے اُن میں سچائی ہو۔ دوسری طرف عزیز بھی مجھے شکل و صورت سے غیرت مند غصے والا دکھائی دے رہا تھا۔ وہ چوڑی چھاتی والا اونچا لمبا مرد تھا۔ ایک ہاتھ سے بھی کسی کی گردن دبوچ لیتا تو اُس کے لیے ہلنا مشکل ہو جاتا۔ اُس کی باتوں سے مجھے اندازہ ہو چکا تھا

کہ وہ بیوی سے کام کاج کرانے پر راضی نہیں تھا۔ اُس نے آخری وقت تک کوشش کی تھی کہ کسی طرح حالات سنبھل جائیں اور وہ اس بے عزتی سے بچ جائے لیکن وہ جو کہتے ہیں کہ الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا۔ ہونی ہو کر رہی تھی اور عزیز کو زہر کا یہ گھونٹ بھرنا ہی پڑا تھا۔

میں نے عزیز سے کہا کہ میں اس کی بیوی سے اکیلے میں دو باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ اُس کے چہرے پر رنگ سا آ کر گزر گیا۔ میری یہ بات اُسے پسند نہیں آئی تھی لیکن انکار بھی کیسے کرتا۔ یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ ایک جیتا جاگتا انسان قتل ہوا تھا۔ اس جرم میں کوئی شخص بھی پھانسی چڑھ سکتا تھا۔ میں نے اُسے تیز نظروں سے دیکھا تو وہ ہونٹ کاٹتا ہوا باہر نکل گیا۔

صغراں نے اب دوپٹے سے منہ ڈھانپ لیا۔ صرف آنکھیں اور ناک کا کچھ حصہ نظر آتا رہ گیا۔ میں نے اندھیرے میں تیر چلاتے ہوئے کہا۔ ''سنا ہے تمہارا خاوند پسند نہیں کرتا تھا کہ تم کسی کے گھر میں کام کرو اور وہ اکثر تم سے لڑتا جھگڑتا بھی رہتا ہے۔''

تیر نشانے پر لگا۔ صغراں لرزاں لرزاں آواز میں بولی۔ ''پسند تو نہ وہ کرتے تھے نہ میں لیکن مجبوری تھی جی۔ گھر میں دو دو دن چولہا نہیں جلتا تھا۔ بچے بھوک سے بلک بلک کر بھوکے سو جائیں تو ماں پر جو گزرتی ہے ماں ہی جانتی ہے۔ میں نے گڈو کے ابا سے ہاتھ جوڑ کر کہا تھا کہ وہ مجھے نرنجن چاچا کے گھر کام کرنے کی اجازت دے دے۔ میں اُن کی اجازت سے ہی گئی تھی۔''

میں نے کہا۔ ''تم نرنجن کو چاچا کہہ رہی ہو مگر لوگ کچھ اور طرح کی باتیں کرتے ہیں۔''

وہ سرتاپا کانپ گئی۔ پھر ذرا سنبھل کر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''جن کے دل کالے ہوں اُن کے منہ سے ہی ایسی باتیں نکلتی ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''تمہارے خاوند کو ان باتوں کا پتہ تھا؟''

وہ روہانسی ہو کر بولی۔ ''معلوم نہیں جی...... اگر ایسی باتیں ہوتی تھیں تو ہو سکتا ہے اُن کے کانوں تک بھی پہنچتی ہوں۔''

میں نے کہا۔ ''تم انجان بننے کی کوشش نہ کرو۔ ایسی باتیں ہوتی تھیں اور تمہارے خاوند کے کانوں تک پہنچتی تھیں اور تمہیں بھی سب پتہ تھا۔ اس کے باوجود تم نے نرنجن کے گھر جانا اور وہاں کام کرنا جاری رکھا۔''

وہ رونے لگی۔ ''میں کیا کرتی جی۔ کہاں سے پیٹ بھرتی بچوں کا...... کون تھا مجھے ایک وقت کی روٹی بھی دینے والا۔ ہو سکتا ہے آپ ٹھیک کہتے ہوں۔ میرے خاوند کو لوگوں کی باتوں

کا پتہ ہو لیکن وہ کیا کر سکتا تھا۔ اُس نے سارے پاپڑ بیل کر دیکھ لیے تھے۔ اب وہ مایوس ہو کر
بیٹھ گیا تھا۔ اُسے بھی خبر تھی کہ جس دن میں کام پر نہ گئی ساری رات بچے بھوک سے روئیں
گے۔"

میں نے کہا۔ "تم کہہ رہی ہو کہ تمہارا خاوند مایوس ہو کر بیٹھ گیا تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ
مایوس ہو کر اُس نے نرنجن کو اگلے جہان پہنچا دیا ہو؟ ہو سکتا ہے لوگوں کی باتیں سن سن کر اُس
نے نرنجن کو قتل کرنے کی ٹھان لی ہو۔"

وہ تھر تھر کانپنے لگی۔ "نہیں تھانیدار جی۔ تم ایسا الزام مت لگاؤ۔ وہ ایسا نہیں کر سکتا۔ اس
میں اتنی ہمت نہیں ہے۔ خدا کے لیے اس پر ایسا شک نہ کرو۔"

چند ایک سوالات پوچھنے کے بعد میں نے صغراں کو باہر بھیجا اور عزیز کو بلا لیا۔ میں نے
ایک چیز خاص طور پر نوٹ کی۔ اُس کے بازو کی پٹی پر خون کے تازہ دھبے موجود تھے۔ یہ خون
باہر سے نہیں لگا تھا۔ اندر سے ہی رس کر باہر آیا تھا۔ میں نے عزیز سے پہلا سوال بازو کے
بارے میں ہی پوچھا۔ میں نے کہا۔ "لگتا ہے تمہاری کلائی دکھ گئی تھی۔"

اُس نے چونک کر بازو کی طرف دیکھا۔ پھر میری بات سمجھتے ہوئے بولا۔ "ہاں
جی..... کل میرا بڑا بچہ امجد کھیلتا ہوا سیڑھیوں سے پھسل گیا تھا۔ میں نے اُسے سنبھالنے کی
کوشش کی تو بازو دکھ گیا۔"

"یہ کتنے بجے کی بات ہے؟"

"کل دوپہر کی۔ صغراں اُس وقت نرنجن سنگھ کے گھر کام کرنے گئی ہوئی تھی۔"

"اچھا۔ کل رات تم کہاں تھے؟"

"میں اپنے گھر پر ہی تھا جی۔ شام کو تھوڑی دیر کے لیے اپنے ایک دوست اشرف کے
گھر گیا تھا، پھر واپس آ گیا تھا۔"

"تمہیں معلوم تھا کہ لوگ تمہاری بیوی اور نرنجن کے بارے میں باتیں بناتے ہیں پھر
بھی تم اُسے نرنجن کے گھر جانے دیتے تھے۔"

میرے سول نے عزیز کا رنگ فق کر دیا۔ چند لمحوں کے لیے اُس سے کوئی جواب بن
نہیں پڑا۔ آخر تھوک نگل کر بولا۔ "آپ کن باتوں کی بات کر رہے ہیں؟"

"مجھ سے صاف صاف سننا چاہتے ہو؟ تمہیں بتایا تو ہے جو باتیں لوگ بنا رہے تھے۔"

"مجھے کسی بات کا نہیں پتہ جی۔" وہ لرزتی آواز میں بولا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ جھوٹ
بول رہا ہے۔ میں نے اُس سے چند اور سوال بھی کیے جن کا وہ تسلی بخش جواب نہ دے سکا۔

اُس کا ایک جواب خاص طور سے قابلِ غور تھا۔ میں نے اس کی بیوی سے پوچھا تھا کہ عزیز
اپنے دوست اشرف کے پاس سے رات کتنے بجے گھر آیا تھا۔ بیوی نے کہا تھا کہ وہ عشاء کی
اذان سے آدھ پون گھنٹے بعد سوگئی تھی۔ بعد میں عزیز آیا تو وہ غنودگی میں تھی۔ اُسے کچھ پتہ
نہیں وہ کتنے بجے آیا تھا۔ دوسری طرف عزیز کہہ رہا تھا کہ وہ شام کے کچھ ہی دیر بعد واپس
آ گیا تھا اور بیوی کے ساتھ بیٹھا باتیں کرتا رہا تھا۔ دونوں کے بیانوں میں نمایاں فرق تھا۔
میں نے اس فرق کو نوٹ کرنے کے بعد میاں بیوی کو واپس بھیج دیا۔ تاہم انہیں ہدایت کر دی
کہ وہ مجھے اطلاع دیئے بغیر قصبے سے باہر نہیں جائیں گے، مجھے کسی بھی وقت دوبارہ ان کی
ضرورت پڑ سکتی ہے۔

موقعے سے ملنے والی مختلف اشیاء ایک بڑے رومال میں بندھی میرے سامنے پڑی
تھیں۔ ان میں نرنجن سنگھ کے ٹوٹے ہوئے بٹنوں کے علاوہ اس کی کلائی کی گھڑی بھی تھی۔
دھینگا مشتی میں گھڑی کا چین ٹوٹ گیا تھا اور وہ دری پر گر پڑی تھی۔ اس کے علاوہ موقعے سے
کچھ ریزگاری ملی تھی۔ اس ریزگاری پر مجھے خاص طور پر غور کرنا پڑا تھا۔ اس کی وجہ میں آگے
چل کر بتاؤں گا...... میں نے صغراں اور عزیز کو واپس تو بھیج دیا تھا لیکن ایسا نہیں کہ مطمئن ہو کر
واپس بھیجا ہو۔ خاص طور سے عزیز ہرگز میری تسلی نہیں کرا سکا تھا۔ جیسا کہ میں نے بتایا ہے کہ
وہ غیرت مند اور اکھڑ قسم کا گھبرو تھا۔ بیماری اور بے کاری نے اُسے نڈھال کر رکھا تھا ورنہ ایسے
نوجوان ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتے۔

یہ بات سوچی جا سکتی تھی کہ اُس نے منصوبہ بنا کر نرنجن کو قتل کر دیا ہو اور جاتے جاتے
نرنجن کی جمع پونجی بھی لے اُڑا ہو۔ جہاں تک جمع پونجی کا تعلق ہے ابھی تک پتہ نہیں چل سکا تھا
کہ نرنجن کے گھر سے کچھ گیا ہے یا نہیں۔ اور اس کی وجہ یہی تھی کہ کسی کو پتہ ہی نہیں تھا کہ نرنجن
کے پاس کیا ہے...... اور اگر ہے تو کہاں رکھا ہوا تھا۔ گھر میں ایک دو الماریاں کھلی ہوئی تھیں
مگر ٹھیک سے اندازہ نہیں ہو سکا تھا کہ کمروں کی تلاشی لی گئی ہے یا نہیں...... ہاں قاتل نے عام
استعمال کی چیزوں کو ہاتھ نہیں لگایا تھا، یہاں تک کہ نرنجن کی گھڑی بھی موقعے پر ہی پڑی رہی
تھی۔ ایک دوسری بات بھی سوچی جا سکتی تھی اور وہ یہ کہ عزیز نے نرنجن کو منصوبہ بنا کر قتل نہ کیا
ہو بلکہ فوری طور پر کوئی ایسی بات ہو گئی ہو جس نے اُسے مشتعل کر دیا ہو۔ مثلاً کل ہی نرنجن نے
صغراں کے ساتھ کوئی دست درازی کی ہو جس کا بدلہ اُس نے نرنجن پر شب خون مار کر لیا ہو۔
تاہم یہ صرف ایک امکان تھا اور اس جیسے بہت سے امکان موجود تھے۔ نرنجن کے پاس
یونہی دولت کی ریل پیل ہو گئی تھی۔ ممکن تھا اُس کے قتل کا سلسلہ بھی دولت کی اس ریل

پیل سے جا جڑتا ہو۔ پھر اس کے بیٹوں کا چکر بھی تھا۔ وہ باپ کے سخت خلاف تھے اور اس کی نئی شادی کے پروگرام نے انہیں آگ بگولہ کر رکھا تھا۔ اس کے علاوہ یہ سیدھی سادی ڈکیتی کی واردات بھی ہو سکتی تھی۔ ہر شخص کو پتہ تھا کہ نرنجن سنگھ کے پاس پیسہ ہے اور وہ رات کو گھر میں تنہا ہوتا ہے۔ کوئی بھی وارداتیا قسمت آزمانے کے لیے اُس کے گھر میں گھس سکتا تھا۔

شام کے بعد نرنجن سنگھ کی ارتھی کو آگ لگا دی گئی۔ اس موقع پر نرنجن کے تمام رشتہ دار موجود تھے۔ اس کے دونوں بیٹے بھی آئے ہوئے تھے۔ بڑے بیٹے کا نام روپ سنگھ تھا۔ اتنا روپ والا تو وہ نہیں تھا۔ بس عام سی شکل صورت تھی۔ ناک ذرا پھولی ہوئی تھی جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ جلد طیش میں آ جاتا ہے۔ نرنجن سنگھ کی رسمیں پوری ہو گئیں تو میں نے روپ سنگھ کو تھانے بلا بھیجا۔ رو رو کر اُس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں اور وہ چپ چاپ نظر آتا تھا۔ وہ آتے ساتھ ہی کہنے لگا۔

''تھانیدار صاحب! ہمارے باپو کو کسی اور نے نہیں صرف اور صرف عزیزے نے مارا ہے۔ وہ دونوں میاں بیوی ہمارے باپو کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑے ہوئے تھے۔ صغراں عورت نہیں گشتی ہے۔ وہ پہلے میٹھی چھری بن کر ہمارے باپو کو ذبح کرنے کی کوشش کرتی رہی پھر ناکام ہوئی تو عزیزے کے ساتھ مل کر اُس نے سچ مچ باپو کو ذبح کر دیا۔ باپو کو مارنے میں اس نے عزیزے کی پوری پوری مدد کی ہے۔ اُسے یہ بھی معلوم تھا کہ گھر میں نقد پیسہ اور زیور وغیرہ کہاں ہے۔ باپو کو مارنے کے بعد وہ سب کچھ وہاں سے نکال کر لے گئی ہے۔ آپ اُن کے گھر کی تلاشی لیں مجھے پورا یقین ہے کہ آپ کو ثبوت مل جائیں گے۔''

میں نے کہا۔ ''روپ سنگھ! ثبوت ڈھونڈنا میرا کام ہے اور وہ میں ڈھونڈ رہا ہوں۔ فی الحال تم سے چند ایک سوال پوچھنے ہیں، اگر اجازت ہو تو۔''

''پوچھیے جناب...... پوچھیے'' وہ گڑبڑا کر بولا۔

میں نے کہا۔ ''سنا یہ گیا ہے کہ تم اپنے باپ کی دوسری شادی کے سخت خلاف تھے اور گھر آ کر اُسے دھمکیاں دے چکے تھے کہ اگر اُس نے شادی کی تو اچھا نہیں ہوگا۔''

روپ سنگھ کے چہرے پر ایک دو رنگ بدلے۔ پھر وہ سنبھل کر بولا۔ ''اگر آپ یہ سمجھ رہے ہیں کہ باپو کے قتل میں میرا ہاتھ ہے تو سخت غلطی پر ہیں آپ......''

میں نے اُسے جھاڑا۔ ''تم میری غلطیاں مت نکالو۔ جو میں پوچھ رہا ہوں وہ بتاؤ۔''

اُس نے کہا۔ ''باپو کی دوسری شادی ہمیں پسند نہیں تھی لیکن رب نہ کرے اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ ہم اپنے پیدا کرنے والے کو ہاتھوں سے قتل کر دیتے۔ حلال کی اولاد ہو تو اُس کے

دماغ میں ایسی سوچ بھی نہیں آ سکتی۔''

میں نے کہا۔ ''جو حلال کی اولاد ماں باپ سے جھگڑ کر گھر چھوڑ سکتی ہے۔ اس سے گالی گلوچ کر سکتی ہے، وہ سب کچھ کر سکتی ہے......'' روپ سنگھ کو ایک دم چپ لگ گئی۔ میں نے موضوع بدلتے ہوئے پوچھا۔ ''کل رات تم کہاں تھے؟''

''میں لکھن پور اپنے گھر میں تھا۔ میری گھر والی کو بچہ ہوا تھا۔ دوست رشتے دار اکٹھے تھے۔ دس بندے گواہی دے سکتے ہیں کہ میں کل رات دس گیارہ بجے تک اپنے گھر میں ہی تھا۔''

''بہت خوب'' میں نے کہا۔ ''گھر میں بیٹا ہوا تھا۔ جشن منایا جا رہا تھا اور حلال کی اولاد نے باپو کو خبر تک نہیں دی۔''

روپ سنگھ شپٹا کر رہ گیا۔ میں نے اُسی کی بات پر اُس کو پکڑ لیا تھا۔ چند سوال مزید پوچھنے کے بعد میں نے روپ سنگھ کو جانے کی اجازت دے دی، لیکن روپ سنگھ سے میں نے جو آخری سوال کیا وہ بڑا اہم ثابت ہوا۔ اس سوال کے جواب نے مجھے بری طرح چونکا دیا اور میں مجبور ہو گیا کہ روپ سنگھ کو مشکوک افراد کی لسٹ میں شامل کر لوں۔ اصولی طور پر یہ سوال مجھے شروع میں پوچھنا چاہیے تھا لیکن اُس وقت چونکہ یاد نہیں آیا اس لیے میں نے بعد میں پوچھ لیا۔ میں نے پوچھا کہ وہ کیا کام کرتا ہے؟

وہ بولا۔ ''لکھن پور میں موم بتیاں اور اگر بتیاں بنانے کا کام کرتا ہوں۔ ہفتے بعد یہ سامان امرتسر جا کر بیچ آتا ہوں۔''

اب میں آپ کو وہ خاص بات بتاتا ہوں جو موقعے سے ملنے والی ریزگاری میں نظر آئی تھی۔ اس ساری ریزگاری سے ہلکی سی خوشبو اُٹھ رہی تھی جیسے سکوں کو عطر وغیرہ لگایا گیا ہو۔ یہ خوشبو نرنجن سنگھ کے لباس میں نہیں تھی، نہ ہی وہ خوشبو وغیرہ لگانے کا شوقین تھا۔ مجھے شبہ تھا کہ یہ ریزگاری مقتول کی جیب سے نہیں قاتل کی جیب سے گری ہے۔ اب روپ سنگھ انکشاف کر رہا تھا کہ وہ اگر بتیوں کا کام کرتا ہے۔ اگر بتیاں اور عطر وغیرہ بنانے والوں کے ہاتھ خوشبوؤں اور مسالوں میں لتھڑے رہتے ہیں اور یہ کوئی بڑی بات نہیں کہ کسی ایسے شخص کی جیب سے دو سکے یا نوٹ گریں اور اُن سے خوشبو آ رہی ہو۔ یہ ویسے تو ایک معمولی سا اشارہ تھا لیکن ایسے اشاروں سے بعض اوقات بڑے بڑے انکشاف ہو جاتے ہیں۔

میں نے رومال میں بندھے ہوئے سکے اپنے سب انسپکٹر اور اے ایس آئی ہری سنگھ کو بھی دکھائے۔ انہوں نے تصدیق کی کہ ریزگاری میں خوشبو ہے اور یہ خوشبو رومال میں بندھی

اور کسی چیز میں نہیں۔ لکھن پور کی بنی ہوئی اگربتیاں ''ڈھاب'' میں بھی ملتی تھیں۔ بلال شاہ گیا اور کریانے کی ایک دکان سے اگربتیاں لے آیا۔ اگربتیوں کے پیکٹ پر صاف لکھا ہوا تھا ''روپ اگربتی''، یعنی یہ روپ سنگھ کی بنائی ہوئی اگربتیاں تھیں۔ بلال شاہ کے سونگھنے کی حس بڑی تیز تھی (ہر پیٹو کی ہوتی ہے) اُسے کہا گیا کہ وہ ریزگاری اور اگربتیوں کی خوشبو کا مقابلہ کرے۔ بلال شاہ کافی دیر ناک سے لگا لگا کر سونگھتا رہا۔ اس کے بعد باری باری سب ہی نے سونگھا سانگھی کی لیکن کوئی خاص نتیجہ نہیں نکلا۔ کچھ کا کہنا تھا کہ ریزگاری اور اگربتیوں کی خوشبو سو فیصد ایک جیسی ہے۔ کچھ کا خیال تھا کہ بالکل نہیں ملتی اور کچھ کہتے تھے کہ ملتی جلتی ہے۔ میرا اپنا خیال بھی ''ملتی جلتی'' والا تھا۔ بہرحال میرے خیال میں یہی بات بڑی اہم تھی کہ ریزگاری میں سے آنے والی خوشبو سب نے محسوس کی تھی۔ آگے چل کر یہ نکتہ ہمارے لیے کارآمد ثابت ہوسکتا تھا...... اور ثابت ہوا بھی۔

دو روز بعد پوسٹ مارٹم رپورٹ آ گئی۔ اس رپورٹ میں ایک نیا انکشاف یہ ہوا کہ اپنی موت کے وقت مقتول نشے میں تھا۔ یہ چرس، افیم یا شراب وغیرہ کا نشہ نہیں تھا۔ نیند کی گولیوں کا نشہ تھا۔ مقتول کے معدے میں خواب آور دوا کی بڑی مقدار پائی گئی تھی۔ پولیس ایگزامینر کا خیال تھا کہ متوفی کم وبیش چار گولیاں کھائے ہوئے تھا۔ اس رپورٹ نے مجھے الجھن میں ڈال دیا۔ ایک بار پھر میرا دھیان صغراں اور عزیز کی طرف جانے لگا۔ اگر نرنجن سنگھ نے نیند کی گولیاں خود نہیں کھائی تھیں تو پھر یہ کام صغراں کے سوا کسی اور کا نہیں تھا۔ نرنجن سنگھ نے رات کو صغراں کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا کھایا تھا اور اس کی تصدیق پوسٹ مارٹم رپورٹ سے بھی ہوتی تھی۔ خوراک کے خانے میں صاف طور پر لکھا ہوا تھا رات سات اور نو بجے کے درمیان دال چاول۔ رات آٹھ اور دس بجے کے درمیان دودھ، اسی دوران چند قاشیں خربوزے کی اور ایک سیب۔ ایگزامینر کے خیال میں یہ عین ممکن تھا کہ خواب آور گولیاں سالن یا دودھ میں ملا کر دی گئی ہوں۔

اس رپورٹ کے بعد میں فوراً نرنجن سنگھ کے گھر پہنچا۔ وہاں ابھی تک اُس کے دونوں بیٹے اور دیگر عزیز رشتے دار موجود تھے۔ میں نے نرنجن کے کمرے کا تالا کھلوایا اور وہاں موجود ایک الماری میں نرنجن کی ذاتی چیزوں کا اچھی طرح معائنہ کیا۔ اس الماری میں ایک دو دوائیں بھی موجود تھیں جن میں کھانسی کا شربت، پیٹ درد کی گولیاں اور پھکی وغیرہ تھی۔ تاہم تلاشی کے باوجود کوئی ایسی دوا نہیں ملی جس سے پتہ چلتا کہ نرنجن خواب آور گولیاں استعمال کیا کرتا تھا۔ ہاں ایک پلنگ کے پیچھے سے استعمال شدہ گولیوں کے کاغذ ضرور مل گئے۔ کل تین

گولیوں کے کاغذ ملے۔ یعنی پوسٹ مارٹم رپورٹ کچھ اتنی زیادہ غلط نہیں تھی۔

میں نے کسی کو یہ اشارہ دیئے بغیر کہ رپورٹ میں کیا لکھا ہے، گھر والوں سے مختلف سوالات کیے۔ مقصد یہی جاننا تھا کہ نرنجن سنگھ نیند کی گولیاں استعمال کرتا تھا یا نہیں۔ بیٹے تو نرنجن سے علیحدہ رہتے تھے۔ انہیں کچھ معلوم نہیں تھا۔ ہاں نرنجن کی بیٹی شاردا نے روتے ہوئے بتایا کہ اس کے باپو نے کبھی کوئی نشہ نہیں کیا۔ نہ ہی کبھی نشے والی گولیاں کھائیں۔ بہت عرصہ پہلے جب اس کی ماں مری تھی اُس وقت باپو افیم کھا کر سویا کرتا تھا لیکن افیم کی عادت اُسے کبھی نہیں رہی۔ وہ ڈاکٹری دواؤں سے بچنے کی ہر ممکن کوشش کرتا تھا۔ لڑکی نے روتے ہوئے دہائی دی کہ اس کے باپو کو مارنے والی صغراں کے سوا اور کوئی نہیں۔

بات ایک بار پھر صغراں اور عزیزے پر آ رہی تھی...... دو روز بعد سکھ ڈی ایس پی بارا سنگھ خود ''ڈھاب'' آ دھمکا۔ وہ بڑا تپا ہوا تھا۔ کہنے لگا۔ ''سارا قصبہ دہائی دے رہا ہے، تمہارے پاس ثبوت بھی ہیں۔ پھر تم صغراں اور عزیزے کو گرفتار کیوں نہیں کرتے؟'' اُس کے لہجے سے نفرت جھلک رہی تھی۔ یقینی طور پر وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ میں ملزمان کو مسلمان ہونے کی رعایت دے رہا ہوں۔ میں نے اُس کا شبہ دور کرنے کے لیے اُسی وقت صغراں اور عزیزے کو گرفتار کر لیا اور عزیزے کو حوالات میں اچھی خاصی پھینٹی بھی لگوائی۔ وہ روتا چیختا رہا لیکن اُس نے بتایا کچھ نہیں۔ صغراں بھی بس بڑی بڑی قسمیں ہی کھاتی رہی۔ ان میں سب سے بڑی قسم وہ اپنے بچوں کی کھا رہی تھی۔ جب بھی کوئی ماں اپنے بچے کی قسم کھاتی ہے، میں اندر سے ہل جاتا ہوں۔ میرا جی چاہتا ہے کہ آنکھیں اور کان بند کر کے اُس عورت پر یقین کرلوں اور میں اکثر ایسا کرتا بھی ہوں لیکن اُس وقت کی بات اور تھی۔ میں انسپکٹر تھا اور ایک انسپکٹر کو یہ اختیار ہرگز نہیں ہوتا کہ وہ کسی ملزم کی قسم پر اعتبار کر کے اُسے چھوڑ دے۔ میں بھی عزیزے کو چھوڑ نہیں سکتا تھا۔ ہاں صغراں کے ساتھ رعایت کی جاسکتی تھی۔ وہ تین بچوں کی ماں تھی جن میں سے ایک شیر خوار تھا۔ ویسے بھی موقعے سے اُس کی غیر موجودگی ثابت ہوتی تھی...... جب ڈی ایس پی بارا سنگھ اپنی دہشت پھیلا کر واپس چلا گیا تو میں نے پوچھ گچھ کے بعد صغراں کو خاموشی سے گھر واپس بھیج دیا۔

صغراں کو اس معاملے سے نکالنے کے لیے ضروری تھا کہ خواب آور گولیوں والا معاملہ صاف ہو۔ اگر وہ گولیاں مقتول کو کھانے میں ملا کر دی گئی تھیں تو پھر یہ بات ثابت ہو جاتی تھی کہ یہ قتل پوری منصوبہ بندی سے کیا گیا ہے اور صغراں اس منصوبے کا مرکزی کردار ہے لیکن اگر یہ ثابت ہوتا کہ مقتول نے یہ گولیاں خود خریدی تھیں یا کسی ڈاکٹر نے اُسے لکھ کر دی تھیں تو

صغراں کی مشکل آسان ہو جاتی تھی۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ نرنجن سنگھ نے گولیاں کہاں سے خریدی ہوں گی۔ قصبے میں ایک چھوٹی سی دکان تو تھی مگر وہاں ایسی دوائیں نہیں ملتی تھیں۔ یہ گولیاں پکی سڑک کے کنارے ایک قصبے "رام پورہ" سے خریدی گئی تھیں یا امرتسر سے۔ اگر امرتسر سے خریدی گئی تھیں تو کھوج لگانا بہت مشکل تھا، دوسری صورت میں کھوج لگ سکتا تھا۔ رام پورہ میں دوائیوں کی ایک بہت ہی بڑی دکان تھی۔ اُس کا مالک لالہ گنپت میرا واقف تھا۔ بڑا اچھا آدمی تھا۔ وہ تقسیم کے وقت مسلمانوں کو ہندو بلوائیوں کے ہاتھوں سے بچاتے ہوئے قتل ہوا۔ میں نے اپنے اے ایس آئی کو گنپت لالہ کی طرف بھیجا۔ اے ایس آئی کی واپسی کوئی چار گھنٹے بعد ہوئی۔ اُس نے بتایا کہ گنپت لالہ کے بیان کے مطابق قریباً ایک ماہ پہلے ڈھاب قصبے کا نرنجن سنگھ اُس کے پاس آیا تھا اور چند دوائیں لے کر گیا تھا۔ اُسے ٹھیک طرح یاد نہیں لیکن شک پڑ رہا تھا کہ وہ کچھ خواب آور گولیاں بھی لے کر گیا تھا۔ میں نے اے ایس آئی کو دوبارہ گنپت لالہ کے پاس بھیجا اور وہ اس بیان کو تحریر کر کے اُس پر گنپت کے دستخط کروا لایا۔ یہ بیان صغراں کے لیے فائدہ مند ثابت ہو سکتا تھا۔ وہ شام کے وقت اپنے خاوند کو حوالات میں کھانا دینے آئی تو میں باہر برآمدے میں ہی بیٹھا تھا۔ بلال شاہ بھی میرے پاس تھا۔ میں نے صغراں کو اپنے پاس بلایا۔ اس نے حسبِ معمول ایک پرانی چادر سے منہ ڈھانپ رکھا تھا۔ شیر خوار بچہ اس کی گود میں تھا اور ایک ہاتھ میں ایک ٹیڑھا میڑھا پرانا سا ٹفن کیریئر تھا۔ میں نے آواز دی تو وہ بری طرح گھبرا گئی۔ اُس کا پاؤں چادر میں الجھا اور وہ گرتے گرتے بچی۔ ایسے میں ٹفن کیریئر اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور اس کے چھوٹے چھوٹے ڈبے دور تک لڑھکتے چلے گئے۔ ان ڈبوں سے مونگ کی پتلی سی دال نکلی اور دو ہلکی پھلکی روٹیاں۔ وہ منظر مجھے آج تک یاد ہے۔ بے بسی کی تصویر بنی وہ برآمدے کے درمیان بیٹھی تھی۔ ایک ہاتھ سے روتے بچے کو سنبھالا ہوا تھا، دوسرے سے ٹفن کیریئر کے ڈبے اٹھا رہی تھی۔ بے بسی و لاچاری کی تصویر تھی یہ عورت......لوگ حوالات میں اپنے قیدیوں کے لیے مرغن کھانے لے کر آتے ہیں لیکن وہ مشکل سے دال روٹی کا انتظام ہی کر سکی تھی اور اب یہ دال روٹی بھی بیچ چوراہے کے بکھر گئی تھی۔ میں نے اپنے کانسٹیل کو اشارہ کیا کہ وہ عورت کی مدد کرے لیکن کانسٹیبل سے پہلے ہی بلال شاہ لپک کر وہاں پہنچ گیا اور برتن سمیٹنے میں صغراں کی مدد کی۔ میں نے صغراں کو پاس بلا کر ملائمت سے گفتگو کی اور اُسے تسلی دی کہ کسی ٹھوس ثبوت کے بغیر میں اُسے ہرگز گرفتار نہیں کروں گا اور جب تک اُس کا خاوند حوالات میں ہے وہ بلا روک ٹوک اُس سے ملنے آ سکتی ہے۔ وہ منتیں کرنے لگی کہ اس کے خاوند کو کچھ نہ کہا جائے۔ "

پہلے ہی بیماری کاٹ رہا ہے اور اُس میں اور تکلیف سہنے کی ہمت نہیں۔ میں نے کہا۔ "تم بے فکر رہو۔ اگر وہ تعاون کرتا رہا تو اُسے ہاتھ بھی نہیں لگایا جائے گا۔"

کچھ دیر بعد صغراں خاوند کو روٹی دے کر چلی گئی تو بلال شاہ غمگین سا میرے پاس آ بیٹھا۔ کہنے لگا۔ "خان صاحب! مجھے بڑا ترس آ رہا ہے جی اس بے چاری پر۔ کچھ کریں اس کے لیے......؟"

میں نے کہا۔ "ہم کیا کر سکتے ہیں۔ ہم قانون کے دائرے میں پابند ہیں۔ اس سے باہر نہیں نکل سکتے۔"

"میرا یہ مطلب نہیں ہے جی۔" وہ بولا۔ "کوئی مالی امداد دینی چاہیے۔ مجھے پتہ چلا ہے بڑی مشکل سے گزر ہو رہی ہے ان لوگوں کی۔ گھر میں فاقہ رہتا ہے اور بچے روتے رہتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "کیا یہ عورت مدد قبول کرے گی۔ مجھے تو نہیں لگتا کہ ایسا کرے گی۔"

وہ بولا۔ "میرا بھی یہی خیال ہے......لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ ہم کچھ کریں ہی نہ۔" پھر سوچ کر کہنے لگا۔ "میں اسے کہیں کسی گھر میں ملازم نہ رکھوا دوں۔"

"لیکن وہ ملازمت کرے گی کیسے؟" میں نے پوچھا۔ "پہلے تو عزیز گھر میں رہتا تھا اور بچے سنبھال لیتا تھا۔ اب وہ تین بچوں کو گھسیٹتی ہوئی کہاں ماری ماری پھرے گی؟"

ابھی ہم یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ سات آٹھ زخمی افراد تھانے میں گھس آئے۔ کسی کا دانت ٹوٹا ہوا تھا، کسی کا سر پھٹا ہوا تھا اور کسی کے کپڑے تار تار ہو رہے تھے۔ دیہاتی تھانوں میں ایسے منظر اکثر دیکھنے میں آتے ہیں۔ دو گروہ کسی بات پر آپس میں ڈانگو ڈانگی ہو جاتے ہیں اور پھر زخمی حالت میں تھانے پرچہ کٹوانے پہنچ جاتے ہیں۔ یہ بھی ایک ایسی ہی واردات تھی۔ نواحی گاؤں چک مستریاں میں دو پارٹیاں پانی کے جھگڑے پر لڑ پڑی تھیں۔ ایک بندہ شدید زخمی حالت میں ہسپتال پہنچایا گیا تھا اور اُس کے بچنے کی امید کم ہی تھی......میں اس معاملے سے نبٹنے میں مصروف تھا۔ تھوڑی دیر بعد دوسری پارٹی کے لوگ بھی پہنچ گئے اور تھانے میں اچھی خاصی رونق ہو گئی۔ اسی دوران ہمارے قصبے یعنی ڈھاب کا سابق نمبردار لہنا سنگھ بھی تھانے آ پہنچا۔ اُس نے چادر کی بکل مار رکھی تھی اور اندازہ ہو رہا تھا کہ بکل کے نیچے ریوالور بھی ہے۔ وہ اجازت لے کر میرے پاس اندر کمرے میں آیا اور کہنے لگا۔ "نواز صاحب! مجھے آپ سے ایک بڑی ضروری بات کرنی ہے۔ مجھے صرف تین چار منٹ کا وقت دے دیں۔"

میں نے سمجھا کہ شاید وہ اسی لڑائی کے سلسلے میں کچھ کہنا چاہتا ہے لیکن میرے پوچھنے پر

اُس نے بتایا کہ نہیں یہ کوئی اور بات ہے۔ میں نے کہا۔ ''اچھا...... تم پانچ دس منٹ باہر بیٹھو
میں ابھی فارغ ہو کر تمہیں بلاتا ہوں۔''

بادلِ نخواستہ لہنا سنگھ باہر چلا گیا۔ میں ایک بار پھر سے اپنے کام میں لگ گیا۔ باتوں کی
گرماگرمی میں پتہ ہی نہیں چلا اور ڈیڑھ گھنٹہ گزر گیا۔ اچانک مجھے لہنا سنگھ کا خیال آیا۔ میں
نے اپنے سنتری سے پوچھا۔ ''نمبردار باہر بیٹھا ہے یا چلا گیا؟''

وہ بولا۔ ''جناب! ابھی کچھ دیر پہلے اٹھ کر گئے ہیں۔ کہتے تھے میں ابھی گھر سے چکر لگا
کر آتا ہوں۔''

میں ایک بار پھر راضی نامہ کرانے کے چکر میں پڑ گیا۔ ہم نو بجے کے قریب فارغ
ہوئے۔ میں نے سنتری سے پوچھا۔ ''نمبردار آیا ہے؟'' سنتری نے انکار میں جواب دیا۔
میں نے اس کے گھر بندہ بھیجا۔ معلوم ہوا وہ گھر میں بھی نہیں ہے۔ شام کے بعد وہ گھر گیا ہی
نہیں تھا۔ میرا ماتھا ٹھنکا کوئی گڑبڑ نظر آ رہی تھی۔ بہرحال اب رات ہو چکی تھی۔ صبح ہی دیکھا
جا سکتا تھا۔

اگلے روز علی الصبح چار بجے کے قریب نمبردار کا بھائی اور بیٹا تھانے پہنچ گئے۔ میں تھانے
میں ہی سوتا تھا۔ مجھے جگا کر بتایا گیا کہ نمبردار لہنا سنگھ کا پتہ نہیں چل رہا۔

اُس کے چھوٹے بھائی بلراج نے کہا۔ ''ہم تو ہر جگہ دیکھ چکے ہیں جی...... رام پورہ تک
بندے دوڑائے ہیں۔ پر کہیں سے کھوج نہیں ملا۔''

میں نے پوچھا۔ ''کہیں امرتسر تو نہیں چلا گیا؟''

بلراج بولا۔ ''سوال ہی نہیں پیدا ہوتا جی...... وہ تو گھر میں بھرجائی سے کہہ کر گئے تھے
میں ابھی واپس آ کر روٹی کھاتا ہوں۔ امرتسر تو دور کی بات ہے انہوں نے قصبے سے باہر بھی
جانا ہو تو روٹی شوق سے کھا کر جاتے۔''

میں نے پوچھا۔ ''کسی سے تازہ تازہ لڑائی جھگڑا تو نہیں ہوا؟''

لہنا سنگھ کا بیٹا بولا۔ ''جھگڑا تو ہے جی...... اور سارا قصبہ جانتا ہے ہو سکتا ہے اُڑتی اُڑتی
بات آپ تک بھی پہنچی ہو۔ رب نہ کرے باپو نہ ملا تو ہمارا پرچہ صرف اور صرف چوہدریوں
ہوگا۔''

لہنا سنگھ کے بیٹے نے درست ہی کہا تھا۔ نمبردار لہنا سنگھ اور چوہدری شام سنگھ کے
جھگڑے کی بھنک میرے کانوں میں بھی پڑ چکی تھی۔ دونوں گہرے یار تھے۔ اکٹھے کھاتے پیتے
اور موج اُڑاتے تھے۔ مگر چند ماہ پہلے کسی طوائف کی وجہ سے اُن کا جھگڑا ہو گیا تھا۔ طوائف

بازی اس علاقے کے چوہدریوں اور وڈیروں میں عام تھی۔ آئے دن حویلیوں میں مجرے
ہوتے رہتے تھے۔ شام سنگھ لاہور کی ایک نوخیز طوائف کی ''نتھ اُتروائی'' کے لیے اُسے اپنے
ڈیرے پر لایا تھا...... نتھ اُتروائی سے مطلب وہ رقم ہوتی ہے جو ایک طوائف پہلی بار کسی مرد
کے ساتھ جانے کے لیے وصول کرتی ہے۔ یہ رقم سینکڑوں میں نہیں ہوتی۔ ہزاروں اور
لاکھوں میں ہوتی ہے۔ آج کل کا لاکھ تب کا سینکڑا تھا اور شام سنگھ اُس نئی نویلی لڑکی کو پورے
پانچ سو میں ''ڈھاب'' لایا تھا۔ وہ پڑھی لکھی اور نخرے والی تھی۔ ابھی وہ صرف دو ہی روز شام
سنگھ کے پاس رہی تھی کہ ایک دن لہنا سنگھ ریسی تانگے پر سوار نشے میں دُھت شام سنگھ کے
ڈیرے پر پہنچ گیا۔ شام سنگھ اُس وقت کہیں گیا ہوا تھا۔ چم چم کرتی نوخیز طوائف کو دیکھ کر لہنا
سنگھ کے منہ میں پانی بھر آیا۔ وہ نشے میں دُھت تھا اور اُس کے ساتھی بھی ٹُن ہو رہے تھے۔ وہ
سب کے سب ''ست سری اکال'' بول کے لڑکی پر چڑھ دوڑے۔

دو تین گھنٹے بعد جب شام سنگھ بن سنور کر گھر سے ڈیرے پر واپس آیا تو اجڑی پجڑی،
کچلی سی طوائف شہر واپس جانے کے لیے سامان باندھ چکی تھی۔ شام سنگھ نے بہت ہاتھ پاؤں
جوڑے لیکن وہ اپنے ارادے پر قائم رہی۔ اس نے کہا۔ ''جو میرے ساتھ ہوا ہے اُس کے بعد
میں ایک پل بھی یہاں نہیں رہوں گی۔'' غصے میں بھری ہوئی وہ اپنے نوکر کے ساتھ لاہور
واپس چلی گئی...... بعد میں شام سنگھ اُسے منانے کے لیے لاہور گیا...... طوائف نے لہنے کے
خلاف اُس کے خوب کان بھرے اور اُسے بھڑکا کر آگ بگولہ کر دیا۔ شام سنگھ ''ڈھاب'' واپس
آیا تو لہنا سنگھ سے اُس کی لڑائی ہوگئی۔ اس واقعے کو اب دس بارہ ہفتے ہو چکے تھے لیکن لہنا سنگھ
اور شام سنگھ کے درمیان پیدا ہونے والی کشیدگی میں اضافہ ہی ہوا تھا۔ اور اب آناً فاناً لہنا گم
ہو گیا تھا۔ میں نے بلراج سنگھ کے اصرار پر چوہدریوں کے خلاف کچی رپورٹ درج کر لی اور
اے ایس آئی کو بھیجا کہ وہ چوہدری شام سنگھ کو تھانے بلا لائے۔ اے ایس آئی حکم کی تعمیل میں
روانہ ہو گیا۔ اسی دوران لہنا سنگھ کے دو رشتے دار بھاگے ہوئے آئے۔ انہوں نے بتایا کہ
چوہدری شام سنگھ نے لہنا سنگھ کو قتل کر دیا ہے یا شدید زخمی حالت کر کے اغوا کر لیا ہے۔ وہ سخت
گھبرائے ہوئے تھے۔ میں نے تفصیل پوچھی تو ایک شخص کہنے لگا۔

''جناب! ہم ابھی اپنی آنکھوں سے خون کے دھبے دیکھ کر آئے ہیں۔ موقع پر لہنا سنگھ
کی ایک جوتی بھی پڑی ہے۔ آپ خود موقع ملاحظہ کر سکتے ہیں۔ ہم نے ابھی تک کوئی چیز
چھیڑی نہیں ہے۔''

میں نے پوچھا۔ ''کہاں دیکھتے ہیں خون کے دھبے؟''

لہنا سنگھ کا ایک بیٹا روتے ہوئے بولا۔ ''اپنی حویلی کے پچھواڑے۔''

میں لہنا سنگھ کے عزیزوں کے ساتھ فوراً موقعے کی طرف روانہ ہوا۔ سابق نمبردار لہنا سنگھ کی حویلی تھانے سے بمشکل تین فرلانگ کے فاصلے پر تھی۔ حویلی کی پچھلی طرف کھیت تھے اور کھیتوں کے ساتھ ساتھ ایک چھوٹی سی پگڈنڈی حویلی کے ایک بغلی دروازے تک جاتی تھی...... تھانے سے واپس حویلی آتے ہوئے اگر لہنا سنگھ سامنے والے دروازے سے حویلی میں داخل ہوتا تو اُسے کافی لمبا چکر پڑتا تھا اس نے پگڈنڈی والا مختصر راستہ اختیار کیا تھا اور یہیں کسی سے اُس کی مڈبھیڑ ہوگئی تھی۔ بغلی دروازے سے قریباً پچاس قدم دور کچی زمین پر خون کے دو تین بڑے دھبے موجود تھے۔ اس کے علاوہ لہنا سنگھ کی جوتی پڑی تھی اور دھینگا مشتی کے آثار بھی صاف نظر آ رہے تھے۔ خون اتنا زیادہ نہیں تھا کہ لہنا سنگھ کو ''مقتول'' خیال کر لیا جاتا۔ یوں لگتا تھا وہ زخمی ہوا ہے اور زخمی کرنے والے اسے کچھ دور تک گھسیٹ کر اور پھر اٹھا کر لے گئے ہیں۔

موقعے کا اچھی طرح معائنہ کرنے اور ایک دو بیان لینے کے بعد ہم تھانے واپس آ گئے۔ یہاں چوہدری شام سنگھ پورے ٹھسکے کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ کوئی ایک فٹ اونچا رنگین شملہ، ٹاسے کا کھڑکتا ہوا کُرتا اور ویسا ہی کلف لگا تہبند۔ چوہدری کی آنکھیں نسواری تھیں اور اُن میں ''عیش پرستی'' کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔

مونچھیں مروڑ کر کہنے لگا۔ ''نواز خان صیب! مجھ کو چنگی طراں پتہ تھا کہ آپ نے مجھ کو تھانے بلانا ہے۔ لہنا سنگھ جیسے منحوس بندے کی یاری کا کچھ انعام تو ملنا چاہیے تھا ناں ہم کو بھی......''

میں نے دوسروں کو بھیج کر شام سنگھ سے اکیلے میں بات چیت کرنا مناسب سمجھی۔ سب باہر چلے گئے تو میں نے کہا۔ ''لمبے چکروں میں پڑنا ٹھیک نہیں۔ اگر لہنا سنگھ تیرے پاس ہے تو اُسے برآمد کرا دے۔ میں کوئی کیس نہیں بناؤں گا۔ اگر بنانا ہی پڑا تو تیرے ایک دو کارندوں کے خلاف بنا کر معاملہ رفع دفع کر دوں گا۔''

وہ مسکرانے لگا۔ ''نواز صیب! ہم کیسوں سے ڈرنے والے نہیں ہیں۔ آپ کو پتہ ہی ہے ایک دو مہینے کچہری کا منہ نہ دیکھیں تو گواچے گواچے پھرتے ہیں۔ باقی جہاں تک لہنا سنگھ کی بات ہے، مجھے اس کا کچھ پتہ نہیں۔ میں نے ایک ہفتہ پہلے رام پورہ کے رستے میں اُس کی شکل دیکھی تھی۔ شام تک کئی بنے بنائے کام بگڑ گئے تھے۔ واہگرو بچائے ایسے منحوسوں سے۔''

میں نے شام سنگھ کو کریدنے کی کوشش کی لیکن اُس نے پروں پر پانی نہیں پڑنے دیا۔ ویسے مجھے اُس کی باتوں سے جرم کی بو آ رہی تھی۔ میں نے اندھیرے میں تیر چلاتے ہوئے کہا۔ ''شاید تمہیں ایک بات معلوم نہیں شام سنگھ...... غائب ہونے سے تھوڑی دیر پہلے لہنا سنگھ میرے پاس تھانے آیا تھا۔'' میرے اس فقرے نے شام کے سر پر بم کے دھماکے کا کام کیا۔ یوں لگا جیسے اُس کا کوئی اندرونی خدشہ ایک دم سچ نکل آیا ہو۔ میں گہری نظروں سے اُس کا جائزہ لے رہا تھا۔ اُسے بدحواس دیکھ کر میں نے ایک اور چوٹ لگائی۔ ''چھپانے سے کوئی فائدہ نہیں چوہدری...... اگر چاہتے ہو کہ میں تعاون کروں تو تم بھی میرے ساتھ تعاون کرو۔''

چوہدری نے سنبھلنے کی کوشش کی، لیکن پھر بھی سنبھل نہیں سکا۔ وہ بڑبولا اور باتونی سا شخص تھا۔ ایسے بندے کی زبان سے جلدی میں اکثر غیر ضروری بات نکل جاتی ہے۔ یہاں بھی ایسا ہی ہوا۔ وہ تیزی سے بولا۔ ''مجھ کو پتہ نہیں جی کہ لہنا سنگھ نے آپ کے کیا کان بھرے ہیں......اور وہ جندرا تو......'' کچھ کہتے کہتے وہ ایک دم چپ ہو گیا۔ ہونٹ یوں مضبوطی سے بند کر لیے جیسے کسی بڑی غلطی کا احساس ہو گیا ہو۔

''کیا جندرا؟'' میں نے پوچھا۔

''کچھ نہیں جی......اس لہنا سنگھ کی زبان نہیں ہے۔ سمجھیں کتے کی بوٹی رکھی ہے منہ کے اندر۔ اگر آپ نے اُس کی باتوں پر اعتبار کرنا ہے تو پھر ابھی میرے خلاف 302 کا پرچہ کاٹ دیں۔'' وہ ابھی تک جھلایا ہوا تھا جیسے زبان کے پھسل جانے پر خود کو کوس رہا ہو......وہ تیزی سے باتیں کرنے لگا۔ جیسے اس کوشش میں کہ میرے دماغ سے ''جندرے'' والی بات نکل جائے۔ موقعے کی نزاکت دیکھ کر میں نے یہی ظاہر کیا کہ میرا ذہن اُس طرف سے ہٹ گیا ہے۔ ٹائم ضائع کرنے کی بجائے میں نے بات کا رخ موڑ دیا اور طوائف والے چکر کے بارے میں کچھ بات چیت کر کے اُسے رخصت کر دیا...... وہ اطمینان کے ساتھ واپس چلا گیا کہ میرا شک رفع ہو چکا ہے لیکن اصل شک تو اب شروع ہوا تھا۔ چوہدری کی اپنی باتیں ہی اُس کے خلاف جال بن رہی تھیں۔ مجھے یقین سا ہونے لگا تھا کہ لہنا سنگھ نے شام سنگھ کی رکھیل کو تہس نہس کر کے جس دشمنی کی بنیاد ڈالی تھی وہی دشمنی اس کی گمشدگی کا سبب بنی ہے۔ زن کے جھگڑے کا زہر بڑا خطرناک ہوتا ہے اور اس وقت یہی زہر شام سنگھ اور لہنا سنگھ کی رگوں میں دوڑ رہا تھا۔

میں نے لہنا سنگھ کے عزیزوں کو تسلی دی اور اُن سے قسم لی کہ وہ کوئی دنگا فساد نہیں کریں گے۔ لہنا سنگھ کے بھائی نے کہا۔ ''ہم نے کبھی دنگا فساد کیا ہی نہیں جی...... یہ کام چوہدریوں کی

طرف سے ہی شروع ہوا تھا۔ اب آپ کہتے ہیں تو جناب ہم گھر سے ہی باہر نہیں نکلیں گے۔ ہم نے دشمنی نہیں پالنی۔ ہمیں صرف اپنا بھائی چاہیے۔''

میں نے کہا۔''بھائی تمہیں مل جائے گا...... یہ میرا وعدہ ہے تم سے۔''

لہنا سنگھ کے عزیز واپس چلے گئے...... میں نے کارروائی ڈالنے کے لیے اور چوہدریوں کو یہ بتانے کے لیے کہ میں اب اُن پر شبہ نہیں کر رہا چند ایک اوباش افراد کو تھانے میں بٹھایا اور اُن کی چھترول وغیرہ کی۔ اس چھترول سے یہ فائدہ ہوا کہ ایک دو چوریاں پکڑی گئیں اور جیب تراشی کی ایک واردات کا سراغ مل گیا۔ لہنا سنگھ کا پتہ نہ ان لوگوں سے ملنا تھا نہ ملا...... میں نے لہنا سنگھ کے عزیزوں سے وعدہ کیا تھا کہ جلد ہی لہنا سنگھ مل جائے گا لیکن یہ وعدہ نہیں کیا تھا کہ وہ زندہ ملے گا۔ میں کیا کوئی بھی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ لہنا سنگھ کے ساتھ کیا بیتی ہے...... ہاں اس بات پر مجھے پورا بھروسہ تھا کہ لہنا کے گم ہونے میں چوہدریوں کا ہاتھ ہے۔ شام تک ایک اور انکشاف ہو گیا اور یہ اس کیس کا سب سے اہم انکشاف تھا۔ میں نے شام سنگھ سے ملاقات کے فوراً بعد اپنے مخبر خاص بلال شاہ کو ہدایت کر دی تھی کہ وہ جندرا سنگھ یا جندرا کمار نامی کسی شخص کا پتہ کرے۔ مجھے یقین تھا کہ جندرا کسی ایسے شخص کا نام ہے جس کا تعلق اس کیس سے بہت گہرا ہے۔ اگلے روز صبح سویرے بلال شاہ نے مجھے نہایت چونکا دینے والی خبر سنائی۔ اس نے بتایا کہ جندرا کسی شخص کا نام نہیں بلکہ عرفیت ہے (یعنی عرف ہے) چند روز پہلے قتل ہونے والا نرنجن سنگھ نوجوانی میں پہلوانی بھی کرتا رہا ہے۔ اُسے بعض لوگ جندرا پہلوان کہتے تھے کیونکہ اُس کی پکڑ بڑی سخت تھی۔ اب ان واقعات کو زمانہ گزر چکا ہے لیکن بعض پرانے لوگ اب بھی نرنجن کو جندرا کہہ کر پکارتے ہیں۔

میں نے بلال شاہ سے پوچھا۔''کیا قصبے میں اور کوئی جندرا نہیں؟''

بلال شاہ نے کہا۔''نہ صرف قصبے میں بلکہ میری معلومات کے مطابق اردگرد کے دیہات میں بھی اس نام یا عرف کا کوئی بندہ نہیں ہے۔''

میری رگوں میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ اس کا مطلب تھا نرنجن سنگھ کے قتل اور لہنا سنگھ کی گمشدگی میں گہرا تعلق ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ لہنا سنگھ قتل کی واردات کے بارے میں کچھ جانتا ہو اور اسی لیے اُسے موقعے سے غائب کر دیا گیا ہو۔ میں اُس وقت کو کوسنے لگا جب وہ خود مجھے کوئی اطلاع پہنچانے کے لیے تھانے آیا تھا اور اپنی مصروفیت کی وجہ سے میں نے اُسے باہر بٹھا دیا تھا۔ ممکن ہے کہ میں اُس کی بات سن لیتا تو نہ صرف نرنجن سنگھ کے قتل کا مسئلہ حل ہو جاتا بلکہ خود لہنا بھی بڑی مصیبت سے بچ جاتا۔ اب ذہن میں خود بخود یہ سوال اُبھرتا

تھا کہ کہیں نرنجن سنگھ کو اُس کی حویلی میں جان سے مار دینے والے چوہدری تو نہیں۔ اگر چوہدریوں نے ایسا کیا تھا تو اس کی کیا وجہ تھی۔ نرنجن سنگھ سے چوہدری شام کی دشمنی تھی اور نہ اُس کے کسی بھائی بند کی۔ بلکہ نرنجن سے چوہدریوں کا کوئی خاص تعلق ہی نہیں تھا۔ چوہدریوں زمینداروں کا تعلق واسطہ اپنے جیسے لوگوں سے ہوتا ہے اور نرنجن سنگھ تو چھ مہینے پہلے تک صرف ایک کریانہ فروش تھا۔ چوہدری شام سنگھ کو کیا ضرورت پڑ گئی تھی اُس کے خون سے ہاتھ رنگنے کی۔ گھوم پھر کر ذہن اُس بات کی طرف جاتا تھا جو شروع سے پردے میں تھی اور ابھی پتہ نہیں کب تک پردے میں رہنی تھی۔ میرا اشارہ اُس خوشحالی کی طرف تھا جو نرنجن سنگھ کے گھر میں اچانک آ گئی تھی اور جس کی وجہ سے کوئی بھی اُس کی جان کا دشمن بن سکتا تھا۔ نرنجن کا کہنا تھا کہ ایک سودے میں اُسے زبردست منافع ہوا ہے اور یہ پیسہ اُسی منافع کی نشانی ہے۔ جب کہ اکثر لوگ اس بات پر یقین نہیں رکھتے تھے۔ ہوسکتا ہے نرنجن کی یہ ''خفیہ خوشحالی'' ہی چوہدری شام سنگھ کے لالچ کا باعث بن گئی ہو اور اُس نے اُسے قتل کرا دیا ہو۔ بعد میں لہنا سنگھ کو اس واردات کا پتہ چلا ہو۔ وہ مخبری کرنا چاہتا ہو اور اس مخبری کے ڈر سے چوہدریوں نے اُسے غائب کرا دیا ہو۔

اب چوہدری شام وغیرہ کی نگرانی بہت ضروری ہو گئی تھی۔ مگر مسئلہ یہ تھا کہ اس قصبے میں ایک بھی ایسا شخص نہیں تھا جو چوہدری شام کی نگرانی یا اس کے خلاف مخبری کرنے کا خطرہ مول لے سکے۔ بہت گھوم پھر کر میری نگاہ ایک دائی جہانوں پر پڑی۔ جہانوں بڑی صحت مند اور دبنگ عورت تھی۔ قصبے کی ہر چار دیواری میں دندناتی ہوئی گھس جاتی تھی۔ چوہدریوں سے اس کی گاڑھی چھنتی تھی اور اس حویلی میں ہونے والے سارے بچے اسی کی مدد سے پیدا ہوئے تھے۔ وہ لالچی یا ڈرنے والی عورت نہیں تھی لیکن اُس کی ایک کمزوری میرے ہاتھ آ چکی تھی اور اسی ''کمزوری'' سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں نے اُسے چوہدری کے خلاف مخبری پر راضی کر لیا۔ اس کمزوری کی تفصیل میں گیا تو یہ کہانی طویل ہو جائے گی۔ ویسے بھی یہ ذکر یہاں مناسب نہیں۔ مختصراً یہ جان لیں کہ ماضی میں جہانوں ایک ''لڑکے باز'' عورت رہی تھی۔ اُس کے سسرالی گاؤں ''چندر پور'' میں ایسے کئی قصے مشہور تھے جب کہ یہاں ڈھاب میں اُسے سب پاکباز سمجھتے تھے۔ بہر حال میں نے جہانوں کو موت دکھا کر بخار پر راضی کر لیا۔ یعنی وہ چوہدری شام سنگھ پر نگاہ رکھنے کو تیار ہو گئی۔ جہانوں سے میرا رابطہ بلال شاہ کے ذریعے تھا۔ دوسرے تیسرے روز بلال شاہ نے مجھے آ کر بتایا کہ حویلی میں شام سنگھ کا ایک کارندہ جھورا موجود نہیں ہے۔ سنا ہے چوہدری نے اُسے کسی خاص کام سے بھیجا ہوا ہے۔ بلال شاہ نے

کہا۔ ''جہانوں کو شک ہے کہ جھورا کسی چکر میں حویلی سے باہر ہے۔''

میں نے بلال شاہ سے کہا کہ وہ جہانوں سے مسلسل رابطہ رکھے اور جونہی کوئی اہم بات معلوم ہو مجھے اطلاع دی جائے۔ بلال شاہ ان دنوں بہت بڑھ چڑھ کر کام کر رہا تھا۔ عزیزے کی بیوی صغراں سے اُسے بہت ہمدردی ہو گئی تھی اور وہ چاہتا تھا کہ وہ اور عزیز کسی طرح اس چکر سے نکل آئیں۔ ویسے تو بلال شاہ ایک ہمدرد بندہ تھا لیکن صغراں سے اُس کی ہمدردی کی وجہ بڑی دلچسپ تھی۔ بلال شاہ کو اس عورت کی شکل وصورت میں اپنی بچھڑی محبوبہ کی جھلک نظر آتی تھی۔ اس محبوبہ کی یاد میں وہ اکثر آہیں بھرتا رہتا تھا۔ غم غلط کرتے کرتے اُس نے گھر میں بچوں کی لائن لگا لی تھی مگر غم پھر اپنی جگہ برقرار رہا تھا۔ بلال شاہ کی اُس محبوبہ کا ذکر آپ ایک کہانی میں پڑھ چکے ہیں۔ بلال شاہ کا خیال تھا کہ صغراں کی آنکھوں میں، اُس کے ہونٹوں میں یا اس کے بولنے کے انداز میں کوئی ایسی بات ہے جو اُس کی جانِ تمنا میں تھی...... اللہ بہتر جانتا ہے۔

چوتھے پانچویں روز مجھے ایک نہایت اہم خبر ملی۔ خبر لانے والا بلال شاہ ہی تھا۔ اُس نے بتایا کہ ابھی دس منٹ پہلے جہانوں اُس کے گھر آئی تھی اور اُس نے اطلاع دی ہے کہ سابق نمبردار لہنا سنگھ چوہدری شام کے کارندے جھورے کے کھوہ یعنی کنویں پر ہے۔ وہ شدید زخمی ہے اور کوئی پتہ نہیں ایک آدھ دن میں پار ہی ہو جائے۔ تفصیل بتاتے ہوئے بلال شاہ نے کہا۔

''کل رات گئے جھورا حویلی میں آیا تھا اور بند کمرے میں چوہدری سے دیر تک باتوں میں مصروف رہا تھا۔ وہ واپس جانے لگا تو جہانوں نے دلیری کی اور اپنے بیٹے کو جھورے کے پیچھے لگا دیا۔ جھورا سیدھا اپنے کھوہ پر گیا۔ یہ کھوہ جھورے کے باپ کا تھا۔ اب ایک عرصے سے بند پڑا ہے اور کوئی اس طرف آتا جاتا نہیں۔ یہاں چند کچے کوٹھے بھی بنے ہوئے ہیں۔ جھورے نے لہنا سنگھ کو ایک ایسے ہی کوٹھے میں رکھا ہوا ہے۔ وہاں جھورے کے علاوہ ایک اور بندہ بھی پہرے پر رہتا ہے۔ اُس کے پاس پکی رائفل ہے اور گولیوں سے بھرا ہوا ایک تھیلا ہے۔''

جہانوں کے بیٹے نے جان مشکل میں ڈال کر بڑی کارآمد معلومات حاصل کی تھیں۔ ہم ان معلومات سے فائدہ نہ اٹھا سکتے تو یہ ہماری بڑی بدقسمتی تھی۔ میں نے فوراً چھاپہ مار پارٹی ترتیب دی اور ایک ہیڈ کانسٹیبل کو حویلی دوڑایا کہ وہ چوہدری شام سنگھ کو تھانے بلا لائے۔ چھاپہ مارنے سے پہلے میں شام سنگھ سے بات کرنا چاہتا تھا۔ عین ممکن تھا کہ گھی سیدھی انگلیوں

سے ہی نکل آتا لیکن شام سنگھ قصبے میں نہیں تھا۔ لاہور گیا ہوا تھا۔ شاید اُسی چھمک چھلو کی گود میں سر رکھ کر لیٹا ہو گا جو چند ماہ پہلے شام اور لہنے میں اینٹ کتے کا بیر ڈال چکی تھی۔ میں نے کسی دوسرے سے بات کرنا مناسب نہ سمجھی اور اُسی وقت پارٹی کے ساتھ جھورے کے کھوہ پر دھاوا بول دیا۔

یہ صبح نو ساڑھے نو کا وقت تھا۔ بڑی گرم چمکیلی دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ لگتا تھا ابھی دوپہر شروع ہوئی ہے۔ کھیت کھلیان سنسان نظر آرہے تھے۔ کچے راستے کی دھول پھانکتے ہم ایک خشک نالے میں داخل ہوئے اور ایک میل اُسی کے اندر ہی اندر چلتے عین جھورے کے ڈیرے پر جا پہنچے۔ ہم نے جو رستہ اختیار کیا وہ طویل ضرور تھا لیکن بالکل محفوظ تھا۔ جھورا سنگھ کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں ہوئی کہ پولیس اُس کے سر پر پہنچ گئی ہے۔ وہ ایک گھنے پیپل کے نیچے ایک ملنگ نما شخص کے ساتھ بیٹھا سردائی پی رہا تھا۔ سردائی ایک ایسا گھوٹا ہوتا ہے جس میں بھنگ کے علاوہ بادام اور مغز وغیرہ ملائے جاتے ہیں۔ نشے باز اس غلط فہمی میں مبتلا ہوتے ہیں کہ یہ مشروب گرمیوں میں جگر وغیرہ کو ٹھنڈک پہنچاتا ہے لیکن بعض اوقات یہ مشروب جگر کے ساتھ ساتھ بندے کو بھی ٹھنڈا کر دیتا ہے اور نتیجے میں کفن دفن اور کریا کرم کا انتظام کرنا پڑتا ہے۔ جھورے نے ہمیں دیکھتے ہی چھلانگ لگائی اور کوٹھوں کی طرف بھاگا۔ میں نے اُس کی دھوتی کسی بڑے پرندے کی طرح پھڑ پھڑاتے ہوئے دیکھی۔

''رک جاؤ!'' میں نے چلا کر کہا۔ 32 بور کا بھرا ہوا ریوالور میرے ہاتھ میں تھا۔

جھورا سنگھ نے میری آواز پر کان نہیں دھرا اور دوڑتا چلا گیا۔ میں نے تاک کر اُس کی پنڈلی کو نشانہ بنایا۔ دھماکے کے ساتھ ہی وہ لڑکھڑا کر اوندھے منہ دروازے کے پاس گرا اور پٹ کھول کر جلدی سے اندر گھس گیا۔ اندر سے کنڈی چڑھنے کی آواز ہمیں صاف سنائی دی...... ہم نے تین اطراف سے کوٹھوں کو گھیر لیا اور جھورے کو باہر آنے کی وارننگ دی۔ اندر مکمل خاموشی تھی۔ کوئی آہٹ کوئی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ قرب و جوار میں صرف ملنگ کی آواز تھی جو فائرنگ سے ڈر کر زمین پر گر پڑا تھا اور اب جان بخشی کے لیے سب انسپکٹر کی منت کاجت کر رہا تھا۔

میرے اشارے پر دو ہیڈ کانسٹیبلوں نے ہوائی فائرنگ کی۔ چند گولیاں بند دروازے پر بھی برسائی گئیں۔ اس کے بعد میں نے بلند آواز میں ایک بار پھر جھورے اور اُس کے ساتھی کو باہر آنے کا کہا۔ چند لمحے بعد دروازہ کھلا اور جھورا اپنے ساتھی سمیت ہاتھ اٹھائے باہر نکل آیا۔ اُس کا رنگ مٹی ہو رہا تھا۔ بائیں پنڈلی خون سے رنگین تھی۔ میں دو کانسٹیبلوں کے ساتھ

آگے بڑھا اور اُن دونوں کو الٹی ہتھکڑی لگا دی۔

''لہنا کہاں ہے؟'' میں نے جھورے سے پوچھا۔

''اندر۔'' اُس نے خشک لبوں پر زبان پھیر کر کہا۔

''کوئی تیسرا بندہ تو نہیں اندر؟'' میں نے ریوالور اُس کے سر سے لگاتے ہوئے کہا۔

وہ جلدی جلدی نفی میں سر ہلانے لگا۔ ہم چار دیواری میں داخل ہوئے۔ ایک لمبوترے کمرے میں ایک گابھن گدھی بندھی ہوئی تھی۔ اُس کے پاس پرالی پر کوئی سکڑا پڑا تھا۔ وہ لہنا تھا لیکن میں اسے بمشکل پہچان سکا۔ اُس کے کیس کھل کر کندھوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ لباس کے نام پر اُس کے جسم پر صرف ایک بنیان تھی۔ اس پر بھی خون کے بڑے بڑے دھبے موجود تھے۔ سر پھٹا ہوا، سامنے کے دو دانت غائب، ایک کلائی ٹوٹ کر لٹکی ہوئی اور رانوں پر کلہاڑی کے کئی زخم۔ وہ بہت بری حالت میں نیم بے ہوش پڑا ہوا تھا۔ شاید ایک آدھ دن اور اسی طرح پڑا رہتا تو ہر مصیبت سے آزاد ہو جاتا۔ ہم اُسے چارپائی پر ڈال کر باہر لائے۔ فائرنگ کی آواز سے اردگرد موجود لوگ موقعے پر اکٹھے ہو گئے تھے۔ لہنا سنگھ کی بری حالت دیکھ کر وہ دانتوں میں انگلیاں دبانے لگے۔ کمروں کی تلاشی لی گئی تو ایک جگہ سے لہنا سنگھ کے خون آلود کپڑے اور اُس کی جوتی کا دوسرا پاؤں ملا۔ اُس کا بھرا ہوا ریوالور بھی وہیں پڑا ہوا تھا۔ لہنا سنگھ کو پہلے تھانے لے جایا گیا اور وہاں سے گاڑی کا انتظام کر کے امرتسر روانہ کر دیا گیا۔ اُس کے زخم بہت خراب ہو چکے تھے۔ ایک ٹانگ ران پر سے کاٹنی پڑی۔ دوسری ٹانگ ٹخنے سے کولہے تک پلاسٹر میں جکڑ دی گئی۔ ہسپتال پہنچنے کے پانچویں روز اُس کی طبیعت ذرا سی سنبھلی اور وہ بیان دینے کے قابل ہوا۔ تاہم اُس کے بیان دینے سے پہلے ہی میں چوہدری شام سنگھ اور اُس کے ایک بھائی کو گرفتار کر چکا تھا۔ مجھے خطرہ تھا کہ میں لہنا سنگھ کے بیان کا انتظار کرتا رہا تو چوہدری ایسا غائب ہوگا کہ پھر ڈھونڈے سے نہیں ملے گا۔ حوالات میں چوہدری شام نے کوئی بھی جرم قبول کرنے سے انکار کیا۔ اس کے علاوہ چوہدری اور اُس کے ہمنوا مجھے سنگین نتائج کی دھمکیاں بھی دے رہے تھے۔ لالچ، دھونس، دباؤ ہر حربہ انہوں نے استعمال کیا لیکن میں چوہدری شام کو نہ چھوڑنے کا پختہ ارادہ کر چکا تھا۔ لہنا سنگھ کے بیان کے بعد چوہدری شام سنگھ کے خلاف کیس اور مضبوط ہو گیا...... اس بیان سے وہ یوں پھنسا جیسے چوہا چوہے دان میں پھنستا ہے۔

ہسپتال کے سرجیکل وارڈ میں بستر پر لیٹے لیٹے لہنا سنگھ نے ایک کمزور سی آواز میں جو طویل بیان دیا اُس کا خلاصہ کچھ اس طرح ہے۔

وہ کہنے لگا۔ ''واہگرو کی کرپا ہے کہ زندہ بچ گیا ہوں اور اس سے بڑی کرپا یہ ہے کہ آپ و بیان دے رہا ہوں۔ مہربانی کر کے آپ میرا بیان لکھ لیں اور ابھی میرے انگوٹھے لگوا ں۔''

میں نے کہا۔ ''تم پوری تسلی سے بولو۔ تم جو کچھ کہو گے اُس کا ایک لفظ ضائع نہیں ہوگا۔ ب کچھ عدالت میں پہنچے گا۔''

وہ اپنی الجھتی سانسوں پر قابو پا کر بولا۔ ''کریانہ فروش نرنجن سنگھ کا قاتل چوہدری شام ھ ہے۔ اُس نے اپنے بدمعاش جھورے کے ذریعے اُسے قتل کرایا ہے۔ میں اُس روز انے میں یہی اطلاع دینے کے لیے پہنچا تھا...... مگر قسمت میں یہ تکلیف لکھی ہوئی تھی...... پ اپنے کام میں لگے ہوئے تھے۔ میں بیٹھ بیٹھ کر تھک گیا تو گھر کا چکر لگانے چلا گیا۔ اں مجھے شام کے بندوں نے پکڑ لیا، اس کے بعد جو کچھ ہوا آپ کے سامنے ہے۔''

میں نے پوچھا۔ ''قتل کی کوئی نہ کوئی وجہ ہوتی ہے۔ نرنجن کے قتل کی وجہ کیا تھی؟''

''بڑی خاص وجہ تھی جناب۔'' لہنا سنگھ نے کہا۔ ''نرنجن کے پاس سونے کا ایک ٹل تھا نی بہت بڑی گھنٹی) اس ٹل کا وزن کچھ نہیں تو تین سیر تھا...... تین سیر خالص سونا جس کے ل ہوا اُسے کوئی بھی جان سے مار سکتا ہے۔ چوہدری شام کو اُس سونے کا پتہ چل گیا تھا اس نے نرنجن کا دھڑن تختہ کرا دیا۔ یہ سونا اب چوہدری شام کے پاس ہے۔ آپ اُسے جوتا ریں گے تو وہ سب کچھ بک دے گا۔''

لہنا سنگھ کی اطلاع سنسنی خیز تھی۔ تین سیر سونا اُس وقت بھی ہزاروں روپے کا تھا۔ میں نے لہنا سنگھ سے پوچھا کہ نرنجن کو وہ ٹل ملا کہاں سے تھا۔ لہنا بولا۔ ''بس کہیں سے اُس کے ھ آ گیا تھا۔ آپ کو پتہ ہی ہے چھ سات مہینے پہلے تک نرنجن سنگھ کریانے کی دکان کرتا تھا۔ اں اُس نے بتاشے کھیلاں پتیسا اور اس طرح کی دوسری مٹھائیاں بھی رکھی ہوئی تھیں۔ لوگ ے پیتل وغیرہ کی بے کار چیزیں اُس کے پاس لاتے تھے اور بدلے میں کوئی میٹھی چیز لے تے تھے۔ سونے کا وہ ٹل بھی کسی کو زمین سے ملا تھا۔ بالکل ٹوٹا پھوٹا اور مٹی میں لتھڑا ہوا تھا ں کا رنگ بھی سیاہ ہو رہا تھا۔ سیدھے سادے دیہاتی نے اُسے پیتل کا سمجھا اور نرنجن سنگھ کو کر اُس کے بدلے میں چار پانچ روپے کا سودا لے گیا...... نرنجن سنگھ ہوشیار چالاک بندہ سے شک ہو گیا کہ یہ ٹل پیتل کا نہیں ہے۔ گھر جا کر اُس نے ٹل کو تپایا اور اُس کا ایک ٹکڑا نیارے کے پاس لے گیا۔ سنیارے نے بتایا کہ یہ خالص سونا ہے۔ بس اُس دن سے ی پانچوں گھی میں اور سر کڑاہی میں ہو گیا۔ ٹل کے ساتھ دو ڈھائی پاؤ کی ایک زنجیر بھی

تھی۔ نرنجن نے یہ زنجیر لاہور جا کر بیچ دی اور کئی ہزار نقد جیب میں ڈالے۔ قصبے پہنچ کر اُس نے وہ چھوٹی حویلی خریدی اور اُسے اچھی طرح سجا بنالیا۔ اب کریانے کی دکان پر بیٹھنا اُسے اچھا نہیں لگتا تھا۔ اُس نے دکان بیچ دی اور شہر میں آڑھت کرنے لگا۔ آڑھت تو بس نام کی تھی جس کے پاس ڈھائی تین سیر سونا ہو اُسے ہاتھ پاؤں ہلانے کی کیا ضرورت ہوتی ہے۔ کچھ دن بعد اُس نے اپنی بیٹی کا بیاہ دھوم دھام سے کیا اور پھر اپنا بر ڈھونڈنے کی کوشش کرنے لگا۔

میں نے لہنا سنگھ سے پوچھا۔ ''تمہیں ان ساری باتوں کا کیسے پتہ چلا؟''

اُس نے کراہ کر پہلو کو تھوڑی سی حرکت دی اور بولا۔ ''اُن دنوں شام سنگھ سے میری ان بن نہیں ہوئی تھی۔ وہ اپنی ہر بات مجھے بتا دیا کرتا تھا۔ اُسے اپنے کسی مخبر کے ذریعے یہ پتہ لگ چکا تھا کہ نرنجن سنگھ کے پاس سونے کا ٹل ہے۔ تین سیر سونا کوئی معمولی شے نہیں تھی۔ چوہدری شام کئی بار سوچ چکا تھا کہ اس سونے پر ہاتھ صاف کیا جائے۔ یہاں تک کہ ایک بار اُس نے میرے سامنے ہی نرنجن کو قتل کرنے کی بات کی تھی۔ اُس وقت وہ نشے میں تھا۔ شاید اب وہ بات اُسے یاد بھی نہ ہو لیکن میں کچھ نہیں بھولا...... اب دو ہفتے پہلے جب نرنجن کا قتل ہوا تو میرا دھیان فوراً شام سنگھ کی طرف گیا۔ مجھے یقین تھا نرنجن کو مار کر ٹل غائب کرنے والا چوہدری شام سنگھ کے سوا اور کوئی نہیں...... تھانیدار صیب! میں نے آپ سے وعدہ کیا تھا کہ جھوٹ نہیں بولوں گا۔ میں اپنا وعدہ نبھا رہا ہوں۔ اب شام سنگھ کو پھانسی کے تختے پر پہنچانا آپ کا کام ہے...... میں نے ایک دن شام سنگھ سے ملاقات کی اور اُسے صاف لفظوں میں کہا کہ جو کرتوت اُس نے کی ہے وہ میری نظر میں ہے۔ اگر وہ چاہتا ہے کہ یہ بات پولیس تک نہ پہنچے تو میرا حصہ مجھے پہنچا دے۔ چوہدری شام اندر سے بہت آگ بگولہ ہوا لیکن اُس نے اپنا غصہ مجھ پر ظاہر نہیں ہونے دیا۔ کہنے لگا کہ وہ ایک دو روز میں جواب دے گا۔ تین چار روز بعد میں نے اُسے پھر پیغام بھیجا۔ میں نے اشاروں کنایوں میں پیغام بھیجا تھا۔ اُس نے بھی اشاروں کنایوں میں جواب دیا کہ ابھی ایک دو روز اور صبر کرو۔ اسی دوران مجھے پتہ چل گیا کہ شام سنگھ کی بیٹھک میں مجھے جان سے مارنے کا پروگرام بن گیا ہے۔ میں نے فوراً تھانے آنے کا فیصلہ کیا مگر آپ تک پہنچنے سے پہلے ہی مجھے پکڑ لیا گیا۔''

میں نے لہنا سنگھ سے کہا۔ ''لہنا! ایک بات بتاؤ۔ جب تمہیں کئی مہینے پہلے ہی پتہ لگ گیا تھا کہ نرنجن سنگھ کے پاس سونا کا ٹل ہے اور شام سنگھ کی نظر اُس ٹل پر ہے تو تم نے خود وہ ٹل حاصل کرنے کی کوشش کیوں نہ کی؟''

لہنا بولا۔ ''آپ نے بڑا ٹھیک سوال پوچھا ہے جی...... سچی کھری بات یہ ہے کہ چوہدری شام سنگھ کی طرح مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ میں نرنجن کا دھڑن تختہ کر کے اُس سے ٹل چھین لیتا۔ اگر میں نرنجن کو ڈرا دھمکا کر حصہ وصول کرنے کی کوشش کرتا تو بات بگڑ بھی سکتی تھی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ نرنجن ویسے ہی کہیں غائب ہو جاتا اس لیے میں خاموش رہا۔ مجھے پکا یقین تھا کہ آج نہیں تو کل چوہدری شام سنگھ نرنجن پر ہاتھ ڈالے گا...... اور جب وہ ہاتھ ڈالے گا تو میں بھی اپنا حصہ وصول کرلوں گا۔''

میں نے پوچھا۔ ''تمہارے خیال میں اب وہ ٹل کہاں ہے؟''

لہنا بولا۔ ''شام سنگھ نے اُسے حویلی میں کہیں چھپا رکھا ہوگا۔ ویسے یہ بھی ہوسکتا ہے کہ معاملہ دیکھ کر اُسے کہیں غائب کر دیا گیا ہو۔''

اب وقت ضائع کرنا مناسب نہیں تھا۔ میں نے لہنا سنگھ سے چند مزید باتیں پوچھ کر گفتگو ختم کی اور فوراً امرتسر سے واپس ڈھاب روانہ ہو گیا۔ ڈھاب پہنچتے ہی ہم نے چوہدری شام کی حویلی کا رخ کیا۔ چوہدری شام اور اُس کا ایک بھائی گرفتار تھے۔ لہٰذا چوہدریوں کی اکڑفوں بھی بہت کم رہ گئی تھی۔ میرے کہنے پر حویلی کی عورتیں پردے میں چلی گئیں اور ہم تلاشی کے لیے اندر گھس گئے۔ قریباً دو گھنٹے تک ہم نے پوری تسلی سے حویلی کے کونے کھدرے دیکھے۔ اہل خانہ کی موجودگی میں صندوقوں الماریوں وغیرہ کے تالے کھلوا کر بھی تلاشی لی گئی لیکن کام کی چیز ہاتھ نہیں آئی...... ہم قریباً مایوس ہو چکے تھے جب اچانک ٹل مل گیا۔ اُسے ڈھونڈنے والا میرا ایک مریل سا سپاہی تھا۔ اُسے چاولوں سے بھرے ہوئے ایک مٹکے پر شک گزرا۔ یہ مٹکا دوسرے برتنوں سے الگ ایک تنگ و تاریک کوٹھڑی میں رکھا تھا۔ اُس نے ہمت کر کے مٹکے کے چاول فرش پر الٹے تو نیچے سے سونے کا ٹل نکل آیا۔

ٹل کو دیکھ کر ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ وہ ایک طویل عرصہ زمین میں دفن رہا ہے۔ اُس کے کناروں پر تین طرف گھنگھرو سے بندھے ہوئے تھے۔ ایک طرف کے گھنگھرو گر چکے تھے...... موٹی زنجیر کا اب صرف ایک حلقہ باقی تھا۔ باقی معلوم نہیں یہ کس عبادت گاہ کا گھنٹہ تھا؟ کن کے ہاتھوں نے کس دور میں اُسے بنایا تھا اور کب یہ زمین بُرد ہوا تھا؟ ممکن تھا یہ کسی راجے مہاراجے کے لاؤ لشکر کا حصہ ہو، کسی ہاتھی کے گلے میں جھولتا یا کسی چلتے پھرتے مندر میں سجایا جاتا ہو...... کسی کو کچھ پتہ نہیں تھا۔ اہم بات صرف ایک ہی تھی اور وہ یہ کہ یہ ٹل سونے کا تھا۔ سونا جس کے بدلے میں روپیہ ملتا ہے اور روپیہ جو اپنی پہچان آپ ہوتا ہے۔ جو کسی کا نہیں ہوتا اور سب کا ہوتا ہے۔ جس کے لیے جان لی بھی جاتی ہے اور دی بھی جاتی ہے۔

میں نے اس خونی ٹل کو ایک میز پوش میں لپیٹا اور احتیاط کے ساتھ اپنے پاس محفوظ کرلیا۔ میرا خیال ہے کہ میں یہاں آپ کو اس ٹل کی قیمت کا تھوڑا سا اندازہ کرادوں گا اگر اس کا وزن ڈھائی سیر بھی مان لیا جاتا (حالانکہ ڈھائی سیر سے کچھ زیادہ تھا) تو آج کل کے حساب سے وہ کم وبیش دس لاکھ روپے کا تھا...... اب سب سے اہم سوال یہ تھا کہ یہ ٹل کس کا اور کہاں سے ملا ہے؟ اور آیا لہنا سنگھ کا یہ بیان درست ہے کہ نرنجن سنگھ کو یہ ٹل کوئی بدنصیب چار پانچ روپے میں بیچ گیا تھا؟ اس سوال کا جواب اسی صورت میں مل سکتا تھا کہ ٹل کی سرِعام نمائش کردی جائے...... کوئی ایسی شے پولیس کے ہاتھ لگ جائے تو پھر اُس کا خدا ہی حافظ ہوتا ہے۔ یہ تو ہزاروں روپے کا سونا تھا۔ دو تین سو کی شے بھی اکثر کھڈے لائن لگ جاتی ہے اور پھر ڈھونڈنے سے بھی اس کا سراغ نہیں ملتا۔ اتنا قیمتی ٹل دیکھ کر میرے عملے میں سے کئی بندوں کے دل کچے پکے ہونے لگے تھے لیکن میری طبیعت کا بھی انہیں پتہ تھا۔ لہٰذا اپنی نیتوں کو ٹھیک رکھنے کے سوا اُن کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔ ٹل کی برآمدگی کاغذوں میں درج کی گئی اور پھر اُسے قصبے کے چوراہے میں نمائش کے لیے رکھ دیا گیا۔ اس نمائش کا خاطر خواہ نتیجہ نکلا اور آدھ پون گھنٹے بعد ہی ایک شخص نے اُسے شناخت کرلیا۔ وہ قصبے کا ہی ایک رنگ ساز تھا۔ اُس کی دکان نرنجن سنگھ کی دکان کے پاس ہی تھی۔ وہ کچھ دیر ٹل کو ہاتھ میں لے کر اور الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا پھر بولا۔

''تھانیدار صاحب! یہ ٹل تو میں نے عزیزے کے پاس دیکھا تھا۔''

میں بھونچکا رہ گیا۔ ''کس عزیزے کے پاس؟''

''وہی جی صغراں کا خاوند اللہ بخشے چاچے سلطان کا بیٹا۔'' رنگ ساز نے وضاحت کی۔

''کب دیکھا تھا؟'' سب انسپکٹر رشید نے تیزی سے پوچھا۔

وہ دماغ پر زور دینے لگا۔ ''یہی جی بیساکھی سے ایک ڈیڑھ مہینہ پہلے کی بات ہے۔ میں...... نرنجن سنگھ کی دکان پر ہی کھڑا تھا۔ وہاں عزیز اپنے چھوٹے کاکے کو گودی میں اٹھائے ہوئے آیا۔ اُس وقت عزیز کے پاس یہی ٹل تھا۔ اُس وقت ٹل کا رنگ کچھ کالا تھا اور مٹی وغیرہ بھی لگی ہوئی تھی۔ نرنجن نے اُسے جھاڑ کر ترازو میں ڈالا تھا اور تول کر تین چار روپے کا بتایا تھا...... پھر میری اپنی دکان پر گاہک آ گیا اور میں چلا گیا۔ پتہ نہیں بعد میں نرنجن اور عزیزے میں کیا بات ہوئی۔''

یہ ایک سنسنی خیز اطلاع تھی۔ یہ ہزاروں روپے کا ٹل اُس عزیزے کا تھا جس کی بیوی ایک ایک کوڑی کو ترس رہی تھی اور جو خود قتل کے الزام میں جیل میں بند پڑا تھا۔ عزیزے نے

یہ ٹل کہاں سے حاصل کیا اور وہ کیوں اُس کی اصلیت نہ جان سکا۔ یہ اور اس جیسے بہت سے سوالات ذہن پر یلغار کررہے تھے۔ ان سوالوں کا جواب اس وقت صرف صغراں دے سکتی تھی۔ میں نے صغراں کی تلاش میں اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی لیکن وہ مجمعے میں نہیں تھی۔ میں نے بلال شاہ سے کہا کہ وہ عزیزے کی بیوی کو فوراً گھر سے بلا کر لائے۔ بلال شاہ قریباً دس منٹ بعد واپس آیا۔ اس نے بتایا کہ عزیزے کی بیوی بچے گھر میں نہیں ہیں۔ دروازے پر تالا لگا ہوا ہے۔ اڑوس پڑوس والوں کو بھی کچھ پتہ نہیں کہ وہ کہاں گئے ہیں اور کب آئیں گے۔

یہ صورتِ حال پریشان کن تھی۔ اس تنگدستی کی حالت میں صغراں کہاں جاسکتی تھی۔ اس کے پاس تو امرتسر پہنچنے کا کرایہ بھی نہیں تھا کہ خاوند سے جیل میں ملاقات کرسکتی۔ ذہن میں کئی خدشے سر اٹھانے لگے۔ صغراں جیسی عورتیں مایوسی کی حالت میں کبھی کبھار بڑے خطرناک کام کرجاتی ہیں۔ میرے ذہن میں ایک پرانے واقعے کی یاد تازہ ہوگئی۔ مصیبت کی ماری ایک ایسی ہی عورت نے اپنے پانچ بچوں سمیت امرتسر کی نہر میں کود کر خودکشی کرلی تھی۔ تین بچے تو صغراں کے بھی تھے۔ اُس کا خاوند جیل میں تھا اور وہ فاقوں سے لڑ رہی تھی۔ کہیں وہ بھی تو کسی ایسی ہی راہ پر نہیں چل نکلی تھی...... میں نے اس نجس خیال کو فوراً ذہن سے جھٹک دیا اور بلال شاہ سے کہا کہ ہم ابھی اور اسی وقت امرتسر جارہے ہیں۔ بلال شاہ تو پہلے ہی سیر سپاٹے کے لیے تیار رہتا تھا۔ ہم نے سرکاری جیپ نکالی اور امرتسر روانہ ہوگئے۔ ایک ہیڈ کانسٹیبل بھی ساتھ تھا اور اس نے سونے کا ٹل ایک کپڑے میں لپیٹ کر گود میں رکھا ہوا تھا...... امرتسر روانہ ہونے سے پہلے میں نے سب انسپکٹر رشید کو ہدایت کردی تھی کہ وہ صغراں اور اس کے بچوں کا پتہ کرے اور اگر وہ خود گھر واپس آجائیں تو انہیں کہیں جانے نہ دیا جائے۔

ہم امرتسر پہنچے اور وہاں سے جیل آگئے۔ عزیز جوڈیشنل ریمانڈ پر جیل میں تھا۔ میں نے اُس سے ملاقات کی اور اُسے کپڑے میں لپٹا ہوا ٹل دکھایا۔ وہ حیران نظروں سے ٹل کو دیکھتا رہا اور پھر الجھے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''یہ مجھے کیوں دکھا رہے ہیں آپ؟''

میں نے کہا ''چند مہینے پہلے تم نے یہ ٹل نرنجن سنگھ کریانہ فروش کو بیچا تھا؟'' وہ اثبات میں سر ہلانے لگا۔ میں نے پوچھا۔ ''یہ کہاں سے ملا تھا تمہیں؟''

''اپنے گھر سے۔'' اُس نے جواب دیا۔

''کیا یونہی چارپائی پر رکھا مل گیا تھا؟'' میں نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

اُس نے اپنے زخمی بازو کو دوسرے بازو سے سہارا دیا اور ٹھہری ہوئی آواز میں بولا۔ ''یہ بیساکھی سے پہلے کی بات ہے جی۔ میں نے گھر میں ایک دیوار بنانی تھی۔ دیوار کے لیے بنیاد

کھودی ہوئی تھی۔ رات کو تیز بارش ہوئی اور بنیاد میں کیچڑ سا ہو گیا۔ میرا بڑا لڑکا پانچ سال کا ہے۔ وہ کھیلتا کھیلتا بنیاد میں چلا گیا اور وہاں کیچڑ سے یہ ٹل نکال لایا۔ دھو کر دیکھا تو یہ پیتل کا نظر آیا۔ بچے ضد کرنے لگے کہ مٹھائی کھائیں گے۔ میں اسے نرنجن کے پاس لے گیا اور چار روپے کی مٹھائی لے کر بچوں کو کھلا دی لیکن......لیکن آپ مجھ سے یہ سب کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

"تھی کوئی بات۔" میں نے مختصر جواب دیا۔

عزیزے کی آنکھوں میں اب حیرانی اور سنسنی کے ملے جلے جذبات تھے۔ کانپتی آواز میں کہنے لگا۔ "جناب! کہیں یہ ٹل سونے وغیرہ کا تو نہیں؟"

"سونے کا نہیں ہیرے کا ہے۔" میں نے سرد مہری سے جواب دیا اور اُس کے پاس سے واپس آ گیا۔

صغراں گھر میں نہیں تھی۔ ممکن تھا وہ خاوند سے ملاقات کے لیے جیل کا رخ کرتی۔ میں نے ہیڈ کانسٹیبل کو وہیں چھوڑ دیا اور اُسے ہدایت کی کہ وہ یہاں نگاہ رکھے اور اگر صغراں نظر آئے تو اُسے کہیں جانے نہ دے۔ جیل سے فارغ ہو کر میں نے ہسپتال کا رخ کیا۔ لہنا سنگھ کا حال احوال دریافت کرنا تھا۔ جب میں ہسپتال پہنچا تو لہنا سنگھ کی لاش بڑے دروازے کے قریب رکھی نظر آئی۔ وہ اسٹریچر پر پڑا تھا۔ جسم پر چادر کھینچ دی گئی تھی۔ میں نے اُسے اُس کے اکلوتے پاؤں سے پہچانا۔ ہسپتال پہنچنے کے بعد وہ پانچ روز موت و حیات کی کشمکش میں رہا تھا۔ آخر جان ہار گیا تھا۔

چوہدری شام سنگھ اب دوہرے قتل کا ملزم تھا۔ لہنا سنگھ کے نزعی بیان اور حویلی سے ٹل کی برآمدگی کے بعد وہ پوری طرح پھنس گیا تھا۔ بالکل صحیح کہا گیا ہے کہ سونا غارت گر ہوتا ہے۔ نرنجن سنگھ کے بعد اب لہنا سنگھ بھی انجام کو پہنچا تھا اور یہ دونوں جاتے جاتے چوہدری شام کو بھی سورگ باشی کرنے کا انتظام کر گئے تھے۔ اُس کہانی والا معاملہ ہو رہا تھا جس میں تین دوستوں کو سونے کی اینٹ ملتی ہے۔ ایک دوست کھانا لینے جاتا ہے تو وہ اُسے قتل کرنے کا پروگرام بنا لیتے ہیں تاکہ اینٹ آدھی تقسیم ہو سکے۔ دوست کو ختم کر کے وہ اُس کا لایا ہوا کھانا کھاتے ہیں تو خود بھی انا للہ ہو جاتے ہیں۔

اب پورا نقشہ میری آنکھوں کے سامنے تھا۔ یہ بات بھی سمجھ میں آ گئی تھی کہ نرنجن سنگھ صغراں اور اُس کے خاوند پر اتنا مہربان کیوں تھا۔ وہ جس دولت پر عیش کر رہا تھا وہ ایک طرح سے صغراں اور عزیزے ہی کی تھی۔ اُس کے دل میں آیا ہو گا کہ بہتی گنگا سے اگر وہ دونوں بھی

ہاتھ گیلے کر لیں گے تو کیا فرق پڑ جائے گا۔ اُس نے نہ صرف صغراں کو گھر میں نوکری دی بلکہ اُس پر مہربانی بھی کرنے لگا۔ گھر میں کھانا زیادہ پکتا تھا اس لیے باقی کھانا صغراں لے جاتی تھی۔ اُس نے صغراں اور اُس کے بچوں کو کپڑے بھی سلوا کر دیئے۔ کسی وقت وہ عزیز کو نقد پیسے بھی دے دیتا تھا۔ صغراں اور عزیز اس سلوک پر خوش تھے۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ جس دریا کے قطرے سے اُن کی زبان گیلی ہو رہی ہے اُس کے سارے پانی پر اُن کا حق ہے۔

دوسری طرف لوگ نرنجن سنگھ کے کردار پر شک کرنے لگے۔ خاص طور پر جب نرنجن نے یہ کہا کہ وہ دوسری شادی کرے گا تو لوگوں کا دھیان خودبخود صغراں کی طرف چلا گیا۔ حالانکہ وہ نرنجن کو چاچا کہتی تھی مگر بولنے والوں کی زبانوں کو کون روک سکتا ہے۔ وہ بولتے رہے اور قصبے میں یہ بات پھیلتی چلی گئی کہ صغراں سکھ ہو جائے گی اور نرنجن اُس سے شادی کر لے گا۔

اب مسئلہ صغراں کو ڈھونڈنے کا تھا۔ وہ اپنا کوئی کھوج کھرا چھوڑ کر نہیں گئی تھی۔ سب انسپکٹر رشید کئی جگہ پتہ کر چکا تھا۔ کپورتھلہ اور چندی گڑھ میں بھی عزیزے اور صغراں کے رشتے دار تھے۔ وہاں سے بھی کوئی خیر کی خبر نہیں ملی تھی۔ میں نے اردگرد کے دیہات میں موجود پولیس کے مخبروں کو ہوشیار کر دیا کہ وہ صغراں اور اُس کے بچوں کو تلاش کریں۔

لہنا سنگھ کے نزعی بیان کے بعد عزیزے کے خلاف درج ہونے والے کیس میں کوئی جان نہیں رہی تھی۔ یہ بات اب ثابت ہو گئی تھی کہ چوہدری شام نے نرنجن کو اپنے پالتو غنڈے جھورے کے ہاتھوں مروایا تھا۔ نرنجن کے معدے میں خواب آور دوا پائی گئی تھی جو اُسے کسی نے نہیں کھلائی تھی۔ یہ دوا اپنے معدے میں اتارنے والا وہ خود تھا۔ نرنجن بیٹی سے محبت کرتا تھا۔ جب بیٹی بیاہ کر شوہر کے گھر چلی گئی تو وہ دکھی رہنے لگا۔ اپنے قتل سے تین چار روز پہلے تو وہ بہت پریشان تھا۔ دراصل اُس کی بیٹی شاردا آٹھ دس روز اُس کے پاس رہ کر سسرال واپس گئی تھی۔ وہ بہت اُداسی محسوس کر رہا تھا۔ یقینی بات تھی کہ اُس نے پُرسکون نیند کے لیے وہ گولیاں کھا لیں تھیں۔ اُسی رات جھورا بھی اپنے مشن پر پہنچ گیا۔ اُس کا مشن نرنجن کو قتل کرنا نہیں صرف ٹل حاصل کرنا تھا۔ وہ ٹل نرنجن نے بڑی حفاظت کے ساتھ گھر کی بالائی منزل پر کہیں چھپا رکھا تھا۔ ٹل تلاش کرتے کرتے جب جھورا اس کے کمرے میں پہنچا جہاں نرنجن محوِ خواب تھا تو جھورے کی ٹھوکر سے نرنجن کا حقہ گر گیا۔ کھٹکے سے نرنجن کی آنکھ کھل گئی۔ دوا کے زیرِ اثر ہونے کے باوجود اُس نے ہمت کی اور جھورے پر جا پڑا۔ اُس نے جھورے کو اپنے مضبوط بازوؤں میں جکڑ لیا۔ ماضی میں وہ جندرا پہلوان کہلاتا تھا۔ اُس کے دونوں ہاتھ کسی

تالے ہی کی طرح مخالف کو پھانس لیتے تھے اور بے بس کر کے رکھ دیتے تھے۔ جھورے کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ الٹے لینے کے دینے پڑ رہے تھے۔ ٹل ابھی ملا نہیں تھا اور ٹل والے نے ایسا پکڑا تھا کہ چھوڑنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ تین چار منٹ تک جھورے اور نرنجن میں خوب کش مکش چلی۔ آخر جھورا اپنی کرپان نکالنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے بے دریغ نرنجن کے سینے پر وار کیے اور جب وہ گر گیا تو چھاتی پر چڑھ کر اُسے ذبح کر ڈالا۔

نرنجن کو موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد جھورے کے سامنے کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ وہ پورے گھر میں آزادی سے دندناتا رہا اور آخر بالائی منزل کے ایک کمرے سے ٹل ڈھونڈنے میں کامیاب ہو گیا۔ نرنجن سے ہاتھا پائی کے دوران جھورے کی جیب سے کچھ ریزگاری بھی گری تھی۔ جھورا بہت تیز قسم کا عطر لگاتا اور بہت زیادہ مقدار میں لگاتا تھا۔ اس کے جسم سے عجیب سی بو اٹھتی رہتی تھی جسے وہ عطر میں چھپانے کی کوشش کرتا تھا۔ اس کی جیب سے گرنے والی ریزگاری میں اسی عطر کی خوشبو تھی۔ یوں عزیزے اور صغراں کا اس سارے معاملے سے کوئی تعلق ثابت نہیں ہوتا تھا۔ وہ شروع سے آخر تک بے قصور تھے بلکہ قانونی طور پر دیکھا جائے تو وہ ملزم کی بجائے مدعی تھے۔ مدفون اشیاء کے رائج قانون کے مطابق اگر برآمد ہونے والی چیز کی حیثیت آثارِ قدیمہ کی نہ ہو اور اس پر کسی کی ملکیت ثابت نہ ہوتی ہو تو وہ اُس شخص کی ملکیت تصور ہوگی جس کی زیرِ قبضہ اراضی سے وہ برآمد ہوئی ہو۔ اگر آثارِ قدیمہ کے معاملے میں تھوڑی سی رعایت کر دی جاتی تو یہ ڈھائی سیر پکا سونا عزیزے اور صغراں کا تھا۔ نہ جانے کیوں مجھے محسوس ہوا کہ جیسے صغراں کے معصوم بچے نے وہی کام کیا تھا جو سینکڑوں برس پہلے ایک اور بچے نے صحرا میں ایڑی مار کر کیا تھا۔ اُس لق و دق صحرا سے زمزم کا چشمہ پھوٹا تھا اور اس وقت غریبی کی تپتی ہوئی دھوپ میں سونے کا ایک ٹل چمکا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ اس بچے کے کم عقل ماں باپ خدا کی اس دین کو سمجھ نہیں سکے تھے اور انہوں نے دہلیز پر آئی ہوئی خوشحالی کو اپنی بے خبری کی بھینٹ چڑھا دیا تھا۔

میں نے صغراں اور اس کے بچوں کو تلاش کرنے کے لیے پورا زور لگا دیا۔ بلال شاہ بھی اس مہم میں پیش پیش تھا۔ چند روز بعد جب عزیز بھی ضمانت پر رہا ہو گیا تو تلاش کی سرگرمی اور بھی بڑھ گئی۔ قریباً دو ہفتے بعد ہمیں صغراں کا معمولی سا سراغ ملا۔ پتہ چلا کہ اُسے قریبی قصبے رام پورہ سے مدن وال کی طرف جاتے دیکھا گیا ہے۔ مدن وال کھتریوں کا ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ ڈھاب سے اُس کا فاصلہ پندرہ میل سے کم نہیں تھا۔ یہ کافی دشوار گزار راستہ تھا۔ ہم گھوڑوں پر سوار مدن وال پہنچے۔ وہاں کے سکھ نمبردار آشو سے ملاقات ہوئی۔ آشو نے بتایا

کہ چند روز پہلے گاؤں میں ایک عورت آئی تو تھی۔ سنا تھا کہ وہ بڑی ضرورت مند ہے۔ اُس کے ساتھ بچے بھی تھے۔ گاؤں کے ایک خدا ترس شخص شیر سنگھ نے اُسے گھر میں پناہ دے دی تھی۔ بعد میں پتہ چلا کہ وہ شیر سنگھ کے گھر چوری کر کے بھاگ گئی ہے...... میں نے چوہدری آشو سے کہہ کر اُسی وقت شیر سنگھ کو بلا لیا۔ شیر سنگھ ریٹائرڈ حوالدار تھا۔ لڑائی میں اُس کا ایک پاؤں ناکارہ ہو چکا تھا۔ تاہم وہ بیساکھی کے بغیر ہی جسم کو ہلکورا دے کر چل لیتا تھا۔ اُس نے کہا۔

''انسپکٹر جی۔ میں نے اس کُڑی کو ترس کھا کر گھر میں رکھا تھا۔ میری گھر والی بیمار رہتی تھی۔ میں نے سوچا چلو گھر کا کام کاج کر دیا کرے گی لیکن اُس کے بچے اور میرے بچے سارا دن لڑتے رہتے تھے۔ میں پریشان ہو گیا کہ یہ کیا مصیبت کھڑی ہو گئی ہے۔ میری گھر والی پہلے ہی بے آرام تھی، شور شرابے سے اور بیمار ہو گئی۔ میں نے سوچا کہ یہ کام نہیں چلے گا۔ اُدھر اس کُڑی کو بھی پتہ چل گیا کہ میں اُسے گھر میں نہیں رکھوں گا۔ بس جاتے جاتے وہ کام دکھا گئی۔ میری بیوی کے ایک دو گہنے پڑے ہوئے تھے ٹرنک میں۔ وہ اُس نے نکال لیے اور چھوٹے بچے کے جانگیے میں چھپا دیئے۔ وہ تو واہگرو نے کرپا کی کہ بروقت مجھے پتہ چل گیا نہیں تو وہ دو سوا دو سو روپے کا رگڑا لگا گئی تھی...... میں فوجی بندہ ہوں جی! صاف کھری بات کرتا ہوں۔ مجھے اس پر بڑا غصہ تھا۔ میں نے اُسے چوکی لے کر جانا تھا لیکن پھر محلے داروں کے کہنے سننے پر چھوڑ دیا۔''

میں نے حوالدار سے پوچھا۔ ''اُس نے کیا نام بتایا تھا اپنا؟''

''صغراں!'' حوالدار نے جواب دیا۔ ''کہتی تھی میرا خاوند جیل میں ہے۔ جھوٹے مقدمے میں پھنسا ہوا ہے۔ میں اس سے ملنے امرتسر جانا چاہتی ہوں۔ میرے پاس کرایہ نہیں ہے۔ بات بات پر آنسو بہانے لگتی تھی۔ کوئی دیکھتا تو سوچتا پتہ نہیں کتنی دکھی ہے۔''

حوالدار کے بعد میں نے چند اور افراد سے بھی صغراں کے بارے میں پوچھا۔ انہوں نے تصدیق کی کہ صغراں کے بچے کے جانگیے سے حوالدار کی بیوی کے گہنے نکلے تھے۔ نتیجے میں حوالدار نے صغراں کو تھپڑ مارے اور پھر دھکے دے کر گھر سے نکال دیا۔

میں جانتا تھا صغراں ایسی عورت نہیں ہے۔ یقیناً یہاں بھی اس کے ساتھ کوئی زیادتی ہوئی تھی۔ دل اس بات کو مان ہی نہیں رہا تھا کہ وہ اتنی گر گئی ہو گی۔ بعد میں میرا یہ خیال بالکل درست نکلا۔ شیر سنگھ نے مجبور عورت کی عزت پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی تھی اور ناکام ہو کر اس پر چوری کا الزام لگا دیا تھا۔ صغراں کے بیمار بچے کے جانگیے میں گہنے چھپانے والا وہ خبیث

خود ہی تھا۔ میں نے گاؤں والوں سے دیر تک بات چیت کی لیکن صغراں کی اگلی منزل کے بارے میں کوئی نہ بتا سکا۔ صرف ایک شخص نے اتنا اشارہ دیا کہ وہ پیدل امرتسر جانے کا ارادہ رکھتی تھی۔ امرتسر وہاں سے کم وبیش تیس میل دور تھا۔ چلچلاتی دھوپ میں معصوم بچوں کے ساتھ اتنا طویل سفر کوئی آسان کام نہیں تھا۔ دہ پیدل چل کر ایک ہفتے سے پہلے امرتسر نہیں پہنچ سکتی تھی۔ اُسے اس ''مدن وال'' گاؤں سے گئے تین روز ہوئے تھے۔ اس کا مطلب تھا اگر وہ واقعی امرتسر کی طرف گئی ہے تو کہیں رام پورہ کے آس پاس ہوگی۔

ہم نے رام پورہ کا رخ کیا۔ راستے میں جگہ جگہ رک کر صغراں کے بارے میں پوچھتے بھی رہے۔ جوں جوں صغراں کے ملنے میں تاخیر ہو رہی تھی، میرے دل میں عجیب سے وسوسے گھر رہے تھے...... اس کی غربت ولاچاری آنکھوں کے سامنے گھومتی تھی اور میں خود کو قصور وار محسوس کرنے لگا۔ اور میں اکیلا قصور وار نہیں تھا اُس بے گناہ عورت کو اس حال تک پہنچانے میں کئی مردوں کا ہاتھ تھا۔ وہ مرد جس نے صغراں کو اپنی بہو تسلیم نہیں کیا تھا اور نتیجے میں اُسے اپنے شوہر کے ساتھ مل کر نیا گھر بسانا پڑا تھا۔ وہ کارخانے دار جس نے عزیزے کا ہاتھ ٹوٹنے پر اُس کے دوسرے ہاتھ میں بیس روپے تھمائے تھے اور چلتا کیا تھا۔ وہ مرد جنہوں نے نرنجن اور صغراں کے تعلق پر شک کیا تھا اور اس شک کی وجہ سے اُسے نرنجن کی قاتلہ ٹھہرایا تھا۔ اور پھر میں...... جس کے سامنے صغراں نے اپنے بچے کے سر پر ہاتھ رکھ کر اپنی اور شوہر کی بے گناہی کی قسم کھائی تھی مگر میں اُس پر اعتبار نہیں کرسکا تھا اور اب یہ حوالدار شیر سنگھ جسے گیدڑ سنگھ کہنے کو دل چاہ رہا تھا۔ مجھے اُس وقت بھی نوے فیصد یقین تھا کہ وہ بکواس کر رہا ہے۔ یقیناً اُس نے صغراں کے ساتھ کوئی نامناسب سلوک کیا ہے۔

جیسا کہ میں نے بتایا ہے راستے میں جگہ جگہ رک کر ہم صغراں کے بارے میں پوچھتے جا رہے تھے۔ ''باغاں والی'' یا ''بھاگاں والی'' ایک گاؤں کے قریب سے ہمیں پھر صغراں کا سراغ ملا۔ معلوم ہوا کہ صرف ایک روز پہلے ایک خستہ حال عورت اپنے تین بچوں کے ساتھ جامع مسجد کی سیڑھیوں پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اُس کا ایک بچہ سخت بیمار تھا اور کھینچ کھینچ کر سانس لے رہا تھا۔ عورت چادر میں منہ چھپائے روتی جا رہی تھی۔ اُس نے بتایا کہ وہ امرتسر جانا چاہتی ہے۔ ایک مقامی شخص فضل دین اپنا ریڑھا لے کر رام پورہ کی طرف جا رہا تھا۔ اُس نے عورت سے کہا کہ وہ اُسے پکی سڑک پر اتار دے گا۔ ہم نے گاؤں میں فضل دین کو تلاش کرایا لیکن وہ نہیں ملا۔ معلوم ہوا کہ وہ اس گاؤں کا نہیں۔ بس کبھی کبھار دودھ لے کر آتا ہے اور پھر کئی کئی روز شکل نہیں دکھاتا۔ میں نے ایک حلوائی سے فضل دین کے ٹھکانے کا پتہ کروایا اور

اپنے اے ایس آئی کو وہاں بھیج دیا۔ تھانے سے نکلے ہوئے اب ہمیں بارہ گھنٹے ہو چکے تھے۔ میرا واپس جانا ضروری تھا۔ گھوڑے بھی سارے دن کی بھاگ دوڑ سے نڈھال تھے۔ ڈوبتے سورج کی روشنی میں ہم نے اُن کے رخ موڑے اور دکھی چال چلتے ہوئے واپس ''ڈھاب'' روانہ ہو گئے۔

میں تھانے واپس پہنچا تو علاقے کے چند معتبر افراد وہاں آئے بیٹھے تھے۔ اُن میں ضلع جالندھر کا ایک نامی گرامی زمیندار عباس خان ویرو بھی تھا۔ عباس خان ویرو کی حیثیت چھوٹے موٹے جاگیردار کی تھی۔ شکار وغیرہ کا بے حد شوقین تھا۔ میں ویرو اور اُس کے ساتھیوں کو اپنے دفتر میں دیکھ کر حیران ہوا۔ بہرحال میری یہ حیرانی جلد ہی دور ہوگئی۔ یہ لوگ ایک نہایت ہی خاص مسئلے پر بات کرنے کے لیے میرے دفتر میں آئے تھے اور وہ مسئلہ تھا عزیزے کے مکان اور اردگرد کے تین چار دوسرے مکان خریدنے کا۔ اُن لوگوں کے لیے یہ بالکل معمولی بات تھی کہ منہ مانگی قیمت پر یہ چند کوٹھے خرید لیتے...... وہ اس زمین پر قسمت آزمائی کرنا چاہتے تھے۔ اُن کی بات سمجھ میں آنے والی تھی۔ اس زمین سے اگر سونے کا ٹل نکلا تھا تو کچھ اور بھی نکل سکتا تھا۔ ممکن تھا یہ ٹل اس سامان کا ایک معمولی حصہ ہو جو یہاں دفن پڑا ہے...... اگر وہاں کھدائی کی جاتی تو یہ بالکل غیر قانونی بات تھی لیکن ایسے غیر قانونی کاموں پر قانون کے محافظوں کو تیار کرنا ویرو جیسے لوگوں کے بائیں ہاتھ کا کھیل۔ وہ یہ کھیل دکھانے کے لیے اپنی جیبیں نوٹوں سے اوورلوڈ رکھتے ہیں۔ خان ویرو کی جیبیں بھی بھری ہوئی تھیں لیکن میں نے اُس کا ہاتھ ان جیبوں تک پہنچنے سے پہلے ہی مفلوج کر دیا۔ میں نے صاف کہہ دیا کہ میں کسی غیرقانونی حرکت کی اجازت نہیں دوں گا چاہے اس کے لیے مجھے کوئی سزا بھی بھگتنا پڑے۔ میرے دوٹوک لہجے نے عباس خان ویرو اور اُس کے ساتھیوں پر گھڑوں پانی ڈال دیا اور وہ بے نیل مرام واپس چلے گئے۔ اُس سے اگلے روز صغراں بھی مل گئی...... لیکن زندہ نہیں، لاش کی صورت۔ ہاں وہ مر چکی تھی۔ دو برس سے غربت کی چکی میں پسی ہوئی عورت مر چکی تھی۔ ایک بدبودار ہسپتال کے جھلسے ہوئے وارڈ میں وہ اپنے بیمار بچے کے بستر سے لگی لگی دم توڑ چکی تھی۔ اُس وقت اُس کے باقی دونوں بچے قریب ہی گرد آلود فرش پر سو رہے تھے۔ صغراں کیسے مری؟ اُسے دل کا دورہ پڑا ہوگا۔ دماغ کی کوئی نس پھٹی ہوگی یا سانس رک گئی ہوگی۔ یونہی تو کوئی نہیں مرتا لیکن کچھ لوگ مر بھی جاتے ہیں۔ ایک بادشاہ بھی تو اپنے بیمار جگر گوشے کے گرد چکر لگاتا ہوا مر گیا تھا۔ مجھے لگا دکھوں کی ماری ہوئی صغراں نے بھی کوئی ایسا ہی عمل کیا ہوگا۔ ورنہ موت کا فرشتہ ایسا بھلکڑ تو نہیں تھا کہ بیمار بچے کی جگہ تندرست ماں کی جان لے جاتا۔

صغراں کی لاش ڈھاب پہنچی تو پورا قصبہ اشک بار تھا۔ ان میں سکھ بھی تھے، ہندو بھی اور مسلمان بھی۔ ان سب لوگوں نے مل کر صغراں پر الزامات لگائے تھے اور پھر اُسے فاقوں کی دلدل میں ڈوبنے کے لیے تنہا چھوڑ دیا تھا۔ آج وہ سب مرد وزن پشیمان تھے اور عزیزے کو دلاسے دے رہے تھے۔

''چپ کر جا عزیزے! خدا کو یہی منظور تھا۔''

''چپ کر جا عزیزے! واہگرو کی یہی مرضی تھی۔''

''حوصلہ کر بھائی! بھگوان کی یہی اِکشا تھی۔''

اور رونے والا روتا چلا رہا تھا، پکارتا جا رہا تھا۔ ''صغراں آنکھیں کھول...... آنکھیں کھول صغراں دیکھ اب ہم غریب نہیں...... دیکھ ہمارے پاس پیسے ہیں...... اب میں تیرے لیے چوڑیاں بنواؤں گا، تیرے بچوں کے لیے کپڑے سلواؤں گا...... اب مان جا صغراں......'' اُس کی آواز پھیلتی اور گونجتی چلی جا رہی تھی...... لیکن جواب دینے والا کوئی نہیں تھا۔

چوہدری شام سنگھ اور جھورا اپنے انجام کو پہنچے۔ اپنے دو ساتھیوں سمیت اُن دونوں پر دہرے قتل کے الزامات ثابت ہوئے۔ 9 اکتوبر 1942ء کو علی الصبح پانچ بجے وہ چاروں ڈسٹرکٹ جیل کے احاطے میں پھانسی چڑھا دیئے گئے...... عزیزا اپنے تینوں بچوں سمیت ''ڈھاب'' چھوڑ کر چلا گیا۔ اُس کے پاس اب معقول رقم تھی۔ وہ ساری زندگی بیٹھ کر کھا سکتا تھا۔ ڈھائی سیر سونے میں سے گورنمنٹ نے اپنے کچھ محصول وغیرہ کاٹے تھے۔ باقی رقم نقد عزیز کے حوالے کر دی گئی تھی۔ ان واقعات کے قریباً چھ ماہ بعد انتظامیہ کی زیرِ نگرانی ڈھاب میں تین چار جگہ کھدائی ہوئی لیکن کسی کو کھوٹا سکہ تک نہیں ملا۔ اگر کچھ ملا تو وہ لکڑی کی چند گلی سڑی شہتیریاں تھیں یا مٹی کے برتنوں کے کچھ ٹکڑے تھے۔

ان واقعات کو ایک زمانہ گزر چکا ہے لیکن بلال شاہ کی طرح میری نگاہ میں بھی کبھی کبھی صغراں کا مُردہ چہرہ گھوم جاتا ہے۔ جو صغراں چلی گئی اُسے تو کوئی واپس نہیں لا سکتا تھا لیکن اس کہانی کے کردار آج بھی ہمارے اردگرد موجود ہیں۔ آپ غور سے دیکھیں۔ کوئی نہ کوئی عزیزا ناکردہ گناہ کی سزا میں جیل بھگت رہا ہوگا۔ کوئی صغراں اپنے بھوکے بچوں کو بہلا بہلا کر سلا رہی ہوگی، کوئی چوہدری شام اپنی حویلی میں بیٹھ کر سازشوں کے جال بُن رہا ہوگا...... صغراں کو آج بھی بچایا جا سکتا ہے کیونکہ صغراں آج بھی مشکل میں ہے۔

☆======☆======☆

باپ، بیٹی اور وہ......

وہ سال کی سب سے چھوٹی رات کو پیدا ہوئی تھی، اس کی آنکھیں گہری نیلی تھیں۔ اس کے باپ کا دعویٰ تھا کہ وہ بڑی معصوم اور قسمت والی ہے اور اس سے دشمنی کرنے والا کوئی بدقسمت ہی ہو گا...... اور پھر ایسا ہی ہوا، ملزم کا دانتوں سے بھنبھوڑا ہوا زخم زخم وجود میرے سامنے بے جان پڑا تھا۔

باپ اور بیٹی کی محبت ایک انمول محبت ہے۔ اس محبت کی جو شدت میں نے ریٹا اور اُس کے ڈیڈی میں دیکھی، کہیں نہیں تھی۔ میں اس عیسائی فیملی کو اچھی طرح جانتا تھا۔ امرتسر میں میری رہائش کے قریب ہی ان لوگوں کی کوٹھی تھی۔ ریٹا کے والد ڈیوڈ جیکسن ایک پیپر مل کے مالک تھے۔ جوانی میں اُن کا کاروبار زوروں پر تھا۔ لاکھوں میں کھیلتے تھے۔ پھر بیوی مرگئی۔ کاروبار سے اُن کا دل اچاٹ ہوگیا۔ انہوں نے اپنی تمام تر توجہ اور محبت کا مرکز کم سن ریٹا کو بنالیا۔ انہوں نے ماں بن کر اُس کی پرورش کی اور زندگی میں اُسے کوئی کمی نہیں ہونے دی، اب ریٹا ایک اٹھارہ سالہ خوبرو دوشیزہ تھی۔ ڈیوڈ جیکسن کا کاروبار ختم ہو چکا تھا۔ مگر اب بھی اُن کے پاس اتنی دولت تھی کہ نہ صرف ریٹا بلکہ اُس کے ہونے والے بچے بھی آرام و آسائش کی زندگی گزار سکتے تھے۔ میرے سرکاری کوارٹر سے کوئی دو ڈھائی فرلانگ دور کشادہ سڑک پر اُن کی شاندار دومنزلہ کوٹھی تھی۔ اس کوٹھی میں ڈیوڈ صاحب اپنے بوڑھے ہندو ملازم گنگو، بیٹی ریٹا اور ایک سفید کتے کے ساتھ خاموشی اور سکون کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ جب میں اُن کی کوٹھی کے سامنے سے گزرتا تو کبھی کبھار اندر سے پیانو بجنے کی خوبصورت آواز آتی۔ مجھے معلوم تھا یہ پیانو ڈیوڈ صاحب کی بیٹی بجاتی ہے اور وہ گھنٹوں بیٹھ کر سنتے رہتے ہیں۔ فارغ وقت میں یہ ڈیوڈ صاحب کا محبوب مشغلہ تھا۔

یہ ستمبر 1942ء کا واقعہ ہے۔ شاید ستمبر کا آخری ہفتہ تھا۔ رات کے کوئی دس بجے تھے۔ میرا نیا اے ایس آئی مشتاق چوہدری کمرے میں داخل ہوا۔ وہ اُس رات معمول کے گشت پر تھا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ باغ رامانند سے اُس نے ایک مشکوک لڑکی پکڑی ہے۔ شاید گھر سے بھاگی ہوئی ہے۔ میں اے ایس آئی کے ساتھ دوسرے کمرے میں پہنچا...... میرے سامنے ریٹا کھڑی تھی۔ اُس نے اسکرٹ پہن رکھا تھا۔ پاؤں میں لمبی جرابیں تھیں اور بال

خوبصورت ربن میں بندھے ہوئے تھے۔ وہ خاصی پریشان نظر آرہی تھی۔ میں نے حیران ہوکر اے ایس آئی سے کہا۔ ''ارے بھئی، یہ تو اپنے ڈیوڈ صاحب کی صاحبزادی ہے۔ تم نے کہاں سے دھرلیا؟''

اب ریٹا کی آنکھوں میں باقاعدہ آنسو تیر رہے تھے۔ اُس نے کہا۔ ''انکل، آپ کا یہ اے ایس آئی نرا جانور ہے۔ بالکل تمیز نہیں ہے اسے۔ میں نے بہت کہا لیکن زبردستی مجھے لے آیا۔''

اس معاملے پر میرا حیران ہونا لازمی تھا۔ میں نے اے ایس آئی کو باہر جانے کا اشارہ کیا۔ پھر ریٹا کو کرسی پر بٹھایا اور جیب سے رومال نکال کر دیا تاکہ وہ آنسو پونچھ سکے۔ وہ ذرا پُرسکون ہوئی تو میں نے کہا۔

''ہاں اب بتاؤ، کیا بات ہے۔ اتنی رات گئے تم باغ میں کیا کر رہی تھی؟''

ریٹا کی اور میری عمر میں بہت زیادہ فرق نہیں تھا لیکن میں اُس کے والد کا دوست بھی تھا لہٰذا وہ مجھے انکل ہی کہتی تھی۔ کہنے لگی۔ ''انکل ہم کالج کی کچھ سہیلیوں نے فلم دیکھنے کا پروگرام بنایا تھا۔ ٹکٹ نہیں ملے اس لیے مجبوراً نو سے بارہ کا شو دیکھنے کا فیصلہ کیا۔ پروگرام کے مطابق میں ساڑھے آٹھ بجے باغ میں پہنچ گئی، لیکن اُن میں سے کوئی بھی نہیں آئی۔ میں نے ساڑھے نو بجے تک ''ویٹ'' کیا اور پھر واپس آنے ہی والی تھی کہ آپ کے مہاشے اے ایس آئی صاحب پہنچ گئے اور کہنے لگے۔

''یہاں بنچ پر بیٹھی کیا کر رہی ہو...... چلو تھانے......''

میں نے بہت سمجھایا لیکن وہ تو کسی کو پہچانتا ہی نہیں۔''

میں نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔ ''سوری ریٹا۔ نیا آیا ہے...... ورنہ تمہیں پریشانی نہ ہوتی۔ میں ابھی اُس سے کہتا ہوں کہ تم سے معذرت کرے۔''

وہ بولی۔ ''بس انکل...... معذرت کی ضرورت نہیں، میں فوراً گھر جانا چاہتی ہوں۔ پاپا جانی بہت پریشان ہوں گے۔''

میں نے کہا۔ ''کہو تو میں چھوڑ آتا ہوں۔''

وہ جلدی سے اٹھتے ہوئے بولی۔ ''اونو...... میں خود چلی جاؤں گی۔''

میرے کہنے پر اے ایس آئی ایک آٹو رکشا لے آیا اور ریٹا اُس پر بیٹھ کر چلی گئی لیکن میں اُس کی طرف سے شک میں مبتلا ہوگیا۔ اُس کی کہی ہوئی بات پر مجھے کچھ یقین نہیں آرہا تھا۔ نوجوان لڑکیوں کا مل کر رات کو آخری شو دیکھنا کوئی معمولی بات نہیں تھی اور اگر فرضِ محال

ایسا تھا بھی تو، پھر اس کی سہیلیاں پہنچی کیوں نہیں تھیں۔ ساری نہیں ایک آدھ سہیلی تو آتی اور
اے ایس آئی کا کہنا تھا کہ جب اُس نے دیکھا تو وہ اکیلی بنچ پر بیٹھی تھی۔ باغ قریباً خالی ہو چکا
تھا اور ایک دو آوارہ لڑکے بھی اُس کے آجو باجو گھوم رہے تھے۔ مجھے شک گزرا کہ وہ کسی
''محبت'' وغیرہ کے چکر میں پڑ گئی ہے۔ شاید وہاں بیٹھی اپنے بوائے فرینڈ کا انتظار کر رہی تھی۔
ویسے کرسچین ہونے کے باوجود ریٹا زیادہ آزاد خیال لڑکی نہیں تھی۔ میں اُسے دو تین سال سے
اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ ایک ذہین، لائق اور پختہ ذہن کی مالک طالبہ تھی۔ حال ہی میں اُس
نے بڑے اچھے نمبروں سے انٹر کیا تھا اور اب پرائیویٹ طور پر بی ایس سی کرنے کا ارادہ رکھتی
تھی۔

کالج میں داخلہ اس لیے نہیں لے سکی تھی کہ انہی دنوں اُس کے والد یعنی ڈیوڈ صاحب
سخت بیمار ہو گئے تھے۔ انہیں معدے کا السر تھا وہ ہسپتال داخل ہوئے۔ وہاں اُن کے دو
آپریشن ہوئے اور وہ کوئی ڈھائی ماہ بستر تک محدود رہے۔ ریٹا کا کردار اور خاص طور پر باپ
سے اُس کا والہانہ پیار دیکھتے ہوئے مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ کسی ایسے چکر میں پڑ سکتی ہے
لیکن کچھ بھی تھا بہرحال وہ جوان تھی اور جوانی کے اُس مرحلے میں تھی جہاں لڑکی یا لڑکا کتنا
بھی پارسا ہو اُن کے سوچنے کا انداز بدل جاتا ہے۔

شاید میں ریٹا کے متعلق اس واقعے کو کچھ دن بعد یکسر بھول جاتا لیکن ایک روز ایسا
اتفاق ہوا کہ میں نئے سرے سے اس معاملے میں دلچسپی لینے پر مجبور ہو گیا۔ کوئی دس پندرہ روز
بعد کی بات ہے۔ سہ پہر کا وقت تھا۔ میں کچہری روڈ سے گزر رہا تھا کہ اچانک میری نظر ریٹا پر
پڑی۔ وہ ایک بس سے اُتر کر تیز قدموں سے فٹ پاتھ پر چلی جا رہی تھی۔ اُس کا انداز مجھے
خواہ مخواہ شبے میں ڈالنے لگا۔ میں اُس وقت سادہ لباس میں تھا لہٰذا اس بات کا خطرہ نہیں تھا
کہ ریٹا مجھے فوراً دیکھ لے گی۔

میں نے اپنا موٹر سائیکل ایک طرف کھڑا کیا اور کچھ فاصلے سے ریٹا کے پیچھے چل دیا۔
وہ کوئی دو فرلانگ چل کر ایک ایرانی ریستوران کے سامنے رکی۔ یہ ایک فیشن ایبل ریستوران
تھا۔ کار پارکنگ میں ایک سُرخ رنگ کی کار کے پاس ایک دراز قد شخص کھڑا تھا۔ اُس کی عمر
اٹھائیس تیس سال کے قریب تھی۔ چوڑے شانے، مضبوط جسم اور سُرخ و سپید رنگت۔ وہ ایک
وجیہہ مرد تھا۔ ریٹا کی طرف دیکھتے ہی وہ مسکرایا۔ پھر دونوں باتیں کرتے ہوئے تیزی سے
اندر چلے گئے۔

میرا شک اب یقین میں بدل چکا تھا۔ ریٹا عشق و محبت کے چکر میں پھنسی ہوئی تھی......

لیکن زیادہ حیرت کی بات یہ تھی کہ اُس کا بوائے فرینڈ اُس سے کم از کم بارہ سال بڑا تھا۔ میں
نے قریب سے گزرتے ہوئے سُرخ رنگ کی گاڑی کا جائزہ لیا۔ وہ ایک ڈاکٹر کی گاڑی تھی۔
اُس کا سفید گون اور اسٹیتھ سکوپ پچھلی سیٹ پر پڑا تھا۔ میں نے گاڑی کا نمبر نوٹ کیا اور
تھانے واپس آ گیا۔

مجھے مسٹر ڈیوڈ سے دلی ہمدردی محسوس ہو رہی تھی۔ اُن کی کُل کائنات ریٹا ہی تھی اور ریٹا
جو راستہ اختیار کر رہی تھی وہ کسی طرح پسندیدہ نہیں تھا۔ میں نے رجسٹریشن آفس فون کیا اور
گاڑی کا نمبر دے کر انہیں مالک کا نام و پتہ معلوم کرنے کی ہدایت کی۔ اگلے روز مجھے سُرخ
کار والے شخص کے تمام کوائف معلوم ہو گئے۔ وہ شہر کا ایک معروف ڈاکٹر تھا۔ میں نے پہلے
بھی اُس کا نام سن رکھا تھا۔ اُس کا پورا نام ممکن لال تیواری تھا۔

ڈاکٹر تیواری گورنمنٹ ہسپتال میں انچارج فزیشن تھا۔ اس کے علاوہ اُس کی پریکٹس
بھی بہت اچھی چلتی تھی۔ خوب کما رہا تھا اور ابھی مزید ترقی کے امکانات تھے...... یہ ڈاکٹر
تیواری سے ریٹا کی شناسائی کیسے ہوئی؟ اچانک میرا ذہن ڈیوڈ جیکسن کی بیماری کی طرف چلا
گیا...... ڈیوڈ جیکسن بیمار ہو کر اسی ہسپتال میں داخل ہوئے تھے۔ پلک جھپکتے ہی ساری بات
میری سمجھ میں آ گئی۔ یقیناً یہ معاملہ اُس ہسپتال سے شروع ہوا تھا۔ ڈیوڈ جیکسن پورے ڈھائی
مہینے اسپتال رہے تھے اور اس دوران زیادہ تر ریٹا ہی اُن کے بستر کے پاس نظر آتی تھی۔ غالباً
یہ ڈاکٹر بطور انچارج فزیشن وہاں آتے جاتے تھے اور اس آمدورفت میں وہ ریٹا کی طرف یا
ریٹا اُن کی طرف یا دونوں ایک دوسرے کی طرف مائل ہو گئے۔ معاملہ مخدوش تھا۔ ڈاکٹر کی عمر
بتاتی تھی کہ وہ شادی شدہ ہو گا۔ اس کے علاوہ وہ دوسرے مذہب کا تھا۔ ریٹا کے ساتھ اُس کا
میل جول کسی طور مناسب نہیں تھا۔ میں نے سوچا کہ بات بگڑنے سے پہلے مجھے اپنے طور پر
ریٹا کو سمجھانا چاہیے۔

☆======☆======☆

ایک روز میں مسٹر ڈیوڈ سے ملنے اُن کے گھر جا پہنچا اُس وقت سہ پہر کے ڈھائی بجے
تھے۔ مجھے معلوم تھا ڈیوڈ صاحب لنچ کے بعد اور ڈاکٹر کی ہدایت کے باوجود شیری کا ایک آدھ
جام چڑھا کر گہری نیند سو رہے ہوں گے۔ اور میں چاہتا بھی یہی تھا۔ میں اندر پہنچا تو ریٹا نے
میرا استقبال کیا۔ وہ ڈھیلے ڈھالے لباس میں بال کھولے بڑی دلکش نظر آ رہی تھی۔ سفید کتا
اُس کی گود میں اٹھکیلیاں کر رہا تھا۔ میرے پوچھنے پر ریٹا نے بتایا کہ پاپا آرام کر رہے ہیں
انہیں کافی دیر ہو گئی ہے میں انہیں جگا دیتی ہوں۔ وہ برآمدے کی طرف بڑھی تو میں نے اُسے

روک لیا۔ ملازم گنگو نے ہمارے لیے لان ہی میں کرسیاں ڈال دیں اور خود چائے بنانے چلا گیا۔ چند رسمی باتوں کے بعد میں جلد ہی اصل موضوع پر آ گیا۔ میں نے ڈھکے چھپے لفظوں میں ریٹا کو بتا دیا کہ میں اُس کی مصروفیات سے آگاہ ہو چکا ہوں۔ اُس کے ہونٹ خشک ہو گئے اور آنکھوں میں پریشانی کروٹیں لینے لگی۔

میں نے کہا۔ ''دیکھو ریٹا! تم مجھے انکل کہتی ہو۔ مجھے بڑا مانتی ہو ناں؟'' اُس نے سادگی سے اقرار میں سر ہلایا۔ میں نے کہا۔ ''یہ راستہ جو تم نے اختیار کیا ہے وہ ٹھیک نہیں۔ اس میں سوائے بدنامی اور جگ ہنسائی کے کچھ تمہارے حصے آنے والا نہیں۔ ذرا سوچو تمہارے پاپا جانی بیمار ہیں۔ جب انہیں پتہ چلے گا کہ اُن کی لاڈلی بیٹی اُن کی بیماری کا فائدہ اٹھا کر یہ کھیل کھیل رہی ہے تو اُن کے دل پر کیا گزرے گی...... میں سمجھتا ہوں ابھی بھی کچھ نہیں بگڑا۔ تم اس راستے سے باآسانی واپس آ سکتی ہو۔ کوئی ایسا راستہ اپناؤ جس میں تمہاری عزت بڑھے اور تمہارے پاپا جانی کا نام بھی روشن ہو۔ انہیں تم سے بڑی امیدیں ہیں۔ اس طرح اُن کی آرزوؤں کو خاک میں نہ ملاؤ......''

ریٹا خاموشی سے میری باتیں سنتی رہی۔ پھر چہرہ ہاتھوں میں چھپا کر سسکیوں سے رونے لگی۔ اُس کے سینے میں جیسے طوفان مچل رہے تھے۔ اس دوران گنگو چائے لے آیا۔ ریٹا نے جلدی جلدی آنسو پونچھ کر چائے بنائی اور خود کو نارمل ظاہر کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ گنگو چلا گیا تو میں نے ریٹا سے پوچھا۔

''کیا میں امید رکھوں کہ تم میری باتوں پر غور کرو گی؟''

ریٹا بے دردی سے اپنا نچلا ہونٹ دانتوں سے کاٹ رہی تھی۔ شاید اُسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ میرے سوال کا کیا جواب دے۔ وہ زبردست الجھن کا شکار نظر آتی تھی۔ دفعتاً برآمدے میں کال بیل کی آواز گونجی۔ گنگو بھاگ کر گیا اور ایک سانولے سے درمیانے قد کے نوجوان کو لے کر اندر آ گیا۔ نوجوان نے چیک دار بوشرٹ اور سفید پتلون پہن رکھی تھی۔ آنکھوں پر سیاہ چشمہ تھا جو اُس نے اندر داخل ہوتے ہی اتار لیا تھا۔ وہ بنگال کا رہنے والا لگتا تھا۔ اُسے دیکھتے ہی ریٹا بری طرح چونک گئی۔ جلدی سے کھڑی ہو کر بولی۔

''آئیے بابو جی، کیسے آنا ہوا؟''

بابو بھائی نے ایک نگاہ غلط مجھ پر ڈالی۔ پھر بولا۔ ''تمہیں بلایا ہے سخت پریشان ہیں۔ آج ہسپتال بھی نہیں گئے۔''

پھر نہ جانے ریٹا نے اُسے کیا اشارہ کیا۔ وہ اچانک خاموش ہو گیا۔ ریٹا اُسے لے کر

ئٹ کی طرف چلی گئی۔ دونوں مدھم لہجے میں کچھ دیر باتیں کرتے رہے۔ پھر ریٹا الجھی ہوئی سی میری طرف آئی۔ کہنے لگی۔ ''انکل مجھے ایک ضروری کام سے جانا ہے۔ میں پاپا جانی کو جگا دیتی ہوں۔ آپ اُن کے پاس بیٹھیں۔''

میں اس کا اشارہ سمجھتے ہوئے بولا۔ ''نہیں بھئی! اب میں بھی جا رہا ہوں۔ ایک دو دن میں پھر آؤں گا۔ میری طرف سے اُن کی خیریت دریافت کرنا۔''

''تھینک یو انکل۔'' ریٹا نے افراتفری میں کہا۔ وہ میرے ساتھ گیٹ تک آئی۔ جونہی میں نے اپنے کوارٹر کا رخ کیا وہ بنگالی بابو کے ساتھ ایک سفید کار میں بیٹھ کر روانہ ہو گئی۔ ریٹا نے مجھے کچھ نہیں بتایا تھا لیکن نووارد شخص کی گفتگو سے میں سمجھ گیا تھا کہ وہ ریٹا کے لیے ڈاکٹر تیواری کا پیغام لے کر آیا ہے اور اب ریٹا اُس کی طرف گئی ہے۔ پیغام لانے والے اس شخص کو میں پہلے بھی کہیں دیکھ چکا تھا۔ شاید ہسپتال میں مسٹر ڈیوڈ کے بستر کے پاس۔ یہ شخص پہلی نظر میں مجھے اچھا نہیں لگا تھا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب طرح کی مکاری تھی اور زبان قینچی کی طرح چلتی تھی۔

چوتھے پانچویں روز مجھے تھانے کے پتے پر ایک رجسٹرڈ خط ملا۔ عموماً گمنام مخبر ایسے خط بھیجتے ہیں۔ میں نے لفافہ چاک کیا تو یہ ریٹا کا خط نکلا۔ تین چار صفحات پر مشتمل اس خط میں کہیں بھی ریٹا کا نام نہیں تھا تاہم صاف ظاہر تھا کہ یہ ریٹا ہی کی تحریر ہے۔ اُس نے لکھا تھا۔

''انکل! مجھے افسوس ہے پرسوں میں آپ کے سوالوں کا صحیح جواب نہ دے سکی۔ میں اپنے رویے پر شرمندہ ہوں اور اُن باتوں پر بھی شرمندہ ہوں جو اب آپ سے کرنے جا رہی ہوں۔ پتہ نہیں مجھے ایسی باتیں آپ کو لکھنی چاہئیں یا نہیں لیکن کیا کروں کوئی ایسا ہمدرد بھی تو نظر نہیں آتا۔ جس سے دل کا حال بیان کرسکوں اور جو مجھے کوئی صحیح مشورہ دے سکے۔ ایک دوست انکل کی حیثیت سے میں سب کچھ آپ کو بتا دینا چاہتی ہوں...... انکل میں نے ڈاکٹر تیواری کو سب سے پہلے پاپا جانی کے سرہانے اُن سے باتیں کرتے دیکھا تھا۔ میں اُن کی شخصیت سے بے حد متاثر بلکہ مرعوب ہوئی۔ آنے والے دنوں میں پسندیدگی کا یہ احساس بڑھتا گیا لیکن یہ احساس صرف پسندیدگی تک ہی محدود تھا۔ پھر پاپا جانی کا پہلا آپریشن ہوا۔ بھاگ دوڑ کے اُن دنوں میں ڈاکٹر تیواری نے ہر طرح ہماری مدد کی اور اپنے خلوص سے ہم لوگوں کے دل جیت لیے۔

بعد میں پاپا جانی کا دوسرا آپریشن کرنا پڑا۔ اُن دنوں ہماری پریشانی عروج

پر پہنچ چکی تھی۔ کچھ سمجھ نہیں آتی تھی کیا کریں۔ کچھ عزیزوں کا خیال تھا کہ یہاں علاج ٹھیک نہیں ہو رہا۔ پاپا جانی کو دوسرے ہسپتال شفٹ کیا جائے۔ کچھ کا خیال تھا کہ بیرون ملک لے جایا جائے۔ کچھ کہتے تھے کہ آپریشن کی ضرورت ہی نہیں۔ گھر میں چار دن کھا پی کر بالکل ٹھیک ہو جائیں گے۔ پریشانی اور کشمکش کے اُس دور میں ڈاکٹر تیواری نے قدم قدم پر میرا ساتھ دیا...... اپنے گھر کے ذاتی فرد کی طرح پاپا کی دیکھ بھال کی...... ہم دونوں بتدریج ایک دوسرے کے قریب آگئے...... یہاں میں اپنی غلطی کا اعتراف کرتی ہوں...... مجھے پتہ بھی نہ چلا کہ کب میرے دل میں تیواری صاحب کے لیے جگہ پیدا ہو گئی ہے۔ جان پہچان تو ہو ہی چکی تھی۔ اب دوستی کا آغاز ہوا...... اور یہ دوستی تھوڑے ہی دنوں میں محبت میں بدل گئی۔

پاپا جانی ہسپتال سے فارغ ہو گئے لیکن ڈاکٹر تیواری سے اُن کا دل کچھ ایسا لگا کہ انہوں نے انہیں اپنا مستقل فیملی ڈاکٹر بنا لیا۔ ڈاکٹر تیواری وقتاً فوقتاً ہمارے گھر آنے لگے۔ ہم دونوں جانتے تھے کہ ہم ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں لیکن اظہار تک نوبت نہیں آئی تھی اور شاید کبھی نہ آتی۔ کیونکہ تیواری اس قدر شریف النفس ہیں کہ شاید آپ گمان بھی نہیں کر سکتے۔ اُن کی شائستگی اُن کے جذبے پر ہر وقت حاوی رہتی ہے۔ ایک روز بابو بھائی کی زبانی مجھے پتہ چلا کہ ڈاکٹر صاحب کی ٹرانسفر ہر ۔ ۔ میں ہو رہی ہے۔

شاید آپ بابو بھائی کے بارے میں نہیں جانتے۔ بابو بھائی ڈاکٹر تیواری کے عزیز ترین دوست ہیں اور اسی ہسپتال میں اکاؤنٹس کے شعبے میں ہیں۔ میرے پوچھنے پر انہوں نے بتایا کہ ڈاکٹر تیواری اپنی ڈیوٹی سے بہت لاپرواہی برت رہے ہیں اور ہفتوں تک ہسپتال کا رخ نہیں کرتے۔ اُن کی پریکٹس بھی دن بدن کم ہوتی جا رہی ہے۔ سگریٹ نوشی کے علاوہ شراب نوشی بھی شروع کر دی ہے...... اور ان تمام مشکلات کی وجہ میں ہوں۔ میں بابو بھائی کی اس بات پر حیران رہ گئی۔ بابو بھائی نے کہا۔

''ریٹا! تم اور صرف تم تیواری کو اس دلدل سے نکال سکتی ہو۔ میں اُس کا دوست ہوں۔ اُس کے دل میں جھانک سکتا ہوں...... وہ تمہاری محبت میں گرفتار ہے۔ وہ تمہیں چاہتا ہے۔ اُس کی چاہت کی وجہ یہ ہے کہ اُس کی زندگی میں ہر

طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ اُس کی بیوی ہرگز اُس کے لائق نہیں۔ وہ ایک مغرور اور بدمزاج عورت ہے۔ وہ تیواری کو گھریلو سکون دے سکتی ہے اور نہ ہی ذہنی خوشی۔ وہ بیوی بچوں میں رہ کر بھی تنہا ہے۔ ازدواجی زندگی کی سچی خوشی سے کوسوں دور ہے۔ اگر تم اُسے سہارا دو تو اُس کی ڈانواں ڈول زندگی بچ سکتی ہے ورنہ آج کا معروف ڈاکٹر کل کا بے کار انسان بن جائے گا اور شاید آئندہ سالوں میں کسی کو اُس کا نام بھی یاد نہ رہے۔''

بابو بھائی کے کہنے پر میں خود ڈاکٹر تیواری کو دیکھنے گئی جو کچھ سنا تھا وہ درست تھا۔ اُن کی حالت دیکھ کر میرے آنسو نکل آئے۔ میں نے اُسی وقت اپنے دل سے عہد کر لیا کہ آج کے بعد کم از کم میری طرف سے ڈاکٹر تیواری کو کوئی دکھ نہ پہنچے گا۔ میں دیر تک اُن کے پاس بیٹھی باتیں کرتی رہی اور جب وہاں سے اٹھی تو، میں سمجھتی ہوں اُن کی زندگی کا رخ بدل چکا تھا۔ بلکہ ہم دونوں کی زندگی کا رخ بدل چکا تھا۔

انکل! میں اعتراف کرتی ہوں کہ وقتاً فوقتاً ڈاکٹر تیواری سے ملتی رہتی ہوں۔ کبھی کبھار وہ پاپا جانی کو دیکھنے آ جاتے ہیں...... میں جانتی ہوں کہ میرے لیے یہ سب کچھ نقصان دہ ہے، لیکن گاڈ جانتا ہے...... میرے بس میں اب کچھ نہیں رہا۔ انکل جب میں یہ الفاظ لکھ رہی ہوں تو میری آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں۔ میں ڈاکٹر تیواری سے محبت کرتی ہوں۔ اتنی زیادہ کہ اب میرا دل کوئی رکاوٹ قبول نہیں کرتا نہ کوئی نقصان مجھے ڈراتا ہے اور نہ کوئی نصیحت مجھ پر اثر کرتی ہے۔

انکل! میں آپ سے معافی مانگتی ہوں جن کا دل کسی نہ کسی طرح میں توڑ رہی ہوں اور جن کی توقعات پر میں پوری نہیں اُتر رہی۔ امید ہے میری مجبوری سمجھ کر آپ مجھے معاف کر دیں گے۔''

ریٹا کے اس خط نے صورتِ حال بہت حد تک واضح کر دی۔ ڈاکٹر تیواری واقعی ایک پُرکشش اور وجیہہ آدمی تھا۔ ایسے لوگوں کے لیے صنفِ نازک کے دل میں گھر کرنا چنداں مشکل نہیں ہوتا لیکن اپنے تیرِ نظر کے لیے اُس نے جو شکار منتخب کیا تھا وہ کسی طور مناسب نہیں تھا۔ اٹھارہ انیس برس کی ایک ادھ کھلی کلی جس کی آنکھوں میں مستقبل کے سہانے خواب تھے۔ جس نے ابھی زندگی کے میدان میں کئی معرکے سر کرنے تھے اور جو ایک بوڑھے باپ کی

واحد محبت تھی۔

بہر حال اس خط سے مجھے یہ بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ مسٹر ڈیوڈ اس معاملے سے بالکل بے خبر نہیں ہیں۔ اُن جیسا جہاندیدہ آدمی بے خبر رہ بھی نہیں سکتا تھا۔ یقیناً یہ ریٹا سے اُن کی شدید اور غیر مشروط محبت تھی جو انہیں چپ رہنے پر مجبور کر رہی تھی۔ ایک طرح سے یہ اس عیسائی فیملی کا ذاتی معاملہ بن جاتا تھا اور کسی طرح بھی قابلِ دست اندازی پولیس نہیں تھا۔ میں نے اس بارے میں ایک روز مسٹر ڈیوڈ سے سرسری سی بات کی لیکن جب اندازہ ہوا کہ وہ اس موضوع کو چھیڑنا نہیں چاہتے تو مکمل خاموشی اختیار کر لی۔

☆======☆======☆

مجھے اس معاملے سے کہیں زیادہ ضروری معاملات درپیش تھے لہٰذا میرا دھیان پھر کئی ہفتوں تک ریٹا اور مسٹر ڈیوڈ کی طرف نہیں گیا۔ ہاں کبھی کبھار اُڑتی ہوئی سی بات کانوں میں ضرور پڑ جاتی تھی۔ سکینڈل خوبصورت لڑکی کا ہو تو افواہوں کو عقاب کے پر لگ جاتے ہیں۔ ایسی ہی تیز رفتار افواہیں چاروں طرف گردش کرتی پھرتی تھیں۔ بے ہودہ افسانے گھڑے اور سنائے جا رہے تھے۔ ایک روز میرے ایک حوالدار نے بتایا کہ اُس نے خود اپنی آنکھوں سے ڈاکٹر تیواری کی سُرخ کار ریلوے لائن کے پار درختوں میں کھڑی دیکھی ہے۔ اُس میں تیواری اور ریٹا موجود تھے۔ جب کچھ لڑکے کار کی طرف گئے تو تیواری کار چلا کر لے گیا۔ چند دن بعد میرے ایک مخبر نے بتایا کہ اُس نے آدھی رات کے وقت تیواری صاحب کو دیکھا وہ ریٹا کو سہارا دے کر اپنی کار سے باہر نکال رہے تھے۔ پھر وہ اُسے سہارا دے کر اُس کے گیٹ تک چھوڑ گئے۔ ریٹا سے چلا نہیں جا رہا تھا وہ بڑی مشکل سے قدم اٹھا رہی تھی۔ ایسی ہی بے شمار الٹ پلٹ باتیں سننے میں آ رہی تھیں۔ وہ برسات کے دن تھے ایک روز میں دوستی کے رشتے سے مجبور ہو کر مسٹر ڈیوڈ کے گھر پہنچا۔

انہوں نے حسبِ معمول بستر پر لیٹے لیٹے نہایت خندہ پیشانی سے میرا استقبال کیا۔ میری نگاہیں شرمندگی سے جھکی ہوئی تھیں لیکن اُن کے چہرے پر خجالت کے کوئی آثار نظر نہیں آتے تھے۔ نہ ہی اُن کے لہجے سے کسی پشیمانی کا پتہ چلتا تھا۔ کوئی اور انہیں اس حالت میں دیکھتا تو سمجھتا کہ وہ بالکل نارمل ہیں اور اپنے افسوس ناک حالات پر انہیں کسی قسم کا دکھ نہیں، لیکن میں انہیں اچھی طرح جانتا تھا۔ مجھے معلوم تھا وہ بہت گہرے انسان ہیں۔ اُن کے دل میں سمندر بھی ہوتا ہے تو آنکھوں میں قطرہ نہیں آتا تھا۔ انہوں نے حسبِ معمول ریٹا کو آواز دی۔

"ریٹو، دیکھو یہ کون آیا ہے؟"

اُن کی آواز سن کر ریٹا ایک نیپکین سے ہاتھ صاف کرتی دروازے پر نمودار ہوئی۔ مجھے دیکھ کر ایک لمحے کو ٹھٹکی۔ پھر "ہیلو انکل" کہہ کر مسکراتی ہوئی ہمارے پاس بیٹھ گئی۔ وہ شاید باورچی خانے میں مصروف تھی۔ ماتھے پر پسینہ تھا اور ہاتھوں پر سفیدہ لگا ہوا تھا۔ ڈیوڈ صاحب چاہتے تو ایک چھوڑ دس نوکر رکھ سکتے تھے لیکن گنگو کے سوا اُن کے گھر میں کبھی کوئی ملازم نہیں آیا۔ اس کی وجہ ریٹا ہی تھی۔ وہ گھر کا سارا کام اپنے ہاتھوں سے کرتی تھی۔ خاص طور پر اپنے پاپا جانی کے کسی کام کو تو وہ دوسرے کا ہاتھ نہیں لگنے دیتی تھی۔ کھانے پینے سے لے کر اُن کے اوڑھنے بچھونے اور پہننے اتارنے تک وہ ہر کام خود بخود انجام دیتی تھی۔ شدید بیماری کی حالت میں مَیں نے اُسے ڈیوڈ صاحب کو بول براز کراتے تک دیکھا تھا۔ کوئی بیٹی اپنے باپ کے اتنا قریب کب ہو گی؟......اس وقت بھی وہ گھر کے کام کاج سے ہلکان ہو رہی تھی۔ ڈیوڈ صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ریٹو! ان کو کولڈ ڈرنک پلاؤ۔ گرم شربت سے تو یہ کوسوں دور بھاگتے ہیں۔ ورنہ ایک آدھ جام ہو جاتا۔"

ریٹا مسکراتی ہوئی اٹھی اور باہر چلی گئی۔ میں دیر تک ڈیوڈ صاحب کی خاموش گہری آنکھوں میں دیکھتا رہا۔ آخر میں نے کہا۔ "ڈیوڈ صاحب! میرے لیے کوئی خدمت ہو تو بتائیں۔"

ڈیوڈ صاحب میرے معنی خیز لہجے کا مقصد سمجھ رہے تھے۔ کہنے لگے۔ "نو تھینک یو۔ اٹ از آل رائٹ۔"

میں نے کہا۔ "ڈیوڈ صاحب! یہ پولیس کیس نہیں ہے لیکن ہو بھی سکتا ہے۔ ڈاکٹر کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ وہ اپنے سے بارہ سال چھوٹی ایک لڑکی کو ورغلائے اور اُس کے لیے اور اُس کے والدین کے لیے بدنامی کا باعث بنے۔ خاص طور پر ایسی صورت میں کہ وہ خود شادی شدہ اور دو بچوں کا باپ ہے۔"

ڈیوڈ صاحب نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ "نواز ڈیئر! تمہاری ہمدردی کا بہت شکریہ۔ میں تو صرف ایک بات جانتا ہوں۔ جو میری ریٹو سے دغا کرے گا وہ کبھی سزا سے نہیں بچے گا۔ تم نے ریٹا کی آنکھیں دیکھی ہیں؟ وہ گہری نیلی ہیں اور وہ سال کی سب سے چھوٹی رات کو پیدا ہوئی تھی یعنی 22 جون کی رات۔ ہمارے بزرگوں کا عقیدہ رہا ہے کہ 22 جون کی رات پیدا ہونے والا بچہ جس کی آنکھیں نیلی ہوں بڑا قسمت والا ہوتا ہے۔ ریٹو بھی

بڑی قسمت والی ہے۔ اس سے دشمنی کرنے والا کوئی بدقسمت ہی ہوسکتا ہے۔''

مجھے معلوم تھا ڈیوڈ صاحب کبھی کبھی مذہبی اور روایتی باتیں بھی کرتے ہیں۔ میں نے کہا۔'' آپ کا عقیدہ اپنی جگہ ٹھیک ہے لیکن...... ڈیوڈ صاحب یہ ایک کمزور لڑکی کا معاملہ ہے۔ اُسے ہماری مدد اور مشوروں کی ضرورت ہے......''

اس سے پہلے کہ میں کچھ اور کہتا ریٹا چائے کی ٹرے اٹھائے اندر داخل ہوئی اور ہم خاموش ہوگئے۔ پھر جتنی دیر میں وہاں رہا بس رسمی باتیں ہوتی رہیں۔ ان باتوں کے دوران میں نے محسوس کیا کہ بے شک ڈیوڈ صاحب اور ریٹا کے چہروں سے کوئی الجھن ظاہر نہیں ہوئی مگر دلوں کی آب وہوا بدلی بدلی تھی۔ باپ بیٹی کا بے مثال رشتہ اپنی جگہ قائم ودائم تھا لیکن اس رشتے کے شیشے پر کوئی دھندسی ضرور چھائی ہوئی تھی۔

میں مسٹر ڈیوڈ سے مل کر واپس آیا تو دل پر ایک بوجھ سا تھا۔ نگاہوں میں مسٹر ڈیوڈ کا باہمت اور بُردبار چہرہ گھوم رہا تھا۔ کیسا عجیب باپ تھا وہ؟ بیٹی کی دی ہوئی ندامت کو بھی اُس کا تحفہ سمجھ کر ماتھے پر سجا رہا تھا۔ اُس کے دیئے ہوئے دکھوں کو اُس کی محبت کا ایک حصہ سمجھ رہا تھا۔

پھر مسٹر ڈیوڈ سے اس ملاقات کو پانچ چھ ہفتے گزر گئے۔ ایک روز شام کے وقت میں تھانے پہنچا ہی تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ میرے اے ایس آئی نے ریسیور اٹھایا اور مجھے بتایا کہ میری کال ہے۔ میں نے ریسیور کان سے لگایا تو دوسری طرف سے مسٹر ڈیوڈ کی نہایت گھبرائی ہوئی آواز آئی۔

''ہیلو مسٹر نواز! اوہ تھینکس گاڈ۔ خدا کا شکر ہے تم مل گئے مجھے اس وقت تمہاری مدد کی شدید ضرورت ہے پلیز...... کسی طرح ریٹو کو روکو۔ وہ پستول لے کر گئی ہے۔ وہ کچھ کر بیٹھے گی۔'' فون پر اُن کے ہانپنے کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔

میں نے کہا۔'' ڈیوڈ صاحب! آپ مجھے اطمینان سے بتائیں، کیا بات ہے؟''

وہ بولے۔'' میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گا نواز خان۔ اس وقت تم اس کو روکو۔ وہ موٹر رکشا پر بیٹھ کر گئی ہے۔ رکشا نمبر 988 ہے۔ وہ ابھی زیادہ دور نہیں گیا ہے...... تم موٹر سائیکل پر جاؤ تو پرل ٹاکیز (سینما) کے آس پاس اُسے پکڑ لو گے۔ پلیز جلدی کرو۔ اُسے ہر صورت میں روکنا ہے۔''

میں نے پوچھا۔'' اُسے جانا کہاں ہے؟''

وہ تیزی سے بولے۔'' الیگزانڈرا گراؤنڈ۔''

میں سمجھ گیا کہ وہ ڈاکٹر تیواری کی طرف گئی ہے۔ ڈاکٹر تیواری کا کلینک الیگزانڈرا گراؤنڈ کے پاس ہی تھا۔ میں نے فون بند کیا اور اپنی موٹر سائیکل کی طرف لپکا۔ چند ہی لمحے بعد میں حتی الامکان رفتار سے پرل ٹاکیز کی طرف اُڑا جا رہا تھا۔ ذہن میں کئی سوال اُدھم مچا رہے تھے جن میں سب سے اہم یہ تھا کہ ریٹا پستول لے کر تیواری کی طرف کیوں گئی ہے؟ بہرحال اس وقت سب سے اہم مسئلہ ریٹا کو پانے کا تھا۔ موٹر سائیکل سڑک پر اُڑی جا رہی تھی اور میری نگاہیں مطلوبہ نمبر کا رکشا ڈھونڈ رہی تھیں۔ پرل ٹاکیز سے کوئی ایک فرلانگ آگے میں نے ریٹا کو جالیا۔ موٹر سائیکل رکشے سے آگے لے جا کر میں نے اُسے روکنے کا اشارہ کیا۔ رکشا رُک گیا۔ مجھے دیکھ کر ریٹا کا رنگ اُڑ گیا۔ وہ اس وقت پتلون قمیص میں ملبوس تھی۔ بال کس کر پیچھے باندھے ہوئے تھے۔ وہ رنج والم کی تصویر نظر آتی تھی۔ میں نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

''ریٹا، نیچے اترو۔ میں تمہیں واپس لے جانے آیا ہوں۔''

وہ زخمی شیرنی کی طرح غرائی۔'' انکل، آپ لوگ میرے راستے سے ہٹ جائیں۔ میں کسی کے روکنے سے نہیں رکوں گی۔''

اُس کا سنگین لہجہ بتا رہا تھا کہ اُس کے ساتھ کوئی المناک حادثہ ہو چکا ہے اور اب وہ زندگی سے اس قدر بے زار ہے کہ کوئی خطرہ اُس کے لیے خطرہ نہیں رہا۔ اُس کی سُرخ آنکھوں میں آنسو شعلے کی طرح چمک رہے تھے اور وہ کسی پُرجلال دیوی کی طرح خوبصورت مورتی نظر آتی تھی، لیکن کچھ بھی تھا وہ ایک لڑکی تھی اور میں تھانیدار۔

وہ مجھ سے جیت نہیں سکتی تھی۔ میں نے پلک جھپکتے میں اندازہ لگا لیا کہ یہ گھی سیدھی انگلیوں سے نہیں نکلے گا۔ اگر میں اس سے زیادہ تکرار کرتا تو لوگ اکٹھے ہو سکتے تھے۔ اگر ہم دونوں میں کھینچا تانی ہوتی تو بھرے بازار میں تماشا بن جاتا۔ جتنا زیادہ ہنگامہ ہوتا مسٹر ڈیوڈ کی اُتنی بدنامی ہوتی۔ پھر اُس کے پاس بھرا ہوا ریوالور بھی تھا۔ طیش کے عالم میں وہ کچھ بھی کر سکتی تھی۔ میں نے دو سیکنڈ کے اندر اندر یہ ساری باتیں سوچیں اور لپک کر رکشے میں سوار ہو گیا۔ دوسرے ہی لمحے میں اُسے کسی چڑیا کی طرح اپنے بازوؤں میں دبوچ چکا تھا۔ وہ مچلی اور زور سے چلائی۔

''انکل چھوڑ دیں مجھے، میں کہتی ہوں......''

اُس کے آخری الفاظ حلق میں گھٹ کر رہ گئے کیونکہ میں نے ایک ہاتھ سے اُس کا منہ بند کر دیا تھا۔ رکشے والا میری آنکھ کے اشارے پر جست لگا کر اگلی سیٹ پر بیٹھا ور پہلے گیئر

میں ہی رفتا کوئی بیس میل فی گھنٹہ تک لے گیا۔ مختلف راستوں پر تیز رفتاری سے سفر کرتے ہوئے ہم مسٹر ڈیوڈ کی کوٹھی کے سامنے رکے۔

مسٹر ڈیوڈ اُس وقت اپنے بیمار جسم کو گھسیٹتے ہوئے ایک تانگے پر سوار ہو رہے تھے۔ ظاہر تھا وہ ریٹا کے پیچھے جا رہے ہیں۔ رکشے میں میرے ساتھ ریٹا کو دیکھ کر وہ تیزی سے نیچے اُتر آئے۔ گنگو نے لپک کر گیٹ کھول دیا۔ میں رکشا اندر پورچ تک لیتا چلا گیا۔ ریٹا ابھی تک بری طرح مچل رہی تھی اور خود کو چھڑانے کی کوشش میں تھی۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اُس جیسی سمجھدار اور پڑھی لکھی لڑکی کو آٹھ دس مہینوں میں یہ کیا ہو گیا ہے۔ ایک سال پہلے کی ریٹا اور آج کی ریٹا میں زمین آسمان کا فرق نظر آ رہا تھا۔ میں اُسے تقریباً کندھے پر اٹھا کر اندر لایا۔ جونہی اندر پہنچ کر میں نے اُس کے ہونٹوں سے ہاتھ ہٹایا وہ دہاڑنے لگی۔ ''مجھے چھوڑ دیں انکل۔ پاپا جانی آپ بھی چھوڑ دیں مجھے۔ میں اُس کو شوٹ کر دوں گی۔ میں اُس کو زندہ نہیں چھوڑوں گی۔'' صاف طور پر سمجھ آ رہی تھی کہ اُس کا اشارہ ڈاکٹر مگن لال تیواری کی طرف ہے۔ وہ اُس کے خون کی پیاسی ہو رہی تھی۔ آج اُس کی معصوم آنکھوں میں حسین خوابوں کی جگہ شعلے رقص کر رہے تھے۔ مسٹر ڈیوڈ رو رہے تھے اور اُسے سنبھالنے کی کوشش کر رہے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ اُسے ایک ننھی سی گڑیا کی طرح اپنی گود میں لے لینا چاہتے ہیں اور یوں اپنے بازوؤں کے گھیرے میں جکڑنا چاہتے ہیں کہ کوئی زندگی بھر اُسے اُن سے جدا نہ کر سکے مگر وہ گڑیا نہیں تھی۔ ایک بپھری ہوئی لڑکی تھی اور اُن کے بوڑھے بازو کمزور تھے۔ اُن کا بیمار جسم ہانپ رہا تھا وہ بے بسی اور بے چارگی کی مکمل تصویر نظر آ رہے تھے۔ میں نے غصے میں بھنا کر ریٹا کو تھپڑ مارا اور وہ چیختی ہوئی اُس پیانو پر جا گری جو کمرے کے وسط میں رکھا تھا۔ ایک پایہ اُس کے سر میں لگا اور تھوڑا سا خون بہہ نکلا۔ وہ جیسے نڈھال سی ہو گئی۔ میں اُسے کندھے پر اٹھا کر اُس کے کمرے میں لے آیا۔

مسہری پر لٹایا تو وہ تکیے میں سر چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ مسٹر ڈیوڈ بے قراری سے مسہری کے چاروں طرف پھر رہے تھے۔ شاید انہیں سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ بیٹی کا دکھ بانٹنے کے لیے کیا کریں۔ کہاں جائیں۔

میں نے ڈیوڈ صاحب کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور انہیں لے کر کمرے سے باہر آ گیا۔ میں نے کہا۔ ''یہ لیجئے ریٹا کا پستول...... اور بہتر ہے کہ فی الحال اُسے اُس کے حال پر رہنے دیا جائے...... غصہ اُتر گیا تو وہ ہماری بات سنے گی اور اپنی سنائے گی بھی۔ ابھی کچھ کہنا سننا فضول ہے...... لیکن ایک بات یاد رکھیے اُس کے کمرے کو باہر سے کنڈی ضرور لگا دیجئے۔ یہ نہ

ہو پھر کوئی مصیبت پڑ جائے...... اور میں تھانے ہی میں ہوں۔ کوئی مسئلہ ہو تو فوراً مجھے کال کر دیجئے۔ باقی صبح تفصیل سے بات کریں گے۔

ڈیوڈ صاحب نے ایک صوفے پر ڈھیر ہوتے ہوئے کہا۔ ''نہیں نواز خان تھانے مت جاؤ۔ میرا دل گھبرا رہا ہے۔ یہیں میرے پاس بیٹھو۔ مجھے اکیلا مت چھوڑو۔''

ڈیوڈ صاحب کی حالت واقعی قابلِ رحم تھی۔ میں نے اُسی کمرے سے تھانے میں اپنے اے ایس آئی کو ٹیلی فون کر دیا کہ میں مسٹر ڈیوڈ کی کوٹھی میں ہوں۔ اگر کوئی ضروری کام ہو تو مجھے رِنگ کر لینا۔

ریٹا کے کمرے میں اب خاموشی تھی۔ میں نے دبے پاؤں جا کر شیشے سے جھانکا۔ وہ نڈھال سی پڑی تھی۔ آنکھیں بند تھیں۔ میں نے بہ آہستگی کمرے کے دروازے کو باہر سے مقفل کر دیا۔ تب میں ڈیوڈ صاحب کے پاس آ بیٹھا۔ گنگو گرم چائے ہمارے سامنے رکھ گیا...... میرے کچھ پوچھنے سے پہلے ہی ڈیوڈ صاحب نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے کہا۔

''نواز خان! وہی ہوا جس کا خطرہ تھا۔ ڈاکٹر تیواری غلط آدمی نکلا۔''

میں نے کہا ''غلط سے آپ کا کیا مطلب ہے؟''

ڈیوڈ جیکسن بڑے آزردہ لہجے میں بولے۔ ''وہ شیطان ریٹو کے معصوم دل سے کھیلتا رہا اور جب جی بھر گیا تو دوسری عورتوں کے پیچھے بھاگنے لگا۔ وہ کلی کلی منڈلانے والا بھنورا ہے۔ میری ریٹو اُس بدذات کی فطرت نہ سمجھ سکی۔''

میں نے کہا۔ ''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟''

وہ بولے۔ ''ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ ڈاکٹر تیواری اب ریٹو کو اگنور کر رہا ہے۔ وہ اُس کے نازک دل پر اپنی بے رخی کے چرکے لگا رہا ہے۔ میں حالات کا یہ رخ کئی دن پہلے دیکھ چکا تھا۔ اپنے طور پر میں ریٹو کو سمجھانے کی کوشش کرتا رہا ہوں لیکن وہ پگلی اپنے دل کے ہاتھوں مجبور تھی۔ جھوٹی آس اور امید کی ڈوروں سے بندھی ہوئی تھی۔ کل اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ اُس نے کالج سے آتے ہوئے ڈاکٹر تیواری کو ایک لڑکی کے ساتھ کار میں جاتے ہوئے دیکھا۔ وہ آگ بگولہ گھر پہنچی۔ اُس نے بنگالی کو ٹیلی فون کیا۔ وہی بنگالی جسے سب بابو...... بابو کہتے ہیں۔ جس وقت وہ غصے میں بھری ہوئی بابو کو ٹیلی فون کر رہی تھی۔ میں ساتھ والے کمرے میں موجود تھا۔ ریٹو کا خیال تھا کہ میں سو رہا ہوں لیکن میری ریٹو انگاروں پر لوٹ رہی تھی تو میں کیسے سو سکتا تھا۔ میں جاگ رہا تھا۔ میں نے ریٹو اور بابو کی باتیں سن لیں۔ ریٹو اُس سے پوچھ رہی تھی کہ آج سہ پہر ڈاکٹر کے ساتھ کار میں جانے والی لڑکی کون تھی؟ جواب

میں بابو اُسے ٹالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پھر دونوں غصے میں بولنے لگے۔ ریٹو بولی ''میں جانتی ہوں وہ کیا کرتا پھر رہا ہے۔ میں نے بہت باتیں سنی ہیں اور سن رہی ہوں ...... تم لوگ جو کچھ کر رہے ہو اچھا نہیں کر رہے......'' ریٹو کی تلخ باتوں کے جواب میں بابو نے شاید اُسے کسی بُرے نام سے پکارا تھا۔ وہ چلا کر بولی '' آوارہ میں نہیں تم ہو۔ دغا بازی بھی تم لوگوں کے حصے میں آئی ہے۔ تم نے قدم قدم پر مجھے دھوکا دیا ہے......'' دوسری طرف بابو نے رابطہ کاٹ دیا تھا۔ ریٹو کچھ دیر خود ہی چیخ چلا کر چپ ہوگئی۔

آج صبح سے وہ اپنے کمرے میں بند تھی۔ نہ کچھ کھایا پیا تھا نہ کسی سے بات کی تھی۔ مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ خاموشی کسی طوفان کا پیش خیمہ ہے......آخر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ وہ پستول لے کر غصے میں بپھری ہوئی نکلی اور ڈاکٹر تیواری کی طرف روانہ ہوگئی۔ وہ میری بیٹی ہے۔ میں اُس کے چہرے سے بھانپ لیتا ہوں کہ اُس کے ارادے کیا ہیں۔ میں نے اُسے روکنے کی بہت کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوا۔ آخر میں نے تمہیں ٹیلی فون کر دیا۔''

مجھے ڈاکٹر تیواری پر رہ رہ کر غصہ آ رہا تھا اور اس سے بھی زیادہ غصہ اُس بنگالی بابو پر تھا۔ واقعات سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ 'بابو' نامی یہ شخص ڈاکٹر کے دست راست کا کردار ادا کر رہا ہے۔ ایک طرح سے ریٹا کو پھنسانے کا کام بھی اُسی نے کیا تھا۔ اُس نے اپنی باتوں سے ریٹا کے دل میں ڈاکٹر کے لیے ہمدردی پیدا کی اور بعد ازاں اُن کے معاملے کو آگے بڑھانے میں ہر طرح کی مدد کی۔ اب یہی بنگالی بابو ریٹا کی بات سننے کا روادار نہیں تھا۔ میں نے دل میں فیصلہ کیا کہ اس شخص کا مزاج ٹھکانے لگا کر رہوں گا لیکن اس سے پہلے میں ڈاکٹر تیواری سے چند باتیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے ڈیوڈ صاحب سے اپنے ارادوں کا قطعاً ذکر نہیں کیا۔ مجھے خدشہ تھا کہ وہ مجھے روک دیں گے۔ میں اُن کے پاس بیٹھا اِدھر اُدھر کی گفتگو کرتا رہا اور جب ریٹا اپنے کمرے میں گہری نیند سوگئی تو میں ڈیوڈ صاحب کی ڈھارس بندھا کر تھانے واپس آ گیا۔

اگلے روز دوپہر کے وقت میں اُس ہسپتال پہنچا جہاں تیواری ملازم تھا۔ اُس کا کمرہ دوسری منزل پر تھا۔ دروازے پر ڈاکٹر مگن لال تیواری کے نام کی پلیٹ لگی ہوئی تھی۔ نام کے نیچے اُس کی ڈگریوں کی فہرست تھی۔

دہلیز پر ایک چوکیدار چوکس کھڑا تھا۔ میں وردی میں تھا اُسے جرأت نہیں ہوئی کہ مجھے روک سکے۔ میں دروازہ کھول کر دندناتا ہوا اندر چلا گیا۔ یہ ایک شاندار کمرہ تھا۔ ڈاکٹر تیواری کی کرسی خالی تھی۔ ہاں میز پر بابو ٹانگیں لٹکائے بیٹھا تھا اور ٹیلی فون پر کسی سے ہنس ہنس کر

باتیں کر رہا تھا۔ میز پر ایک دو ڈھائی سال کا بچہ اٹھکیلیوں میں مصروف تھا۔ حالانکہ ہسپتال کے اس حصے میں بچوں کو لانے کی اجازت نہیں تھی لیکن یہ قانون تو بے چارے عام لوگوں کے لیے تھا۔ تیواری جیسے ڈاکٹر صاحبان اور اُن کے یاروں دوستوں پر اس قانون کا بھلا کیا اثر ہونا تھا۔

مجھے دیکھ کر بابو ذرا سا گھبرا گیا۔ جیسے کوئی چوری پکڑی گئی ہو۔ شاید وہ ہسپتال کے خرچے پر لمبی لمبی کالیں کرنے کا عادی تھا۔ میں نے درشت لہجے میں پوچھا۔

''ڈاکٹر تیواری کہاں ہے؟''

وہ اپنی گھبراہٹ پر قابو پا کر لاپرواہی سے بولا ''بھئی مجھے تو پتہ نہیں میں تو کل مدراس سے آیا ہوں۔ ابھی تک اُن سے ملاقات نہیں ہوئی۔''

میں نے کہا۔ ''میں اُس سے ملنا چاہتا ہوں۔ ضروری کام ہے۔''

وہ رکھائی سے بولا۔ ''آپ نے اُن سے وقت لیا ہوا ہے؟''

میں نے کہا۔ ''پولیس کو وقت لینے کی ضرورت نہیں ہوتی اور تم ذرا اپنے لہجے کو درست کر کے بات کرو۔ مجھے لگتا ہے تمہارے دماغ کو کافی خشکی چڑھی ہوئی ہے۔''

میرے اس فقرے پر اُس کی اکڑی ہوئی گردن کچھ اور اکڑ گئی اور وہ بھینسے کی طرح نتھنے پھلا کر بولا۔ ''ایک تو آپ بغیر اجازت کے اندر گھس آئے ہیں۔ دوسرے تمیز سکھانے کی باتیں کر رہے ہیں۔ آپ کوئی اکیلے ہی تھانیدار نہیں ہیں اس شہر میں، اپنی عزت اپنے ہاتھ ہوتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب اس وقت میٹنگ میں ہیں۔ براہِ مہربانی آپ باہر تشریف رکھیے، جب آئیں گے آپ کو بلا لیا جائے گا۔''

میں نے کہا۔ ''ابھی تو تم کہہ رہے تھے تمہیں ڈاکٹر کا پتہ نہیں اور اب بتا رہے ہو وہ میٹنگ میں ہیں......''

وہ انگلی اٹھا کر بولا۔ ''دیکھیں جی! آپ خواہ مخواہ اپنی وردی کا رعب نہ جھاڑیں۔ ہم کوئی چور لفنگے نہیں، باعزت گورنمنٹ ملازم ہیں......'' اتنے میں شور سن کر ایک نرس اندر آ گئی۔ بابو اُس سے بولا۔ ''سسٹر! چوکیدار کو بلاؤ ان صاحب کو ویٹنگ روم میں بٹھائے، خواہ مخواہ دماغ خراب کر رہے ہیں۔''

میرے اندر پہلے ہی لاوا کھول رہا تھا۔ بابو کے فقرے نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ میرا ہاتھ زور سے گھوما، چٹاخ کی آواز سے ایک تھپڑ بابو کے گال پر پڑا اور وہ اچھل کر میز پر گرا۔ ٹیلی فون سیٹ پھسلتا ہوا پُرشور آواز سے فرش پر جا گرا۔ نرس چیختی ہوئی باہر بھاگی۔ اس سے

پہلے کہ ہسپتال کا عملہ اندر پہنچتا اور ''بابو'' کو چھڑاتا میں تھپڑوں اور مکوں سے اُس کی اچھی خاصی تواضع کر چکا تھا۔

لوگوں نے کھینچ تان کر بمشکل ہم دونوں کو علیحدہ کیا۔ بابو کے ہونٹوں سے خون بہہ رہا تھا اور وہ کبھی اردو اور کبھی بنگالی میں مجھے خطرناک نتائج کی دھمکیاں دے رہا تھا۔ بابو کے چند حمائیتوں نے مجھ پر جھپٹنا چاہا لیکن اُس وقت دو سینئر ڈاکٹر وہاں پہنچ گئے۔ اتفاقاً اُن میں سے ایک میرا واقف کار نکل آیا۔ اُس نے اپنی رعب دار آواز میں ڈانٹ ڈپٹ کر مشتعل افراد کو چپ کرایا اور مجھے اپنے ہمراہ اپنے کمرے میں لے آیا۔ کہنے لگا آپ کو ڈاکٹر کے کمرے میں گھس کر مار پیٹ نہیں کرنی چاہیے تھی۔ خواہ مخواہ مصیبت کھڑی ہو جائے گی۔ یہ لوگ تو ذرا ذرا سی بات پر ہڑتال کر دیتے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''اگر آپ قانون کی بات کر رہے ہیں تو قانون مجھے بھی تھوڑا بہت آتا ہے۔ یہ شخص ڈاکٹر کے کمرے میں گھس کر ٹیلی فون کالیں کر رہا تھا اور دو ڈھائی سال کا بچہ ساتھ بٹھا رکھا تھا۔ یہ کہاں کا قانون ہے؟ اس کے علاوہ یہ لوگ مریضوں کے ساتھ جو جو ''قانونی'' کارروائیاں کر رہے ہیں، آپ سنیں تو آپ کے ہوش اُڑ جائیں گے۔''

میرا واقف کار ڈاکٹر کافی با اثر آدمی تھا۔ اُس نے معاملے کو طول نہیں پکڑنے دیا۔ چار پانچ آدمیوں کو اپنے کمرے میں بلا لیا۔ اُن میں بابو بھی شامل تھا۔ چائے اور بسکٹ وغیرہ منگوائے گئے اور وہیں ہماری صلح کروا دی گئی۔ ڈاکٹر تیواری ابھی تک میٹنگ سے فارغ نہیں ہوا تھا، لہٰذا میں اُس سے ملے بغیر واپس آ گیا۔ واپسی کے وقت بنگالی بابو مجھے قہرناک نظروں سے گھور رہا تھا۔ میرے دل میں بھی اُس کے لیے کچھ کم غصہ موجود نہیں تھا۔ بلکہ یہ غصہ اُس کے غصے سے کہیں زیادہ شدید اور سنگین تھا۔ اس غصے میں ایک بے گناہ لڑکی کی بے چارگی اور بے بسی بھی شامل تھی۔

☆=====☆=====☆

تین چار روز تک میں ڈکیتی کے ایک سنگین کیس میں الجھا رہا اور کسی دوسری طرف دھیان دینے کی بالکل فرصت نہیں ملی۔ چوتھے روز میں علی الصبح تھانے پہنچا تو ایک دھماکہ خیز خبر میری منتظر تھی۔ اے ایس آئی مشتاق چوہدری نے بتایا کہ مسٹر ڈیوڈ جیکسن کے گھر قتل ہو گیا ہے۔ قتل ہونے والا ڈاکٹر مگن لال تیواری ہے۔ اُس کی لاش کوٹھی کے پورچ میں پڑی ہے۔

یک لخت میری نگاہوں میں ریٹا کا لال بھبھوکا چہرہ گھوم گیا۔ اُس کی چیختی ہوئی آواز میرے کانوں میں گونجی۔ ''میں اُسے زندہ نہیں چھوڑوں گی...... میں اُسے شوٹ کر دوں گی۔''

میں فوراً اپنے عملے کے ساتھ موقعۂ واردات پر پہنچا۔ ابھی اجالا پوری طرح نہیں پھیلا تھا۔ کوٹھی کے پورچ میں تین چار افراد کھڑے زمین کی طرف دیکھ رہے تھے۔ یہ لوگ مسٹر ڈیوڈ کے پڑوسی تھے۔ خود مسٹر ڈیوڈ لان کی گھاس پر بے قراری سے ٹہل رہے تھے۔

میں لاش کے نزدیک پہنچا۔ مگن لال تیواری جو سفید قمیص اور نیوی بلیو پتلون میں تھا اوندھے منہ فرش پر پڑا تھا۔ اُس کی چیک دار ٹائی خون اور مٹی میں لتھڑی ہوئی تھی۔ ایک ہاتھ جسم کے نیچے آ گیا تھا جب کہ دوسرا ہاتھ آگے کی طرف پھیلا ہوا تھا۔ اُس کے جسم میں دو گولیاں لگی تھیں۔ ایک گولی بائیں آنکھ ضائع کر کے دماغ میں گھس گئی تھی اور دوسری نے بائیں پہلو میں کوئی چار انچ قطر کا شگاف ڈال دیا تھا۔ ڈاکٹر کی سُرخ گاڑی بھی پاس ہی کھڑی تھی۔ اُس کا اگلا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ یوں لگتا تھا ڈاکٹر جونہی گاڑی سے برآمد ہوا اُسے کوٹھی کے کسی اندرونی کمرے سے شوٹ کر دیا گیا۔ خون اور زخموں کی حالت سے ظاہر تھا کہ یہ واقعہ رات دوسرے پہر کے دوران پیش آیا ہے لیکن اس کی رپورٹ صبح چار بجے کی گئی تھی۔ رپورٹ کرنے والا مسٹر ڈیوڈ کا ایک پڑوسی تھا۔ اُس نے مسٹر ڈیوڈ کی درخواست پر ایسا کیا تھا۔

موقعۂ واردات پر ایک اور عبرتناک منظر بھی دیکھا جا سکتا تھا ڈاکٹر کی لاش چونکہ کئی گھنٹے وہاں پڑی رہی تھی لہٰذا مسٹر ڈیوڈ کا سفید کتا رات بھر اُس کے گرد منڈلاتا رہا تھا اور کبھی کبھی مقتول کو اپنے دانتوں سے بھنبھوڑتا بھی رہا تھا۔ مقتول کی گردن کے پچھلے حصے، اُس کی پشت کے نرم گوشت اور کندھوں پر دانتوں کے نشان اور پنجوں کی گہری خراشیں تھیں۔ سفید قمیص بھی جگہ جگہ سے اُدھڑی ہوئی تھی۔ مجھے مسٹر ڈیوڈ کی بات یاد آئی۔ انہوں نے چند ہفتے پہلے ہی کہا تھا کہ میری بیٹی کو دغا دینے والا اپنی سزا سے نہیں بچ سکے گا...... ایک دکھی باپ کے دل سے نکلی ہوئی بددعا پوری ہوئی تھی۔ اُس کا زخم زخم جسم میرے سامنے پڑا تھا۔ میں نے وقوعہ کا اچھی طرح جائزہ لیا۔ پھر مسٹر ڈیوڈ سے پوچھا۔

''ڈیوڈ صاحب! ریٹا کہاں ہے؟''

وہ کانپ کر بولے۔ ''اُسے تم نے کیا کہنا ہے؟''

میں نے خشک لہجے میں کہا۔ ''ڈیوڈ صاحب آپ بھی جانتے ہیں میں نے اُس سے کیا کہنا ہے۔ وہ اس کیس میں شاملِ تفتیش ہے۔''

وہ روہانسی آواز میں بولے۔ ''نواز خان! وہ بے قصور ہے۔ اُس نے کچھ نہیں کیا۔ کرائسٹ جانتا ہے اُس نے کچھ نہیں کیا۔''

میں نے پوچھا۔ ''تو پھر کس نے کیا ہے؟''

وہ گڑبڑا کر بولے۔ ''بائی گاڈ ہمیں کچھ معلوم نہیں۔ ہم کچھ نہیں جانتے۔ صبح گنگو اٹھا تو اُس نے بتایا کہ پورچ میں ایک ڈیڈ باڈی پڑی ہے اور باہر کا گیٹ کھلا ہوا ہے۔ میں گرتا پڑتا یہاں پہنچا تو ڈاکٹر تیواری مرا پڑا تھا...... میں نے آوازیں دے کر ریٹا کو جگایا۔ وہ گہری نیند سے اٹھی اور تیواری کو مُردہ دیکھ کر اونچی آواز میں رونے لگی۔ وہ اپنے کمرے میں بیٹھی ابھی تک رو رہی ہے......''

میں ریٹا کے پاس پہنچا۔ وہ دونوں ہاتھ گود میں رکھے بستر پر خاموش بیٹھی تھی۔ اُس کی آنکھیں رو رو کر سوجی ہوئی تھیں۔ مجھے دیکھ کر وہ ایک بار پھر ہچکیوں سے رونے لگی۔ میں نے ڈیوڈ صاحب سے کہا کہ میں ریٹا سے تنہائی میں چند باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ وہ میری طرف رحم طلب نظروں سے دیکھتے باہر چلے گئے۔ میں نے ریٹا سے کہا۔

''دیکھو ریٹا! بہتر یہی ہے کہ مجھے سب کچھ صاف صاف بتا دو۔ اسی میں ہم سب کی بھلائی ہے۔ یہ کوئی ایسا معاملہ نہیں ہے جو چھپانے سے چھپ سکے گا۔ جھوٹ بولنے سے میری اور تمہاری مشکلات میں اضافے کے سوا اور کچھ نہیں ہوگا۔''

ریٹا نے چہرہ چھپا کر روتے ہوئے کہا۔ ''مجھے کچھ معلوم نہیں انکل...... میں کچھ نہیں جانتی میں نے کسی کو قتل نہیں کیا۔''

میں نے کہا۔ ''ریٹا یہ تو وہ بیان ہے جو تمہارے پاپا جانی نے تمہیں پڑھایا ہے۔ میں وہ بیان چاہتا ہوں جو سچا ہو اور جو تمہارے دل سے نکلے...... کسی سخت گیر پولیس آفیسر کے سامنے سچ بولنے سے بہتر ہے کہ اپنے انکل کے سامنے سچ بول دو......''

ریٹا روتے ہوئے ایک بار پھر نفی میں سر ہلانے لگی۔ ''نہیں انکل...... میں نے کچھ نہیں کیا۔ میں نے کسی کا خون نہیں کیا......''

اس دوران میرا اے ایس آئی اجازت لے کر اندر آ گیا۔ اُس نے کچھ کاغذات اور دوسری اشیاء میرے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا۔ ''جناب! یہ چیزیں کار کے ڈیش بورڈ سے ملی ہیں۔''

میں نے دیکھا ان اشیاء میں سگریٹ لائٹر، سگریٹ کا پیکٹ، دھوپ کی عینک، کنگھی اور کچھ دوسری اشیاء تھیں۔ اس کے علاوہ ایک پتلی سی کتاب بھی تھی۔ اے ایس آئی نے کتاب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اس میں ایک رقعہ بھی ہے جناب۔ اُس پر ریٹا کا نام لکھا ہوا ہے۔'' میں نے جلدی سے کتاب کھول کر رقعہ نکالا۔ یہ بڑے سائز کی کاپی کا آدھا ورق تھا۔ اُس پر لکھا تھا۔

''آپ شاید مجھ سے ناراض ہیں، لیکن پاپا جانی نے آپ کا کیا بگاڑا ہے۔ وہ بیمار ہیں اور تین چار دن سے آپ کو یاد کر رہے ہیں۔ اپنے قیمتی وقت میں سے چند منٹ نکال کر ایک بار اُن کو دیکھ جائیں، پھر چاہے آئیں، چاہے نہ آئیں۔''

میں نے اے ایس آئی سے پوچھا۔ ''رقعہ کتاب میں تھا؟''

اُس نے کہا۔ ''نہیں جناب! ڈیش بورڈ میں رکھا ہوا تھا۔ کتاب میں تو میں نے ڈالا تھا۔''

میں نے اے ایس آئی کو باہر جانے کا اشارہ کیا اور رقعہ ریٹا کی آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے کہا۔ ''کیا اب بھی تمہیں انکار ہے کہ تم نے اس رقعے کے ذریعے مقتول کو یہاں بلایا ہے۔''

ریٹا نے ایک نگاہ تحریر پر ڈالی اور پھر بال مٹھیوں میں جکڑ کر نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ''یہ جھوٹ ہے۔ یہ جھوٹ ہے...... میں نے کسی کو رقعہ نہیں لکھا۔''

چند منٹ بعد میں نے ریٹا کو اُس کے حال پر چھوڑ دیا اور عملے کے ساتھ مل کر آلۂ قتل کی تلاش شروع کر دی۔ معمولی کوشش کے بعد ہم ایک بیڈروم کی الماری سے ڈبل بیرل بندوق برآمد کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ بارہ بور کی ایسی ہی بندوق سے مقتول پر فائرنگ کی گئی تھی۔ جب ہم نے بندوق برآمد کی تو وہ بکس میں بند تھی لیکن بکس کی حالت سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ بہت دیر سے مقفل نہیں ہے۔

اسی دوران مقتول کے کچھ لواحقین بھی روتے پیٹتے پہنچ گئے۔ ان میں مقتول کا والد، اُس کی بیوی اور دوست بھی شامل تھے۔ میں نے لاش پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوا دی اور حاضرین سے بیان لینے شروع کیے۔ میرے نکتہ نظر سے سب سے اہم بیان علاقے کے چوکیدار کا تھا۔ دوسرے نمبر پر اہم بیان ڈاکٹر تیواری کے دوست ''بابو'' کا تھا۔ بابو کا بیان مندرجہ ذیل تھا۔

''ریٹا کل سہ پہر کوئی ساڑھے تین بجے میرے گھر پہنچی تھی۔ اُس نے کہا کہ وہ دو دن سے ڈاکٹر تیواری سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہی ہے لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ اُس نے ایک رقعہ دیتے ہوئے مجھ سے درخواست کی کہ میں یہ ڈاکٹر صاحب تک پہنچا دوں۔ (رقعے کا مضمون وہی تھا جو ہماری نظر سے گزر چکا تھا) میں نے آفس ٹائم کے بعد ڈاکٹر تیواری کو گھر پر فون کیا تو پتہ چلا کہ وہ بیوی بچوں کے ساتھ شادی کے ایک فنکشن میں گئے ہیں اور رات دس بجے تک لوٹیں گے۔ میں نے چونکہ ریٹا سے وعدہ کر رکھا تھا لہٰذا میں نے سوا دس بجے تیواری کو

دوبارہ رِنگ کیا۔ وہ گھر آ چکے تھے۔ میں نے انہیں ریتا کی آمد اور اُس کے پیغام کے بارے بتایا۔ اُن کی آواز سے تھکاوٹ ظاہر ہو رہی تھی مگر کہنے لگے۔ ''اچھا میں کپڑے بدل کر ابھی آتا ہوں۔'' کوئی آدھ گھنٹے بعد اُن کی گاڑی میرے مکان کے سامنے رکی۔ میں نے باہر ہی آکر اُن سے بات چیت کی اور رقعے کے ساتھ ریتا کا زبانی پیغام بھی انہیں دے دیا۔ وہ زیادہ دیر رکے نہیں اور ریتا کی طرف چلے آئے......''

''بابو'' کے اس بیان سے حالات پر کافی روشنی پڑتی تھی۔ علاقے کے پٹھان چوکیدار کا بیان بھی اس بیان کی تصدیق کرتا نظر آتا تھا۔ اُس نے بتایا کہ وہ حسبِ معمول گشت پر تھا۔ رات سوا گیارہ اور ساڑھے گیارہ کے درمیان ایک سُرخ کار تیزی سے مسٹر ڈیوڈ کی رہائش گاہ کی طرف جاتی نظر آئی۔ اس کے بعد کچھ فاصلے سے اُسے دو یا تین فائر کی آواز سنائی دی۔ اس نے سوچا کہ شادیوں کا سیزن ہے۔ شاید کسی شادی والے گھر سے فائرنگ کی گئی تھی......اس کے بعد وہ دیر تک سڑک پر ٹہلتا رہا لیکن سُرخ کار دوبارہ نظر نہیں آئی۔ چوکیدار کے بیان کی تصدیق ایک ہمسائے نے بھی کی۔ اُس نے کہا کہ رات کے کسی پہر اُس نے فائرنگ کی آواز سنی تھی لیکن یہ فائرنگ کتنے بجے ہوئی اور کتنے فائر ہوئے وہ اس کے بارے میں کچھ نہ بتا سکا۔

بہر حال اب شک وشبے کی گنجائش بہت کم رہ گئی تھی۔ حالات اور واقعات صاف طور پر جس کی طرف اشارہ کر رہے تھے وہ ریتا تھی۔ اُس نے اپنی بربادی کا انتقام لیا تھا اور کئی ماہ تک اپنے دل اور جسم سے کھیلنے والے ہرجائی عاشق کو زندگی کی سرحد پار کرا دی تھی۔ اب وہ اپنے جرم کو مانتی یا نہ مانتی اس سے کوئی فرق پڑنے والا نہیں تھا۔ وہ انتہائی قدم اٹھا چکی تھی اور اب اُسے انصاف کی اندھی تلوار کا سامنا کرنا تھا۔ وقوعہ کے جائزہ سے یہ بات سمجھ میں آتی تھی کہ جس وقت ڈاکٹر تیواری کار لے کر اُن کی کوٹھی پر پہنچا، ریتا کوٹھی کے ایک اندرونی کمرے میں بھری ہوئی بندوق کے ساتھ موجود تھی۔ پروگرام کے مطابق اُس نے کوٹھی کا بیرونی گیٹ پہلے سے کھول رکھا تھا تاکہ تیواری کو کال بیل بجانے کی زحمت نہ ہو۔ جونہی ڈاکٹر گاڑی سے نکل کر اندرونی حصے کی طرف بڑھا۔ اُس نے اُسے شوٹ کر دیا۔

☆======☆======☆

ریتا جوڈیشنل ریمانڈ پر جیل پہنچ چکی تھی۔ میں جلد از جلد چالان مکمل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کیس بظاہر صاف تھا لیکن میں اپنے طور پر کوئی گوشہ تاریک چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ یہ عین ممکن تھا کہ ڈاکٹر تیواری کو کسی اور وجہ سے قتل کیا گیا ہو اور قاتل بھی کوئی اور ہو۔ یہ بھی

ممکن تھا کہ اُسے کہیں اور سے مار کر مسٹر ڈیوڈ کے گھر ڈال دیا گیا ہو آخر اُس کے بہت سے رقیب اور دشمن موجود تھے۔ کوئی کاروباری رقابت یا گھریلو جھگڑا بھی اس واردات کا سبب ہو سکتا تھا۔ اس کیس کی تفتیش میں دو نکتے ایسے تھے جو مجھے کبھی کبھی سخت الجھن میں ڈال دیتے تھے۔ پہلی بات تو یہ کہ ریتا اپنے جرم سے انکار کر رہی تھی۔ اُس کے انکار کو ایک عام مجرم کا انکار سمجھ کر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ تفتیش کے دوسرے ہفتے جب میں اُس سے ملنے جیل پہنچا تو وہ آہنی سلاخوں سے لپٹ کر زور زور سے رونے لگی۔ اُس نے کہا۔ ''انکل! مجھے آپ سے یہ امید نہیں تھی۔ کیا آپ بھی یہ سمجھتے ہیں کہ ریتا جھوٹ بولتی ہے۔ اب ریتا مر ہی جائے تو اچھا ہے۔ اب ریتا کو مر ہی جانا چاہیے۔ مجھے اپنے ہاتھوں سے گولی مار دیں انکل۔ میں ان جیلوں میں سڑنا نہیں چاہتی۔'' اس کے بعد اُس نے کوئی اور بات نہیں کی تھی اور یہی کہتی رہی تھی کہ اگر آپ کے خیال میں میں مجرم ہوں تو پھر مجرم ہی ہوں۔ بس مجھے جلدی سے پھانسی دلوا دیجئے تاکہ میری مشکلوں سے میری اور میرے پاپا جانی کی جان چھوٹ سکے۔

اس کیس کا دوسرا پریشان کن نکتہ یہ تھا کہ مقتول کی کار کے ڈیش بورڈ میں ایک ڈیڑھ سو صفحے کی انگریزی کتاب پائی گئی تھی۔ یہ کتاب ڈاکٹری کے بارے میں تھی اور اسے ڈاکٹر تیواری کے ایک ساتھی ڈاکٹر راجندر پال نے لکھا تھا۔ وقوعہ کے روز ڈاکٹر راجندر پال نے اس کتاب کی ایک کاپی ڈاکٹر تیواری کو دی تھی۔ کتاب کے ایک صفحے پر راجندر پال کے دستخط اور تاریخ بھی درج تھی۔ تفتیش سے ثابت ہوتا تھا کہ وقوعہ کے روز سارا دن ڈاکٹر تیواری اور ڈاکٹر راجندر کی ملاقات نہیں ہوئی، ہو بھی نہیں سکتی تھی۔ کیونکہ ڈاکٹر راجندر پال اپنی کتاب کی رُونمائی کے سلسلے میں امرتسر سے باہر گیا ہوا تھا۔ وہ وقوعہ کی رات نو بجے امرتسر واپس آیا تھا۔ اس کا مطلب صاف تھا وہ کتاب مقتول کو اُس وقت دی گئی تھی جب وہ شادی کی تقریب سے واپس آیا اور ''بابو'' سے رقعہ لے کر ریتا کی طرف روانہ ہوا۔ راستے ہی میں ڈاکٹر راجندر کی کوٹھی پڑتی تھی۔ وہ وہاں تھوڑی دیر کے لیے رک گیا اور ڈاکٹر راجندر نے اُسے کتاب دے دی، جسے اُس نے ڈیش بورڈ میں رکھ دیا۔ اس سے ثابت ہوتا تھا کہ مقتول اپنی زندگی میں جس آخری شخص سے ملا وہ ڈاکٹر راجندر پال تھا۔ میری تفتیش سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ماضی میں ڈاکٹر راجندر اور مقتول میں خاصی کاروباری دشمنی رہی ہے۔ وہ ایک دوسرے کی شکل دیکھنے کے روادار نہیں تھے۔ کوئی ایک ماہ پہلے ہی اُن میں بول چال شروع ہوئی تھی۔ ان حالات میں کسی حد تک ڈاکٹر راجندر پر شبہ کیا جا سکتا تھا......اور نہیں بھی کیا جا سکتا تھا۔ مگر ڈاکٹر نے جو بیان دیا تھا وہ اُسے خواہ مخواہ اس کیس میں پھنسا رہا تھا۔ وہ اپنی اس بات پر ڈٹا ہوا تھا

کہ وقوعہ کی رات ڈاکٹر تیواری اُس کے پاس ہرگز نہیں آیا اور نہ ہی اُس تاریخ میں دن کے وقت اُس سے ملاقات ہوئی ہے۔ اس پر میرا سوال تھا کہ پھر کتاب پر دستخط کس کے ہیں؟ اس کا جواب راجندر پال یہ دیتا تھا کہ دستخط کے نیچے اُس نے غلطی سے ایک دن بعد کی تاریخ درج کردی ہے۔ یہ کتاب اُس نے وقوعہ سے ایک دن پہلے ڈاکٹر تیواری کو دی تھی۔

ان دونکتوں کے علاوہ مسٹر ڈیوڈ کا بیان بھی مجھے الجھن میں ڈال گیا جو انہوں نے وقوعہ کے دسویں روز مجھے تھانے آکر دیا۔ گلوگیر آواز میں انہوں نے کہا۔

''نواز خان! میں تمہیں کیسے بتاؤں کہ ریٹا نے یہ مرڈر نہیں کیا۔ میں نے اُسے ماں بن کر پالا ہے۔ میں اُس کی ایک ایک ادا کو سمجھتا ہوں۔ وہ مجھ سے جھوٹ نہیں بول سکتی۔ ہم نے زندگی بھر ایک دوسرے سے جھوٹ نہیں بولا اور شاید کبھی نہ بول سکیں گے۔ حالات اُسے مجرم گردان رہے ہیں لیکن وہ مجرم نہیں ہے۔''

میں نے کہا۔''ڈیوڈ صاحب! میں یہ کیسے مان لوں۔ میں نے اپنے کانوں سے اُسے قتل کا ارادہ ظاہر کرتے سنا ہے۔ اگر اُس روز ہم اُس سے پستول چھین کر اُسے کمرے میں بند نہ کردیتے تو کیا وہ تیواری کو شوٹ نہ کردیتی؟ ضرور کردیتی اور اُس نے کر بھی دیا ہے۔ اُس دن نہ سہی چار دن ٹھہر کر سہی۔''

مسٹر ڈیوڈ نے کراہتے ہوئے کہا۔''انسپکٹر نواز! تم اُس روز کی بات دوہرا رہے ہو اور یہ نہیں جانتے اُس کے بعد کیا ہوا تھا۔ تمہیں کچھ معلوم نہیں۔ سنو! میں ریٹو کو مکمل طور پر پُرسکون کر چکا تھا۔ میں نے اُس سے کہا تھا ریٹو! تیرے پاپا جانی نے زندگی میں کبھی تجھ سے کچھ نہیں مانگا۔ آج ایک چیز مانگ رہا ہوں۔ دیکھو انکار نہ کرنا۔ مجھے میری ایک برس پہلے کی ریٹو دے دو۔ وہی ہنستی کھیلتی ناچتی گاتی ریٹو۔ جو کچھ بھی ہوا تمہارے دل کے ساتھ یا تمہارے جسم کے ساتھ سب کچھ بھول جاؤ۔ سب کچھ فراموش کردو۔ آؤ ہم باپ بیٹی ایک نئی زندگی شروع کریں۔ شملے کی برف پوش چوٹیوں پر جو کاٹیج تم نے بڑی چاہت سے بنوایا ہے، ہمارا انتظار کر رہا ہے۔ آؤ اس شہر کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر اُس کاٹیج میں آباد ہوجائیں...... اُس کی دیواروں میں پناہ لے کر اپنی زندگی کو دکھوں سے دور کردیں۔ وہ کاٹیج ہمارے زخموں پر مرہم رکھ دے گا اور ہماری کھوئی ہوئی خوشیاں لوٹ آئیں گی۔ وہاں صرف میں ہوں گا، گنگو ہوگا اور ہمارا رچی (کتا) ہوگا۔ ہم تمہارے ہاتھ کے پکے ہوئے کھانے کھائیں گے اور تمہارے سنائے ہوئے لطیفوں پر ہنسا کریں گے۔ پھر تم فارغ وقت میں پیانو بجایا کرنا اور میں گھنٹوں بیٹھ کر سنا کروں گا۔

میں ریٹو کو بہت دیر تک سمجھاتا رہا اور آخر دھیرے دھیرے اُس کی آنکھوں سے غیظ و غضب کی سُرخی چھٹ گئی۔ اُس کی نیلی پتلیوں میں امید کی روشن کرنیں چمکنے لگیں...... آخر وہ بھاگ کر مجھ سے چمٹ گئی۔ اتنا روئی کہ اُس کے آنسوؤں سے میری قمیص بھیگ گئی۔ ہچکیوں اور سسکیوں کے درمیان کہنے لگی۔'' پاپا جانی! میرا دل مرچکا ہے لیکن میں آپ کی خاطر زندہ رہوں گی۔ ساری دنیا کو انکار کردیتی لیکن آپ کو انکار نہیں کروں گی۔ آپ کی بات نہیں ٹالوں گی۔ سب کچھ بھول جاؤں گی۔ جو بھول سکتی ہوں وہ بھی اور جو نہیں بھول سکتی وہ بھی......''

میں نے اُسے اپنی گود میں سمیٹ لیا اور دیر تک دلاسا دیتا رہا۔ اُسے سمجھاتا رہا کہ جو کچھ ہوا اُس میں اُس کا کوئی قصور نہیں۔ میری تربیت میں ہی کوئی کمی رہ گئی تھی۔ وہ سسک سسک کر میری گود میں ہی سوگئی۔ اگلے روز ہم نے شملے جانے کی تیاریاں شروع کردیں۔ میں سارا سامان بندھوا چکا تھا۔ ٹکٹ بھی لے چکا تھا کہ روانگی سے ایک رات پہلے تیواری قتل ہوگیا۔ میں ایک باپ ہوں میری بات غور سے سنو نواز خان...... میں پھر تم سے کہہ رہا ہوں میری ریٹو نے یہ قتل نہیں کیا۔ اگر یہ بات جھوٹ ہے تو پھر دنیا میں کہیں سچ نہیں ہے اور کل کا سورج کبھی طلوع نہیں ہوگا......''

ریٹا کا بیمار اور بوڑھا باپ آنسو پونچھتا اور لڑکھڑاتا ہوا تھانے سے باہر چلا گیا اور میری الجھن کو کچھ اور الجھا گیا...... میں ایک روشن کمرے میں بیٹھا تھا لیکن میرے چاروں طرف اندھیرا تھا۔ کوئی راستہ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ میں کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے سوچتا رہا...... اور سوچتا رہا۔ دو روز بعد مجھے ہر صورت چالان مکمل کرکے دینا تھا اور اگر ایک بار تیر کمان سے نکل جاتا تو اُسے واپس لانا خاصا مشکل تھا...... سوچتے سوچتے میرے ذہن میں اچانک ایک بات آئی۔ میں نے میز کی دراز کھول کر کاغذات کے اندر سے وہ رقعہ نکالا جو ریٹا نے ڈاکٹر تیواری کو گھر بلانے کے لیے لکھا تھا اور جس کے بارے میں مجھے ایک سو دس فیصد یقین تھا کہ یہ ریٹا کا ہی تحریر کردہ ہے۔ جیسا کہ میں نے بتایا ہے یہ بڑی کاپی کا قریباً آدھا صفحہ تھا لیکن ایک عجیب سی بات تھی کاغذ کا یہ ٹکڑا صفحے کے درمیان سے نکالا گیا تھا۔ یعنی یہ اوپر نیچے سے پھٹا ہوا تھا۔ نہ ورق کا بالائی حاشیہ نظر آتا تھا اور نہ نیچے والا کنارہ موجود تھا۔ دفعتاً مجھے شک ہونے لگا کہ اس ٹکڑے کو کسی بڑے خط کے درمیان سے نکالا گیا ہے۔ یہ خیال ذہن میں کوندتے ہی میں اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا اور موٹر سائیکل لے کر آندھی و طوفان کی طرح جیل خانے کی طرف لپکا۔ کوئی آدھ گھنٹے بعد میں لاک اَپ میں ریٹا کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ بے حد کمزور اور افسردہ نظر آرہی تھی اور پہلے کی طرح کچھ بھی بتانے کے موڈ میں نہیں تھی۔ میں نے

اُسے پیار سے سمجھاتے ہوئے کہا۔ ”ریٹا! اگر تم پولیس کے ساتھ تعاون نہیں کرو گی تو ک
لوگوں کو فائدہ ہوگا؟ اُن لوگوں کو فائدہ ہوگا جو تمہیں پھانسی کے پھندے تک پہنچانا چاہتے ہیں اور تمہارے پاپا کو خودکشی پر مجبور کرنا چاہتے ہیں...... دیکھو اس رقعے کو...... یہ تحریر تمہاری ہی ہے ناں......“

ریٹا نے ایک نگاہ غلط انداز تحریر پر ڈالی۔ کچھ دیر خالی نگاہوں سے اُسے دیکھتے رہی پھر یکا یک اُس کے چہرے پر تاثرات نمودار ہونے لگے۔ اُس کی آنکھوں میں چمک آئی۔ ہونٹ کپکپائے اور اُس نے لپک کر رقعہ میرے ہاتھ سے لے لیا۔ پھر تیزی سے بولی۔ ”یہ میری ہی تحریر ہے لیکن یہ مکمل خط نہیں، خط کا ایک حصہ ہے۔ اوہ مائی گاڈ یہ خط تو میں نے کوئی پانچ ماہ پہلے لکھا تھا......“ ریٹا نے لرزاں لہجے میں اور بھی بہت کچھ کہا مگر اُس کے یہی تین چار فقرے میری تفتیش کی گاڑی پٹڑی پر چڑھانے کے لیے کافی تھے۔ میں نے اُس کی ڈھارس بندھانے کے لیے ایک دو باتیں کیں اور اُس سے رخصت لے کر فوراً باہر آ گیا۔

اب آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ میرا رخ کس شخص کی طرف تھا...... جی ہاں ڈاکٹر تیواری کے ”پیارے دوست“ بنگالی بابو کی طرف۔ اُس وقت شام ہو چکی تھی اور سرما کی ٹھٹھری ہوئی تاریکی قدم قدم شہر کے گلی کوچوں میں اُتر رہی تھی۔

میں نے منہ سر اچھی طرح گرم مفلر میں لپیٹ رکھا تھا۔ الیگزانڈرا گراؤنڈ کے بالمقابل پہنچ کر میں نے موٹر سائیکل ایک ذیلی سڑک پر کھڑی کی۔ یہاں سے کچھ فاصلے پر ”بابو“ کی کوٹھی نظر آ رہی تھی۔ ابھی میں موٹر سائیکل سے اُترنے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ کوٹھی کے گیٹ سے ایک ٹیکسی کار برآمد ہوئی۔ کار میرے قریب سے گزری تو اُس میں دو عورتیں نظر آئیں۔ اُن میں سے ایک ادھیڑ عمر تھی اور دوسری جوان۔ میں نے فوری فیصلہ کیا اور موٹر سائیکل دوبارہ اسٹارٹ کر کے ٹیکسی کے پیچھے چل دیا۔

☆======☆======☆

کوئی دو گھنٹے بعد جب رات کے ساڑھے آٹھ بجے تھے اور ایک نہایت سرد ہوا گلی کوچوں کو ویران کر رہی تھی، میں نے اپنے ٹھٹھرے ہوئے ہاتھ اوور کوٹ کی جیبوں سے نکال کر بنگالی بابو کے دروازے پر لگی کال بیل کا بٹن دبایا۔ چند لمحے بعد ایک چرسی سے ملازم نے دروازہ کھولا۔ اس سے بیشتر کہ وہ مجھ سے کوئی سوال جواب کرتا میں اُسے دھکیلتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔ برآمدے سے گزر کر میں نے ایک بند دروازے کو کھولا تو سامنے بنگالی بابو ایک سجے سجائے کمرے میں بیٹھا نظر آیا۔ وہ نشے میں مدہوش تھا۔ ایک نوخیز بازاری لڑکی اُس کی گود

میں سر رکھے لیٹی تھی۔ اُس کے بالائی جسم پر کوئی لباس نہیں تھا۔ دونوں کے چہرے آتش دان کی روشنی میں تمتما رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر لڑکی کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ وہ میز پوش سے جسم ڈھانپتی ہوئی دوسرے کمرے میں بھاگ گئی۔ ”بابو“ کچھ دیر ہکا بکا میری طرف دیکھتا رہا۔ ایک لمحے کے لیے اُس کے چہرے پر سخت طیش نظر آیا مگر پھر فوراً ہی اُس نے خود پر قابو پا لیا۔ شاید ہسپتال کے کمرے والی پٹائی اُسے یاد آ گئی تھی۔ اٹھ کر خوش اخلاقی سے بولا۔

”آئیے...... آئیے انسپکٹر صاحب! آپ نے کیوں تکلیف کی۔ مجھے فون کر دیا ہوتا میں حاضر ہو جاتا۔“

میں نے کہا۔ ”آپ ”مصروف“ آدمی ہیں میں نے سوچا خود ہی نیاز حاصل کر آتا ہوں۔“

وہ مجھے صوفے پر بٹھاتا ہوا بولا۔ ”فرمائیے میں کیا خدمت کر سکتا ہوں۔ میرا خیال ہے آپ تیواری کیس کے سلسلے میں آئے ہوں گے۔“

میں نے کہا۔ ”آپ کا اندازہ درست ہے۔“

وہ اچانک ہی خود پر رقت طاری کرتے ہوئے بولا۔ ”انسپکٹر اس سلسلے میں مَیں ہر وقت اور ہر جگہ حاضر ہوں۔ جب تک تیواری صاحب کے قاتل زندہ ہیں میں نہ مُردوں میں ہوں نہ زندوں میں...... آپ دیکھ ہی رہے ہیں، میں نے خود کو کس طرح شراب میں غرق کر رکھا ہے۔ یہ غم تو شاید میری جان ہی لے لے گا۔“ وہ باقاعدہ آنسوؤں سے رونے لگا تھا۔

میں نے کہا۔ ”ہاں مجھے بھی لگتا ہے اب آپ مشکل سے ہی بچیں گے......“ وہ ناک سے شوں شوں کی آواز نکال رہا تھا۔ چونک کر میری طرف دیکھنے لگا۔ میں نے کہا۔ ”لگتا ہے تیواری آپ جیسے دوست سے بچھڑ کر ہلکان ہو رہا ہے، آپ کو اپنے پاس بلا کر ہی چھوڑے گا...... ویسے بائی دی وے وہ گن کہاں ہے جس سے آپ نے اپنی دوستی کو ”امر“ کیا تھا۔“

”بابو“ اب پوری طرح چونک گیا تھا۔ کہنے لگا۔ ”کیا باتیں کر رہے ہو انسپکٹر، مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہی۔“

میں نے کہا۔ ”اپنے گھر میں کسی مجرم کو کچھ سمجھ نہیں آتی۔ سمجھ والا خانہ تو تھانے جا کر کھلتا ہے۔“

وہ چلا کر بولا۔ ”کہیں...... کہیں تم مجھے تیواری کیس میں تو ملوث نہیں کر رہے۔“

میں نے اطمینان سے سگریٹ سلگایا اور صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر کہا۔ ”میں نہیں ملوث نہیں کر رہا کیوں کہ ملوث ہونے کا کام تم آج سے دس روز پیشتر کر چکے

ہو...... آج سے دس روز پہلے دسمبر کی نو تاریخ کو بروز اتوار رات گیارہ بج کر بیس منٹ پر تم نے اپنے چہیتے دوست مگن لال تیواری کو شوٹ کیا ہے۔''

یہ فقرہ ''بابو'' کے سر پر ہائیڈروجن بم کا دھماکہ تھا۔ وہ سکتے کے عالم میں میری طرف دیکھتا چلا گیا۔ میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''پورن بھگت عرف بنگالی بابو اب سے دو گھنٹے قبل تمہاری ماتا اور بہن یہاں سے نکل کر گئی تھیں۔ میرے حال پر ''مہربانی'' کرتے ہوئے انہوں نے مجھے ساری کہانی سنادی ہے۔

میرا خیال ہے...... تم بھی سن لو...... آج سے کوئی دو برس پہلے تم کلکتے سے بھاگ کر پنجاب کے اس دور دراز شہر میں آئے تھے۔ تم پر وہاں ایک قتل کا کیس تھا اور تم اتنے خوفزدہ تھے کہ کبھی واپس جانے کا ارادہ نہ رکھتے تھے۔ تم یہاں گورنمنٹ ہسپتال میں ملازم ہوگئے اور اپنی عیاری اور چرب زبانی کی وجہ سے تیزی سے ترقی کرنے لگے۔ تم نے ڈاکٹر تیواری سے دوستی گانٹھی اور اُس کی رنگ رلیوں میں اُس کے دست راست بن گئے۔ ڈاکٹر خوبصورت لڑکیوں کا دلدادہ تھا اور تم اُس کے لیے شکاری کے پھندے کا کام کررہے تھے۔ وہ عورتوں کو تاڑتا تھا اور تم اُس کے لیے راستے ہموار کرتے تھے۔ ایسا کرتے ہوئے تم نے یہ کبھی نہ سوچا کہ کوئی ذات ہمارے اُوپر بھی موجود ہے۔ جو ہماری ہر حرکت کو دیکھتی ہے۔ وہ ذات کبھی کبھی گناہ گاروں کو یوں بھی سزا دیتی ہے کہ شکاریوں کے اپنے جال ہی انہیں پھانس لیتے ہیں اور قاتلوں کے خنجر لوٹ کر اُن کے اپنے ہی بدن میں ترازو ہوجاتے ہیں۔

تمہارے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا بنگالی بابو...... کلکتے میں تمہاری ماں اور بہن کو کسی طرح پتہ چلا کہ تم پنجاب کے شہر امرتسر میں موجود ہو۔ وہ محبت کی ماری تمہیں تلاش کرتی ہوئیں ہزاروں میل دور یہاں پہنچیں۔ انہیں تمہارے ٹھکانے کا علم نہیں تھا اور وہ شہر کے گلی کوچوں میں تمہیں ڈھونڈتی پھر رہی تھیں۔ اسی پریشانی اور غریب الوطنی میں تمہاری نوجوان بہن لاجونتی جسے تم پیار سے لاجو کہا کرتے تھے بیمار ہوگئی۔ تمہاری دکھیاری ماں اُسے لے کر ایک ڈاکٹر کے پاس پہنچی۔ اتفاق سے یہ ڈاکٹر تمہارا دوست تیواری ہی تھا۔

یہ کوئی ڈیڑھ ماہ پہلے کی بات ہے۔ تم ان دنوں مدراس گئے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر تیواری تمہاری بہن کا علاج کرنے لگا اور تمہیں تو اچھی طرح معلوم ہی ہے وہ نوجوان اور خوبصورت عورتوں کا علاج کتنی توجہ سے کرتا ہے۔ معلوم ہے ناں تمہیں؟ ہاں تو علاج کے ساتھ ساتھ اُسے تمہاری بے آسرا ماں اور بہن سے ہمدردی بھی ہوگئی۔ اُس نے نہ صرف انہیں کرائے کا ایک مکان لے کر دیا بلکہ وقتاً فوقتاً اُن کی خبر گیری کرنے بھی جانے لگا۔ وہ جانتا تھا کہ ماں بیٹی

کلکتے سے اپنے کسی گمشدہ عزیز کو ڈھونڈنے آئی ہیں جس کا نام پورن بھگت ہے۔ یہ تو اُس کے تصور میں بھی نہ آسکتا تھا کہ یہ پورن بھگت اُس کا ہم پیالہ بابو احمد ہے جو فرضی نام سے یہاں رہ رہا ہے۔

لہٰذا پورن بھگت صاحب! ایک روز جب تمہاری ماں شہر کی گلیوں میں تمہیں ڈھونڈنے نکلی ہوئی تھی اور تمہاری بہن جو تقریباً تقریباً ریٹا ہی کی ہم عمر ہے...... گھر میں اکیلی تھی۔ ڈاکٹر نے اُسے اپنی مردانہ وجاہت کے کلوروفارم سے بے ہوش کرکے اُس کی عزت کا آپریشن کردیا...... ہاہا...... کتنا اچھا دوست تھا تمہارا؟ تم ڈاکٹر کے قتل سے پانچ چھ روز پہلے مدراس سے واپس آئے۔ تمہیں یہاں کے حالات کا کچھ علم نہیں تھا۔ ایک روز ڈاکٹر نے تمہیں اپنے نئے ''شکار'' کے بارے میں بتایا اور کچھ روپے دیتے ہوئے کہا کہ پندرہ بیس روز کا راشن لڑکی اور اُس کی ماں کے ہاں پہنچا دو۔ تم راشن لے کر خراماں خراماں اپنے یار کا نیا شکار دیکھنے کے لیے پہنچے۔ وہاں اپنی بہن کو دیکھ کر تمہیں جو ''دلی مسرت'' ہوئی ہوگی، میں اچھی طرح جانتا ہوں...... وہ اُوپر والا تم جیسے بے ضمیروں کو ایسے ہی خوش کیا کرتا ہے۔ ''جوش اور مسرت'' سے تمہارا سینہ پھٹنے لگا۔ تمہاری باچھوں سے جھاگ بہنے لگا اور کیوں نہ بہتا، تمہاری اپنی بہن کا معاملہ تھا ناں...... تم نے دیواروں سے ٹکریں ماریں اور رو رو کر اپنا گلا بٹھالیا۔

پھر تم سراپا انتقام بن گئے۔ نو دسمبر کی رات تقریباً دس بجے جب تیواری فنکشن سے واپس آیا تو تم نے اُسے ٹیلی فون کرکے اُسی گھر میں بلالیا جہاں تمہاری آبرو باختہ بہن رہتی تھی...... جب ڈاکٹر گھر میں پہنچا تو تم نے اُسے شوٹ کردیا۔ سارا منصوبہ تم پہلے ہی بنا چکے تھے۔ تم نے فوراً اُسے اپنے ایک دوست کی گاڑی میں ڈالا اور سُرخ گاڑی میں خود بیٹھ گئے۔ دونوں گاڑیاں تیزی سے مسٹر ڈیوڈ کی کوٹھی کی طرف روانہ ہوئیں۔ مسٹر ڈیوڈ کی کوٹھی وہاں سے صرف تین فرلانگ کے فاصلے پر ہے۔ تم نے بڑی ہوشیاری سے ڈاکٹر کی خونچکاں لاش پورچ میں ڈال دی۔ پھر اُس کی گاڑی کے ڈیش بورڈ میں ریٹا کے ایک پرانے خط کا حصہ رکھ دیا۔ یہ کاغذ ڈاکٹر کی جیب میں اس لیے نہ رکھا گیا کہ کہیں پولیس کے پہنچنے سے پہلے کوئی اسے نکال نہ لے۔ ڈاکٹر کی گاڑی میں خون کی آلائش تک نہ تھی لہٰذا کسی کے ذہن میں نہیں آیا کہ ڈاکٹر کو کہیں اور سے قتل کرکے یہاں لایا گیا ہے۔

سب سے بڑی ہوشیاری جو تم نے دکھائی اور جس کا میں اعتراف کرتا ہوں، یہ ہے کہ تم نے قتل کے بعد ڈاکٹر کا خون ضائع نہیں ہونے دیا۔ اُس کا زیادہ تر حصہ تم نے ربڑ کے ایک ڈاکٹری بیگ میں محفوظ کرلیا اور بعد میں یہی خون مسٹر ڈیوڈ کے پورچ میں پھینک دیا...... میرا

خیال ہے مجھے وائسرے ہند سے سفارش کرنی چاہئے کہ اس زبردست عیاری پر تمہیں مجرمانہ مہارت کا سب سے بڑا ایوارڈ دیا جائے ......''

میرا آخری فقرہ سننے سے پہلے ہی ''بابو'' اچانک اٹھ کر دروازے کی طرف دوڑ لگا چکا تھا۔ میں نے اُس کے پیچھے لپکنے کی کوشش نہیں کی۔ وجہ یہ نہیں تھی کہ میں اُسے فرار کا موقع دینا چاہتا تھا بلکہ......دروازے پر میرا عملہ موجود تھا۔ جونہی بابو نے دروازہ کھولا، ایک صحت مند کانسٹیبل نے اُسے اپنی ٹھوس توند سے دھکا مارا اور وہ اُلٹ کر کمرے کے وسط میں آن گرا۔

☆======☆======☆

پورن بھگت عرف ''بابو'' گرفتار ہوا۔ اُس کی ماں اور بہن واپس مغربی بنگال چلی گئیں۔ ریٹا رہا ہوئی، تیسرے شخص یعنی ڈاکٹر تیواری کے انجام کے بارے میں آپ پڑھ ہی چکے ہیں۔ کسی نے سچ کہا ہے ''ات خدا دا ویر۔'' ریٹا کی رہائی کے فوراً بعد مسٹر ڈیوڈ اُسے لے کر شملے چلے گئے۔ وہاں اُن کا اپنا کاٹیج نما بنگلہ تعمیر ہو چکا تھا۔ میں انہیں خود لاہور ائیر پورٹ چھوڑنے گیا تھا۔ ریٹا قید و بند کی تکلیفوں سے نڈھال تھی۔ اُس کی نقاہت نے مسٹر ڈیوڈ کو اپنی بیماری بھلا ڈالی تھی۔ میں نے دیکھا جہاز کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے انہوں نے ریٹا کو اپنی بانہوں کے حلقے میں یوں چھپا رکھا تھا جیسے کوئی کمزور بوڑھا اپنی زندگی کی آخری پونجی ڈاکوؤں کے نگر سے بچا کر لے جا رہا ہو۔

☆======☆======☆

عزت کی بھوکی

غریب عورت خوبصورت ہو، شوہر کمزور اور بے غیرت ہو، گاؤں کا چوہدری اور علاقے کا تھانیدار عزت کے لٹیرے ہوں تو پھر ایسی ہی شرمناک کہانیاں جنم لیتی ہیں...... ایک بے بس و بے کس عورت کا ماجرا، اسے اپنی جان سے زیادہ عزت پیاری تھی۔

بلال شاہ اُن دنوں بڑا خوش تھا۔ اُس کی بیوی اپنے نو بچوں کے ساتھ میکے گئی ہوئی تھی۔ جاتے جاتے وہ بلال شاہ کی ساری پریشانیاں اور فکر بھی ساتھ لے گئی تھی۔ لہٰذا اب شاہ صاحب بڑے مزے میں تھے۔ صبح منہ اندھیرے ''نو دس بجے'' اٹھے، پندرہ سولہ پوڑیوں کا ''ہلکا سا'' ناشتہ کیا، پھر بیوی کی جدائی میں دو سیر دہی کا ادھ رڑکا پیا۔ اپنی خشک میووں کی دکان کا ایک چکر لگایا۔ ملازم غریب کو ڈانٹا ڈپٹا، پھر ٹہلتے گھومتے تو ند مٹکاتے تھانے آ گئے۔ گپ شپ لگائی۔ دس بارہ بجے گنے چوسے یا چار پانچ گلاس کانجی کے پی کر ''حلق تر'' کیا۔ پھر تھانے کے کسی کونے میں چارپائی ڈال کر خراٹے لینے لگے۔ اُس وقت بھی بلال شاہ گنے چوسنے کے بعد نشیلی آنکھوں سے اردگرد دیکھ رہا تھا اور جماہی پر جماہی لے رہا تھا۔ مجھے معلوم تھا وہ سونے کے لیے دو گز زمین ڈھونڈ رہا ہے۔ اسی دوران ایک سائل تھانے میں داخل ہوا۔ اُسے دیکھ کر جہاں میری سُستی دور ہو گئی، وہاں بلال شاہ کی نیند بھی بھاگ گئی۔ سائل کے ساتھ ایک خوبصورت عورت بھی تھی۔ عورت کی عمر چالیس بیالیس کے قریب تھی مگر لباس اور حلیے سے جوان لگتی تھی۔ کافی خوبصورت تھی۔ ہلکا سا میک اَپ بھی کیا ہوا تھا۔ مرد کی عمر چار پانچ سال زیادہ تھی۔ وہ صاف طور پر اُس کا خاوند دکھائی دیتا تھا۔ دونوں پڑھی لکھی امیر سکھ فیملی کے فرد تھے۔ میں نے انہیں بیٹھنے کے لیے کرسیاں وغیرہ پیش کیں۔ مرد نے اپنا نام پرکاش ڈھلوں بتایا۔ وہ میرے ہی تھانے کے علاقے کا رہائشی تھا۔ شربت اور مربے وغیرہ بنانے کی ایک بڑی فیکٹری اُس کی ملکیت تھی۔ ساتھی عورت شانتی کور اُس کی دھرم پتنی تھی۔ پرکاش نے اپنا مسئلہ بیان کرتے ہوئے کہا۔

''انسپکٹر صاحب! میرا اکلوتا بیٹا انیل کل سہ پہر سے غائب ہے۔ سہ پہر سے میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ اپنے پروگرام کے مطابق اُسے سہ پہر تین بجے تک گھر آ جانا تھا۔ اپنی ماتا

ے وہ یہی کہہ کر گیا تھا۔ اُسے اپنے ایک دوست کے ہاں باغ راما نند جانا تھا۔ ہم رات نو ساڑھے نو بجے تک یہی سمجھتے رہے کہ شاید اُسے وہاں دیر ہو گئی ہے لیکن جب رات دس بجے کے قریب میں باغ راما نند پہنچا تو اُس کے دوست وجے نے بتایا کہ وہ تو دوپہر ساڑھے گیارہ بجے اُن کے گھر آیا تھا اور ایک گھنٹہ ٹھہر کر واپس چلا گیا تھا۔ اس کے بعد ہمیں سخت فکر لاحق ہوئی۔ ہم نے......''

میں نے پرکاش کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''ڈھلوں صاحب! آپ تسلی سے بات کریں۔ اس طرح نہ میری سمجھ میں کچھ آئے گا اور نہ آپ ٹھیک طرح بتا پائیں گے۔ سب سے پہلے مجھے یہ بتائیں کہ لڑکے کی عمر کیا ہے؟ وہ کیا کرتا ہے اور گھر میں اُس کے علاوہ اور کون کون افراد رہتے ہیں؟''

پرکاش کی بجائے اُس کی پتنی نے گلوگیر لہجے میں کہنا شروع کیا۔

''انسپکٹر صاحب میرا بچہ ڈاکٹر ہے۔ جوان جہان ہے۔ بھگوان جانے کیسا مقدر ہے اُس کا۔ جب سے پیدا ہوا ہے دُکھ دیکھ رہا ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ اپنے پِتا سے اُس کی کبھی نہیں بنی۔ کچھ اُس کا بھی دوش ہوتا تھا کچھ یہ بھی طبیعت کے سخت ہیں۔ بہرحال جیسے تیسے کر کے اُس نے تعلیم جاری رکھی اور ایم بی بی ایس کا امتحان پاس کر لیا۔ اُس کی تمنا تھی کہ وہ شہر سے دور کسی گاؤں یا قصبے میں جا کر کلینک کھولے اور غریب لوگوں کی خدمت کرے......

بس اس بات پر پتا سے اُس کا جھگڑا رہتا تھا۔ یہ اُسے سمجھاتے تھے کہ پہلے شہر میں قدم جما لو پھر جو جی چاہے کرنا۔ شہر میں زندگی آسان ہے اور روپیہ زیادہ ہے۔ وہ کہتا تھا کہ گاؤں میں بیماری زیادہ ہے، اس لیے ڈاکٹروں کی ضرورت بھی زیادہ ہے۔ میں نے بھی اپنے طور پر اُسے سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ نہیں مانا۔ پھر اِن کو سمجھایا کہ یہ ہی ضد چھوڑ دیں۔ اُسے اپنی ی کر لینے دیں۔ چار چھ ماہ میں خود ہی گاؤں سے اُکتا جائے گا مگر باپ بیٹا ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔ میں چکی کے ان دو پاٹوں میں اناج کی طرح پس رہی ہوں...... کوئی تین ماہ پہلے انیل نہایت خاموشی کے ساتھ گھر سے چلا گیا۔ وہ ایک خط چھوڑ گیا تھا جس میں اس نے بڑے جذباتی انداز میں لکھا تھا کہ میں اپنی زندگی کی عمارت اپنی مرضی سے اٹھانا چاہتا ہوں۔ فی الحال اس عمارت کی بنیاد رکھنے جا رہا ہوں۔ تھوڑا بہت نقشہ بن گیا تو آپ کو دکھاؤں گا۔ مطلب یہ تھا کہ وہ کلینک کھولنے کا ارادہ کر کے کسی گاؤں کا رخ کر گیا تھا۔ پورے تین ماہ اُس کی طرف سے کوئی خیر خبر نہیں آئی۔ ہم سب انگاروں پر لوٹتے رہے۔ اُس کی دو چھوٹی بہنیں تو اُس پر جان چھڑکتی ہیں۔ پورے تین ماہ سب نے کانٹوں پر گزارے۔ تلاش کے باوجود انیل

کا کچھ پتہ نہیں چلا۔ آخر رب نے ہماری فریادیں سنیں اور پرسوں منگل کے روز انیل گھر واپس آ گیا۔ سارا گھر دھاڑیں مار مار کر رویا۔ وہ خود بھی رو رہا تھا۔ ہمیں اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ اُس نے بتایا کہ اُس نے کپورتھلہ کے ایک نواحی گاؤں میں کلینک کھول لیا ہے اور اپنے کام سے بہت مطمئن ہے۔ اُس کی خوشی ہماری خوشی تھی۔ ہم نے اُس سے کوئی بازپُرس نہیں کی اور کہا کہ وہ جیسے چاہتا ہے کرے۔ اس کے پِتا نے بھی کہہ دیا کہ ٹھیک ہے بیٹا جیسے تم راضی ہم بھی راضی۔ اگر کلینک کے لیے کوئی رقم وغیرہ کی ضرورت ہو تو میرے اکاؤنٹ سے نکلوا لو۔ اُس نے صرف شکریہ ہی ادا کیا تھا۔ ہم سب محسوس کر رہے تھے کہ وہ ہمارے بھرپور تعاون اور محبت کے باوجود کچھ زیادہ خوش نہیں ہے۔ کوئی پریشانی ضرور تھی جو وہ ساتھ لے کر آیا تھا اور جو ہر گھڑی اُس کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ کل صبح بھی وہ کچھ بجھا بجھا سا تھا۔ ناشتے کی میز پر بہنیں اُس سے ہنسی مذاق کرتی رہیں لیکن وہ کچھ اور ہی سوچوں میں گم تھا۔ ناشتہ بھی ٹھیک سے نہیں کیا۔ پھر اپنے کمرے میں گھس گیا۔ بہت دیر کاغذوں کو اُلٹ پلٹ کرتا رہا۔ دس بجے کے قریب میرے پاس آیا۔ کہنے لگا۔ ''ممی! میں وجے کی طرف جا رہا ہوں۔ شاید دوپہر کا کھانا وہیں کھاؤں، چائے پر لوٹ آؤں گا۔''

پھر اُس نے اپنی موٹر سائیکل نکال لی۔ میں نے کہا بھی کہ تمہارے پِتا تمہارے لیے گاڑی چھوڑ گئے ہیں۔ مگر اُس نے کہا کہ نہیں میں موٹر سائیکل پر جاؤں گا۔

چائے پر ہم سب اُس کا انتظار کرتے رہے لیکن وہ نہیں آیا۔ وجے کے گھر ٹیلی فون نہیں ہے۔ ہم نے اس کے دفتر بار بار رِنگ کیا لیکن وہ وہاں موجود نہیں تھا۔ رات نو بجے تک ہماری پریشانی عروج پر پہنچ گئی۔ انیل کے پِتا اُسے ڈھونڈنے نکلے۔ وجے کے گھر سے پتہ چلا کہ وہ تو ساڑھے بارہ ایک بجے ہی چلا گیا تھا۔ اس کے بعد اس کے یاروں دوستوں کے ہاں پتہ کیا گیا۔ کہیں سے سراغ نہیں ملا۔ ساری رات ہم نے اُسے ہسپتالوں، تھانوں اور پارکوں میں ڈھونڈتے ہوئے گزار دی۔ اس کی دونوں بہنیں مسلسل ٹیلی فون سے لگی بیٹھی ہیں لیکن کہیں سے کوئی اچھی خبر نہیں ملی......''

شانتی کور نے اپنی بات ختم کی تو آنسو اُس کے گالوں پر بہہ رہے تھے۔ میں نے پوچھا۔ ''آپ نے اُس کے کمرے کی تلاشی لی۔ ہوسکتا ہے وہ پہلے کی طرح کوئی خط وغیرہ چھوڑ گیا ہو۔''

پرکاش نے کہا۔ ''نہیں انسپکٹر! بہت تلاش کیا مگر کوئی تحریر نہیں ملی۔ صرف اُس کی ڈائری ملی ہے۔ اُس ڈائری میں جاکوٹ نامی ایک گاؤں کا پتہ درج ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ یہ وہی

گاؤں ہے جہاں انیل نے کلینک کھول رکھا ہے۔''

ڈھلوں صاحب نے ایک خوش نما ڈائری میری طرف بڑھا دی۔ اس میں مختلف یادداشتیں، ٹیلی فون نمبر، پتے وغیرہ درج تھے۔ آخری صفحوں پر ایک گاؤں کا پتہ درج تھا۔ پٹواری منوہر لال، گاؤں جاکوٹ ڈاکخانہ وتحصیل فلاں فلاں...... یہ ایک دور دراز گاؤں تھا۔ میرے اندازے کے مطابق پکی تو پکی کچی سڑک سے بھی کوسوں دور تھا۔ واقعی خدمتِ خلق کے ارادے سے نکلنے والے نوجوان ڈاکٹر کے لیے یہ ایک مثالی گاؤں تھا۔ میں نے کہا۔

''ڈھلوں صاحب آپ کا کیا خیال ہے۔ انیل کے غائب ہونے کا تعلق اس گاؤں سے ہے؟''

پرکاش ڈھلوں نے کہا۔ ''ہم کیا کہہ سکتے ہیں۔ ہمیں تو خود کچھ سمجھ نہیں آئی۔ انیل نے ہمیں تھوڑا بہت بتایا ہوتا تو شاید آج ہم اتنا پریشان نہ ہوتے۔ اُس نے تین دنوں میں ہمیں اس گاؤں کا نام تک نہیں بتایا تھا۔ شاید سمجھتا تھا کہ ہم اُس کی مرضی کے خلاف وہاں پہنچ جائیں گے۔''

میں نے خشک لہجے میں کہا۔ ''ڈھلوں صاحب۔ آپ صرف اُس بات کا جواب دیں جو میں پوچھ رہا ہوں۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ انیل کی گمشدگی کا تعلق اس ڈائری پر لکھے ہوئے پتے سے ہوسکتا ہے؟''

شانتی کور بولی۔ ''انسپکٹر صاحب! انیل جب سے آیا تھا پریشان تھا۔ لوگ کہتے ہیں کہ دور دراز دیہات میں شہری ڈاکٹروں کو اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ ہوسکتا ہے گاؤں میں اُس کا کسی سے کوئی تنازعہ وغیرہ ہو گیا ہو...... اُس کے چہرے پر چوٹوں کے کچھ نشان بھی تھے۔ بتا رہا تھا کہ پھسل کر گر گیا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''ڈھلوں صاحب رپورٹ درج کرنے سے پہلے میں انیل کے دوست وجے سے ملنا چاہوں گا۔''

ڈھلوں صاحب نے اُسی وقت وجے کے دفتر کا ٹیلی فون نمبر جیب سے نکالا اور مجھے تھما دیا۔ میرے تھانے میں ٹیلی فون موجود تھا۔ میں نے بلال شاہ سے کہا کہ اس نمبر پر رِنگ کر کے وجے صاحب کو فوراً تھانے بلا لو۔ بلال شاہ نے ٹیلی فون کر دیا۔ اس دوران میں میاں بیوی سے مختلف سوالات کر کے اپنی معلومات میں اضافہ کرتا رہا۔ کوئی پون گھنٹے بعد وجے کمار آگیا۔ اُس کا لباس بتا رہا تھا کہ وہ ایک وکیل ہے اور شاید عدالت میں پیش ہو کر آیا ہے۔ اُس نے بڑے اعتماد کے ساتھ مصافحہ کیا اور میرے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں نے اُس سے

مختلف سوالات کیے۔ اُس نے بتایا کہ کل ایک کیس کے سلسلے میں اُسے فوری طور پر لاہور جانا پڑ گیا۔ رات نو بجے کے قریب واپسی ہوئی۔ میرے ملازم نے بتایا تھا کہ دوپہر آپ کے دوست انیل صاحب آئے تھے۔ کوئی ایک گھنٹہ بیٹھ کر واپس گئے تھے۔ اسی دوران انکل پرکاش خود پہنچ گئے۔ یہ خاصے پریشان تھے اور ان کی زبانی مجھے معلوم ہوا تھا کہ انیل کا پھر کچھ پتہ نہیں چل رہا۔

وکیل وجے سے مجھے کوئی نئی بات معلوم نہ ہوسکی۔ میں کچی رپورٹ درج کر چکا تھا لیکن کچھ دوسرے اہم کیسوں کی وجہ سے میں اس کیس پر زیادہ توجہ نہ دے سکا۔ پھر ایک روز مجھے اس کیس کے بارے میں یکے بعد دیگرے دو اہم خبریں ملیں۔ پہلی خبر ڈھلوں صاحب کی اپنی زبانی تھی۔ وہ اُسی دن جاکوٹ سے واپس لوٹے تھے۔ طویل سفر کی تھکاوٹ اُن کے بشرے سے ظاہر تھی۔ وہ خاصے پریشان دکھائی دیتے تھے۔ انہوں نے کہا۔

''انسپکٹر صاحب! بھگوان کے لیے کچھ کریں۔ میرے بیٹے کو کسی گہری سازش کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ میں جاکوٹ گیا تھا۔ وہاں سے مجھے معلوم ہوا کہ انیل پر ایک لڑکی کو ورغلانے کا الزام ہے۔ کچھ لوگوں نے اُس کا کلینک بھی توڑ پھوڑ دیا ہے۔ سنا ہے کہ پچھلے سوموار کو وہ بڑی مشکل سے جان بچا کر جاکوٹ سے بھاگا تھا...... انسپکٹر صاحب! ہم تو تصور بھی نہیں کر سکتے کہ ہمارا انیل ایسا ہوسکتا ہے۔ وہ خوسرا اور ضدی ضرور ہے، لیکن ایک اعلیٰ اور شریف گھرانے سے تعلق رکھتا ہے۔ اُس پر سراسر الزام لگایا گیا ہے۔''

میں نے کچھ دیر ڈھلوں صاحب کی باتوں پر غور کیا...... پھر پوچھا۔ ''اب آپ کا کیا خیال ہے۔ انیل کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا ہے؟''

ڈھلوں صاحب بولے۔ ''ہم تو اُسے ڈھونڈ ڈھونڈ کر ہلکان ہوگئے ہیں۔ اُس کی طرف سے بھی کوئی خیر خبر نہیں آئی۔ اب تو یہی سمجھ میں آتا ہے کہ اُس لڑکی کے وارثوں نے اُسے اغوا کرلیا ہے یا پھر......'' وہ خاموش ہوکر آنسو پینے کی کوشش کرنے لگے۔

میں نے کہا۔ ''جاکوٹ کے چوہدری یا دوسرے با اثر لوگ کیا کہتے ہیں؟''

ڈھلوں صاحب رندھی ہوئی آواز میں بولے۔ ''مجھے تو لگتا ہے وہ سارا گاؤں گونگا بہرا ہے۔ کسی سے کوئی بات پوچھوں بس ''ہوں ہاں'' میں جواب دے کر چلا جاتا ہے۔ اگر چوہدری سے ملاقات نہ ہوتی تو شاید مجھے کسی بات کا پتہ ہی نہ چلتا۔ چوہدری شکل وصورت سے بھلا مانس آدمی لگتا تھا۔ اُس نے ہی مجھے یہ سب کچھ بتایا۔ رات میں اُن کی حویلی میں مہمان رہا۔ اگلے روز اُس نے مجھے اپنی حفاظت میں گاؤں کی حدود سے باہر نکالا۔ اُس کا خیال تھا کہ لڑکی کا خاوند یا دوسرے وارث میرے لیے کوئی مصیبت کھڑی کر سکتے ہیں۔''

''لڑکی شادی شدہ ہے؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''جی ہاں۔'' ڈھلوں صاحب بولے۔

''خاوند کیسا آدمی ہے؟''

''لوہار کا کام کرتا ہے۔ سنا ہے کافی غصہ آور ہے۔''

''کیا کوئی پھنے خان قسم کا بندہ ہے؟''

''نہیں......خود تو پھنے خان نہیں لیکن ایک پھنے خان بندے سے اُس کی دوستی ضرور ہے۔ میرا مطلب گاؤں کے تھانیدار سے ہے۔ اس تھانیدار سے بھی میری مختصر ملاقات ہوئی۔ بڑا سخت گیر شخص ہے۔ اردگرد کے دیہات میں اُس نے دہشت بٹھا رکھی ہے۔ کسی کو اونچا سانس لینے نہیں دیتا تھا۔ ویسے تو شاید سب انسپکٹر ہے لیکن ڈی آئی جی کی طرح حکومت کر رہا ہے۔''

''کیا نام ہے اُس کا؟'' میرے اندر تجسس جاگا۔

''نام مجھے معلوم نہیں۔ کالا سا ہندو ہے۔ ماتھے پر تلک لگاتا ہے۔ انسپکٹر صاحب مجھے تو شواش ہو رہا ہے کہ لڑکی کے شوہر نے اُس کے ساتھ مل کر انیل کو اغوا کرلیا ہے۔''

ڈھلوں صاحب کی بات سمجھ میں آرہی تھی۔ یہ عین ممکن تھا کہ انیل کسی قسم کی قانونی چارہ جوئی کے لیے شہر آیا ہو اور اس کے دشمنوں نے اُسے پولیس کچہری تک پہنچنے سے پہلے ہی اٹھوا لیا ہو۔ اس صورت میں اُس کی زندگی شدید خطرے میں تھی۔ میں نے سوچا کہ ایک پولیس پارٹی کو ڈھلوں صاحب کے ہمراہ اس گاؤں میں بھیجوں تاکہ وہاں کے ٹھیک ٹھیک حالات معلوم ہوسکیں۔ اس کے علاوہ اگر انیل تھانیدار کے پاس حبس بے جا میں ہے تو اُسے رہائی دلائی جاسکے۔ میں نے ڈھلوں صاحب سے کچھ مزید معلومات حاصل کیں اور انہیں تسلی تشفی دے کر واپس بھیج دیا۔ اُسے اگلے روز مجھے اس کیس کے حوالے سے دوسری اہم خبر ملی۔ شہر کے شمالی حصے میں ایک گندے نالے سے ایک موٹر سائیکل برآمد ہوا ہے۔ موٹر سائیکل کے کاغذات سے پتہ چلا کہ یہ انیل ڈھلوں کے نام رجسٹرڈ ہے۔ ڈھلوں صاحب نے تھانے میں آکر بیٹے کا موٹر سائیکل پہچان لیا اور آنسو بہانے لگے۔ یہ عین ممکن تھا کہ انیل موٹر سائیکل سمیت نالے میں گر گیا ہو یا گرا دیا گیا ہو۔ میں نے فوراً عملے کو ہدایت کی کہ نالے میں لاش تلاش کرائی جائے۔

شام تک ان تھک کوشش کے باوجود کسی لاش کا سراغ نہیں ملا۔ اگلے روز میں نے اپنے

سب انسپکٹر کی قیادت میں ایک تفتیشی پارٹی ''جاکوٹ'' روانہ کرنے کی تیاری کر لی۔ سفر لمبا تھا
اس لیے میں نے انہیں تفصیل سے ہدایات دیں۔ ابھی میں ہدایات دے ہی رہا تھا کہ سارا
پروگرام اُلٹ پلٹ ہو گیا۔ ایس ایس پی صاحب کا فون آیا اور انہوں نے مجھے فوراً ہیڈ کوارٹر
بلایا۔ میرے پہنچنے پر انہوں نے بتایا کہ پرکاش ڈھلوں صاحب اُن کے دوستوں میں شمار
ہوتے ہیں لہٰذا اُن کے بیٹے کی بازیابی کے لیے میں اپنی پوری کوشش کروں۔ اس کے علاوہ وہ
یہ بھی چاہتے تھے کہ جاکوٹ کے بدماغ تھانے دار کے بارے میں ٹھیک ٹھیک معلومات
فراہم کی جائیں۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں آج ہی ایک سب انسپکٹر کو تفتیشی پارٹی کے ساتھ
جاکوٹ روانہ کر رہا ہوں۔ ایس ایس پی صاحب نے خواہش ظاہر کی ہے سب انسپکٹر کی بجائے
میں خود اس تفتیش پر جاؤں۔

ایس ایس پی کی بات ٹالنا میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ میں نے چارج اپنے سب انسپکٹر کو
دیا اور جاکوٹ روانگی کی تیاری کرنے لگا۔ میں نے سوچا کہ اگر مجھے خود ہی جانا ہے تو پھر زیادہ
آدمی ساتھ نہیں لے جاؤں گا۔ بہت ہوا تو بلال شاہ کو ہم سفر بنالوں گا۔ کام کرنے کا میرا ایک
اپنا انداز ہے اور قارئین اب تک اس انداز کو سمجھ ہی چکے ہوں گے۔

☆======☆======☆

وہ اپریل کی ایک چمکیلی دوپہر تھی۔ جالندھر سے کوئی چالیس میل دور ہم ایک چھوٹے
سے ریلوے سٹیشن پر اُترے۔ یہاں سے ایک خستہ حال تانگے میں بیٹھ کر ہم نے کچے راستے
پر کوئی چھ کوس کا فاصلے طے کیا۔ تانگے نے ہمیں ایک چھوٹی سی نہر کے ویران پُل پر اُتارا۔
ایسی نہروں کو پنجابی میں ''سُوا'' کہا جاتا ہے۔ اس سوئے کے ساتھ ساتھ ہم جاکوٹ کی طرف
روانہ ہوئے۔ ہم دونوں شلوار قمیص میں تھے۔ ایک سوٹ کیس تھا جسے کبھی میں اور کبھی بلال
شاہ اٹھا لیتا تھا۔ سوٹ کیس میں میری دو وردیاں، بلال شاہ کا ایک جوڑا اور کچھ کاغذات وغیرہ
تھے۔ سہ پہر کے وقت ایک عجیب واقعہ رُونما ہوا۔ جاکوٹ کی حدود میں داخل ہونے کے لیے
ہمیں ایک نہر پار کرنا تھی۔ یہ نہر سُوئے سے کافی بڑی اور گہری بھی تھی۔ پُل وہاں سے کافی
دور تھا اور ہم میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ پُل تک پہنچ سکتے۔ لہٰذا دیہاتیوں کے عام رواج کے
مطابق ہم شلواریں چڑھا کر پانی کے اندر داخل ہو گئے۔ پانی ہماری بغلوں تک پہنچ رہا تھا کچھ
کالی بھوری بھینسیں بھی وہاں تیر رہی تھیں۔ غلطی میری ہی تھی۔ میں نے بلال شاہ سے کہا کہ وہ
کسی بھینس کی دُم پکڑ کر تو دکھائے۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ بھینس بلال شاہ جیسے بھینسے کو نہر پار
کر سکتی ہے یا نہیں۔ میرے گمان میں بھی نہیں تھا کہ بھینس کے ارادے کیا ہیں۔ جونہی بلال

شاہ نے آگے بڑھ کر ایک بھوری بھینس کی دُم کو کلائی پر بل دیا۔ وہ زور سے ڈکرائی اور اچھل
کر بلال شاہ کی طرف آئی۔ دوسرے لفظوں میں وہ ''وکھری ٹائپ'' کی بھینس نکلی۔ اُس نے
بلال شاہ کی بزرگی کا لحاظ کیے بغیر اُسے دے ٹکر پر ٹکر مارنی شروع کر دی۔ بلال شاہ اس
مصیبت کے لیے ہرگز تیار نہیں تھا۔ اُس کا سر نیچے اور ٹانگیں اوپر ہو گئیں۔ مجھے خدشہ محسوس ہوا
کہ کہیں بھینس اپنی مستی میں اس کے اوپر ہی نہ چڑھ جائے۔ میں نے لپک کر بھینس کی دُم کو
مروڑا کہ اصل غلطی تو میری ہی تھی لیکن بھینس نے میری طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔
اتنے میں ایک آٹھ دس سالہ ننگ دھڑنگ لڑکا شڑاپ سے پانی میں کودا اور اُس نے ڈنڈے
مار مار کر بھینس کا رخ موڑا۔ میں نے جا کر بلال شاہ کو تھاما۔ وہ اتنا ڈرا ہوا تھا کہ مجھے بھی
بھینس سمجھ کر بدکنے لگا۔ اُس کی ناک سے خون بہہ رہا تھا۔ بھینس کو ایک واہیات گالی دے کر
اُس نے نہر میں اِدھر اُدھر دیکھا۔ جیسے پانی میں اینٹ کا ٹوٹا ڈھونڈنے کی کوشش کر رہا ہو۔
پھر مایوس ہو کر میرے ساتھ دوسرے کنارے کی طرف چل دیا۔ میں نے اُس کھینچ کر پانی سے
نکالا۔ اُس کی ململ کی قمیص دو تین جگہ سے پھٹ چکی تھی۔ شلوار پر بھی تھوڑا سا خون نظر آ رہا
تھا۔ میرا ایک پاؤں کا جوتا پانی کے بہاؤ میں کہیں بہہ گیا تھا۔ دوسرا بھی اتار کر میں نے نہر کے
''منہ'' پر دے مارا۔ کچھ دیر حواس درست کرنے کے بعد میں نے بلال شاہ سے کہا۔

''چلو شاہ جی کہیں کوئی اور مصیبت نہ پڑ جائے۔''

بلال شاہ کو ہنسی بھی آ رہی تھی اور رونا بھی۔ بات تھی بھی اس طرح کی۔ یونہی بیٹھے
بٹھائے ہم نے مصیبت گلے ڈال لی تھی۔ وہ ہائے ہائے کرتا ہوا اٹھا اور لنگڑاتا ہوا میرے
ساتھ چل دیا۔ کہنے لگا۔

''خان صاحب! آپ کی جوتی کا بہت افسوس ہوا۔ اب ننگے پاؤں جانا پڑے گا۔''

وہ اتنا حواس باختہ تھا کہ ابھی تک اُسے اصل نقصان کا علم نہیں ہوا تھا۔ میں نے کہا۔

''شاہ جی! جوتی کو تو خیر دفع کرو۔ اُس سامان کا کہو، جو تمہارے پاس تھا۔''

''کیا مطلب؟'' بلال شاہ چونکا۔

''سوٹ کیس کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

بلال شاہ نے اپنے خالی ہاتھوں کی طرف دیکھا اور اُس کے چہرے پر تاریک سایہ لہرا
گیا۔ درحقیقت افراتفری میں سوٹ کیس اُس کے ہاتھ سے چھوٹ کر پانی میں بہہ چکا تھا۔ بہاؤ
کافی تیز تھا اور بہت کم امکان تھا کہ تلاش کرنے پر ہمیں مل جائے گا، لیکن اگر مل بھی جاتا تو نہ
ملنے کے برابر تھا۔ کپڑے، کاغذات وغیرہ سب غارت ہو چکے تھے۔ صورتِ حال سمجھ میں آئی

تو بلال شاہ مڑ کے نہر کی طرف بھاگا، لیکن میں نے لپک کر اُسے تھام لیا۔ ''اب رہنے دو شاہ جی۔ گاؤں سے اور کپڑے لے لیں گے۔ یہ نہ ہو کہ بھینس ابھی تک غصے میں ہو۔''

بلال شاہ مایوسی سے سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ سوٹ کیس میں اُس کی نسوار کا پُڑا بھی تھا اور غالباً اس پُڑے کا اُسے زیادہ دکھ تھا۔ میں بلال شاہ کو دلاسہ دینے کی کوشش کر رہا تھا جب قریب سے دُھول اڑتی نظر آئی۔ پھر ایک کھٹارہ سی جیپ گھوں گھوں کرتی ہمارے پاس آ کر رُکی۔ جیپ میں سے ایک کالے کلوٹے پولیس والے نے چہرا باہر نکالا۔ اُس کے ماتھے پر سُرخ اور سفید تلک تھا۔ کانوں میں چھوٹی چھوٹی مرکیاں اور ڈاڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ اُسے دیکھتے ہی میں سمجھ گیا کہ ڈھلوں صاحب نے اسی شخص کا ذکرِ خیر کیا تھا۔ اُس نے ہمیں سر سے پاؤں تک گھورا پھر مشکوک لہجے میں بڑی بدتمیزی سے بولا۔ ''ابے کہاں سے آوت ہو؟'' پھر خود ہی بولا۔ ''لگتا ہے کہیں سے بھاگے ہوئے ہو۔''

میرے دل میں نہ جانے کیا کہ آئی میں نے مسکین لہجے میں کہا۔ ''ندی پار سے آئے ہیں جی۔ شہر جا رہے ہیں روزگار کی تلاش میں۔''

اُس نے بیڑی کا ایک زوردار کش لیا۔ ''حرامجادو۔ روج گار کی تلاس میں یا رسہ گیری کرنے نکلے ہو۔''

بلال شاہ نے بھنا کر کچھ کہنا چاہا مگر میں نے آہستہ سے اُس کا ہاتھ دبا دیا اور اُسی لہجے میں بولا۔ ''نہیں مائی باپ ہم تو سیدھے سادے لوگ ہیں۔ چھوٹے چھوٹے بچے ہیں ہمارے۔''

تھانیدار نے اپنے پیچھے بیٹھے ایک مخبر نما شخص سے پوچھا۔ ''او خیرو کے بچے جانتا ہے ان دونوں دُم چھلوں کو۔'' خیرو نے نفی میں سر ہلایا۔ تھانیدار نے لال پیلی آنکھوں سے ہمیں گھورا پھر کانسٹیبل سے بولا۔ ''ذرا تلاسی لو ان دونوں بھڑووں کی۔''

اپنے لیے بھڑوے کے لقب پر بلال شاہ تلملا کر رہ گیا۔ کانسٹیبل نے نیچے اُتر کر بڑی بے تکلفی سے ہماری تلاشی لی۔ بلال شاہ کی جیب سے ایک موچنا اور چند روپے کی ریزگاری نکلی۔ میری جیب میں سوائے ایک چابی کے کچھ نہیں تھا اور یہ چابی تھی اُسی ''بے وفا'' سوٹ کیس کی جو ہمارا سب کچھ لے کر نامعلوم سمت روانہ ہو گیا۔ تھانیدار نے چابی کو غور سے دیکھا پھر نظروں کو ترچھا کر کے بڑے ماہرانہ انداز سے مجھے گھورنے لگا۔ گالی دے کر بولا۔ ''ابے لمبوترے، یہ ولائتی سوٹ کیس تیری جورو جہیز میں لائی تھی کیا؟''

میں نے کہا۔ ''مم...... مائی باپ راستے میں پڑی چمک رہی تھی۔ میں نے اٹھا لی۔ مجھے

نہیں معلوم سوٹ کیس کی ہے یا کسی اور شے کی۔''

''ہوں، رستے میں پڑی چمک رہی تھی۔'' اُس نے مضحکہ خیز انداز میں سر اوپر نیچے ہلایا۔ پھر کانسٹیبل سے گرج کر بولا۔ ''بٹھا ان دونوں بھڑووں کو جیپ میں۔ تھانے لے جا کر پوچھوں گا ان سے۔''

میں نے گھبرانے کی اداکاری کی۔ کانسٹیبل نے ہمیں دھکیلتے ہوئے جیپ میں بٹھا دیا لیکن شرافت ملاحظہ ہو کہ نشستوں پر نہیں بٹھایا نیچے فرش پر جگہ دی۔ بلال شاہ غصے میں بری طرح کھول رہا تھا۔ اگر میں نے منع نہ کیا ہوتا تو وہ اب تک سارا بھانڈا پھوڑ چکا ہوتا۔ دو ہیڈ کانسٹیبلوں کے قدموں میں بیٹھے ہوئے ہم نے سفر جاری رکھا۔ وہ دونوں مسلسل بلال شاہ کی پھٹی ہوئی قمیص کو گھور رہے تھے۔ ایک نے مونچھوں کو تاؤ دے کر کہا۔

''موٹے! یہ کہاں سے پھڑوا کے آیا ہے۔''

بلال شاہ کی بجائے میں نے کہا۔ ''جناب! راستے میں ایک مارنے والی بھینس سے ٹاکرا ہو گیا تھا۔ میری جوتی بھی نہر میں چلی گئی۔''

کانسٹیبل بولا۔ ''جوتیوں کی تو پرواہ نہ کرو۔ وہ تو بڑی مل جائیں گی تمہیں۔''

دوسرے کانسٹیبل سے آہستہ سے کہا۔ ''اگر کوئی کام دکھایا ہے تو بڑے تھانیدار صاحب کو سچ سچ بتا دو۔ ورنہ بہت بری طرح پھنسو گے۔ پانی پلا پلا کر ماریں گے اور اوپر سے چیخنے بھی نہیں دیں گے۔''

دوسرے کانسٹیبل نے سرگوشی کی۔ ''اگر گھر میں کوئی جوان بہن یا بیوی ہے تو اُس کا ہی خیال کر لو۔ تھانیدار جی سب کو تھانے بلا لیتے ہیں...... چلو شاباش سچ سچ بتا دو کہاں سے لی تھی یہ چابی؟''

اتنے میں جیپ میں ایک دھچکا لگا اور وہ تھوڑی دور چلنے کے بعد ''منگ'' کرنے کے بعد رُک گئی۔ بڑے تھانیدار صاحب نے جیپ کو ایک بڑی گالی دی۔ ڈرائیور جو ایک احمق کانسٹیبل تھا کچھ دیر چابی گھما کر اُسے اسٹارٹ کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ پھر مایوسی سے سر ہلانے لگا۔ بڑے تھانیدار نے کہا۔ ''چلو ان دونوں کو اتارو نیچے۔'' اُس کے حکم پر ہمیں نیچے اتار دیا گیا۔ ایک کانسٹیبل قریبی کھیت سے ایک اور مزدور کو پکڑ لایا۔ ہم تینوں کو دھکا لگانے پر لگا دیا تھا۔ ''وڈا تھانیدار'' اور اُس کے تینوں کانسٹیبل بڑے ٹھاٹ سے جیپ میں بیٹھے رہے۔ بلال شاہ بار بار غصیلی نظروں سے مجھے گھور رہا تھا۔ میں اُس کے غصے پر اندر ہی اندر ہنس رہا تھا۔ درحقیقت میرا ایسا ڈرامہ کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ ''وڈے تھانیدار'' سے گفتگو کا آغاز

میں نے ہنسی مذاق کے موڈ میں کیا تھا اور سوچا تھا کہ تھوڑی دیر میں اُسے حقیقت بتادوں گا لیکن اب نہ جانے کیوں میرا دل چاہ رہا تھا کہ ہمارے اور ان لوگوں کے درمیان جو پردہ پڑ گیا ہے وہ پڑا ہی رہے۔ اس پردے سے بہت سے فائدے حاصل ہو سکتے تھے...... بلال شاہ کے بار بار گھورنے اور دانت پیسنے کے باوجود میں نے اپنی خاموشی برقرار رکھی اور گاڑی کو دھکا لگاتا رہا۔ جاکوٹ میں بھی ہم اسی طرح داخل ہوئے۔ جیپ کو دیکھتے ہی لوگ سڑک کے کناروں پر ہوجاتے اور ہاتھ اُٹھا کر سلا کرتے اور مؤدب کھڑے رہتے۔ ہم تھانے کے احاطے میں داخل ہوئے تو پسینے سے شرابور ہو رہے تھے۔ کانسٹیبلوں نے کھیت مزدور کو چھٹی دے دی اور ہم دونوں کو ایک جانب چارپائی پر بٹھادیا۔

وڈے تھانیدار نے شاہانہ حکم دیا۔ ''کرم دین اور فضلے کو حاضر کرو۔''

دو سپاہی گئے اور تھوڑی ہی دیر میں کرم دین اور فضلے کو لے کر آگئے۔ یہ دو میلے کچیلے شخص تھے۔ جیسا کہ بعد میں پتہ چلا وہ سائیکل مستری تھے۔ کبھی کبھار ڈیزل انجن وغیرہ بھی ٹھیک کر لیتے تھے۔ وڈے تھانیدار نے انہیں گھور کر دیکھا اور کڑک کر مرغا بننے کا حکم دیا۔ وہ دونوں پہلے تو گھبرائے۔ پھر مشینی انداز میں جھکے اور ٹانگوں کے نیچے سے ہاتھ نکال کر مرغا بن گئے۔ اس اہم کام سے فارغ ہو کر وڈا تھانیدار ہماری طرف متوجہ ہوا۔ پہلے اُس نے کسی اصیل مرغے کی طرح ہمارے چاروں طرف چکر لگایا۔ اچھی طرح گھورا، غور کیا پھر بولا۔

''ہاں میرے شہزادو۔ کیا ارادے ہیں؟ سچ سچ بتاوت ہو یا کان پکڑوا دوں تم کو بھی؟''

میں نے کہا۔ ''مائی باپ اگر ہمارا قصور ان جیسا ہے تو پھر بے شک کان پکڑوا دیں لیکن اگر......''

وہ میری بات کاٹ کر بولا۔ ''بھڑوو! قصور تو ان کا تمہارے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہے۔ ان سے تو میری گاڑی ٹھیک نہیں ہوئی...... اور تم نے مارا ہے ڈاکہ اور ڈاکہ بھی کوئی چھوٹا موٹا نہیں۔''

تھانیدار کی بات سے میں سمجھ گیا کہ مرغا بننے والوں کا قصور صرف اتنا ہے کہ وڈے تھانیدار کی کھٹارہ جیپ ٹھیک کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے تھے۔ میں نے ڈاکے والی بات نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ''مائی باپ! اگر آپ کی آگیا ہو تو میں جیپ کو ٹھیک کر کے دیکھوں۔''

وڈے تھانیدار نے جس کا اصل نام شیکھر بیدی تھا، ایک قدم پیچھے ہٹ کر مجھے غور سے دیکھا۔ ''ابے، تُو ابھی تو کہہ رہا تھا روزگار کے لیے شہر جا رہا ہے۔ یہ موٹر مکینکی کہاں سے

سیکھی تُو نے؟''

میں نے کہا۔ ''مائی باپ! یہ شہر کی طرف میرا دوسرا سفر ہے۔ ایک دفعہ پہلے بھی سال ڈیڑھ سال رہ کے آیا ہوں۔''

وڈے تھانیدار نے آزمائشی طور پر مجھے جیپ سے چھیڑ چھاڑ کرنے کی اجازت دے دی۔ میں نے ٹول بکس سے اوزار نکالے۔ بونٹ اٹھا کر دیکھا۔ پلگ چیک کیے۔ پھر نظر بیٹری کے ایک تار پر پڑی۔ وہ بظاہر بیٹری سے جڑا ہوا تھا لیکن اصل میں جل چکا تھا۔ میں نے پلاسٹک چھیل کر نیا تار نکالا اور بیٹری سے لگا دیا۔ جیپ اسٹارٹ ہوگئی۔ بیدی بڑا خوش نظر آ رہا تھا۔ اُس نے میرے کندھے پر ایک زوردار دھپ جمایا اور بولا۔

''ابے مُسلے تُو تو بڑا کایاں نکلا۔ کیا نام ہے تیرا اور کس گاؤں کا ہے تُو؟''

میں شیکھر بیدی کی میز کے سامنے چارپائی پر جا بیٹھا اور اُس کے سوالوں کے جواب دینے لگا۔ تھوڑی ہی دیر بعد مجھے شیکھر بیدی کی باتوں سے اندازہ ہو گیا کہ وہ اپنی بڈھی کھوسٹ جیپ کے لیے مجھے مستقل طور پر خدمت گار رکھنا چاہتا ہے، بلکہ اُس نے اشاروں اشاروں میں مجھے یہ بھی سمجھا دیا کہ اگر میں نے اس ''خدمت'' سے جان چھڑانے کی کوشش کی تو وہ زبردستی بھی ایسا کر سکتا ہے اور اس زبردستی کے لیے ولائتی صندوق کی چابی بہت کافی تھی۔ غالباً شیکھر بیدی ٹھیک کہہ رہا تھا۔ اُس جیسا شخص اس چابی کے ذریعے کسی شخص کو حوالات میں تو کیا پھانسی کے تختے پر بھی پہنچا سکتا تھا۔ میرا کام خود بخود بنتا جا رہا تھا۔ میں تو آیا ہی اس گاؤں میں رہنے کے لیے تھا۔ اب شیکھر بیدی خود مجھے اس گاؤں میں رکھنے پر تُلا ہوا تھا۔ اُس نے کمال مہربانی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''نوازے! تُو میری جیپ کی ڈرائیوری بھی کرے گا اور اس سارے کام کے لیے میں تجھے پچیس روپے ماہوار لگا دوں گا۔ دیسی گھی اور مرغی مچھلی کھانے کو علیحدہ ملے گا۔ مجے میں رہے گا۔''

میں نے کہا۔ ''مائی باپ اور میرا بھائی۔''

وہ کچھ دیر ہٹے کٹے بلال شاہ کو گھورتا رہا اور پھر بولا۔ ''یہ کون سا کام جانت ہے؟''

میں نے بلال شاہ کو شرارت سے دیکھ کر کہا۔ ''مائی باپ! غریب کا بچہ ہے جو کام دے دیں گے کرے گا۔''

بیدی نے کہا۔ ''ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ ابھی اسے اپنے پاس رکھو۔ میں سوچوں گا اس کے لیے۔''

☆======☆======☆

ڈھلوں صاحب نے درست اندازہ لگایا تھا۔ یہ پورا گاؤں وڈے تھانیدار یعنی سب انسپکٹر شیکھر بیدی کے زیر اثر تھا۔ اُس کی اجازت کے بغیر کوئی چڑیا بھی پر نہیں مار سکتی تھی۔ سیدھے سادے اَن پڑھ لوگ تھے۔ شہروں کی روشنی سے بہت دور تھے۔ لہٰذا بیدی ہی ان کے لیے سب کچھ تھا۔ میں نے اگلے دو تین روز میں کوشش کی کہ گاؤں کے اندرونی حالات معلوم ہوسکیں لیکن اس کے سوا کچھ پتہ نہ چلا کہ دو ہفتے پہلے گاؤں کی جولاں نامی لڑکی ایک پردیسی ڈاکٹر انیل کے ساتھ پکڑی گئی تھی۔ گاؤں والے ڈاکٹر کا قصہ تمام کردینا چاہتے تھے مگر وہ جان بچا کر نکل گیا۔ یہ باتیں مجھے تھانے ہی کے ایک کانسٹیبل سے معلوم ہوئی تھیں۔ صاف طور پر محسوس ہورہا تھا کہ کانسٹیبل مجھ پر پورا پورا بھروسہ نہیں کررہا اور بہت کچھ چھپا رہا ہے۔ عام لوگوں کی طرح اُس کے دل میں بھی ''وڈے تھانیدار'' کا خوف بیٹھا ہوا تھا۔

مجھے ایک شک یہ بھی تھا کہ ہوسکتا ہے مغوی انیل کو تھانے ہی میں قید رکھا گیا ہو۔ میں نے تھانے کی عمارت میں اچھی طرح گھوم پھر کر دیکھا لیکن اُس کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ ایک بار پھر مجھے فکر پڑ گئی کہ کہیں انیل کو ہلاک ہی تو نہیں کردیا گیا۔ اُسے ہلاک کرنے والا کون ہوسکتا تھا؟ شیکھر بیدی، لڑکی کا شوہر یا کوئی اور؟ گاؤں میں آئے ہوئے مجھے چوتھا روز تھا لیکن میں ابھی تک لڑکی جولاں یا اُس کے شوہر کو نہیں دیکھ سکا تھا...... مگر پانچویں روز میری یہ مشکل خود بخود آسان ہوگئی۔

میں تھانے کے احاطے میں اُس بڈھی کھوسٹ قریب المرگ جیپ کے پاس چارپائی ڈالے لیٹا تھا کہ بلال شاہ تیز تیز چلتا میری طرف آیا۔ اُس کا حلیہ دیکھنے کے قابل تھا۔ اُس نے صرف ایک بنیان پہن رکھی تھی۔ ایک پھٹی پرانی دھوتی کو لنگوٹ کی طرح کسا ہوا تھا۔ ہاتھ کہنیوں تک صابن کی جھاگ میں لتھڑے ہوئے تھے۔ دراصل ''وڈے تھانیدار'' نے اُس کی ''غریبی'' پر ترس کھاتے ہوئے اُسے تھانے کی لانڈری میں دھوبی لگا دیا تھا۔ اب بے چارہ سارا دن سپاہیوں کی وردیاں اور دھوتیاں کُرتے دھوتا رہتا تھا۔ اتنی سخت محنت اوپر سے ایک چٹکی نسوار کی نہیں مل رہی تھی۔ برا حال تھا اُس کا۔ میرے پاس آکر اُس نے کہا۔

''خان صاحب! ابھی میں اندر دفتر میں کالو بیدی کے کپڑے لینے گیا تھا۔ وہاں ایک لڑکا بیٹھا ہوا ہے۔ اُس کے لباس اور حلیے سے لگتا ہے کہ لوہار کا کام کرتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہی جولاں کا شوہر ہے۔'' (بلال شاہ وڈے تھانیدار کو کالو بیدی کہتا تھا)

یہ خبر میرے لیے بے حد اہم تھی۔ میں نے یونہی جیب کا ایک پُرزہ نکالا اور ٹہلتا ہوا بیدی کے کمرے کی طرف چلا گیا۔ چق کے دوسری طرف سے باتیں کرنے کی آوازیں آرہی

تھیں۔ شیکھر بیدی کہہ رہا تھا۔ ''پتنی کو پتی کا حکم ماننا چاہیے جو ایسا نہیں کرتی وہ پتنی کہلانے کی حق دار ہی نہیں۔ سُوٹ کردینا چاہیے اُس کو۔''

دوسرے شخص کی آواز آئی۔ ''سرکار، کیسے سمجھاؤں میں اس کو۔ اُسے تو میری عزت بے عزتی کا پاس ہی نہیں رہا۔''

بیدی بولا۔ ''بھگتو! ایسا کر، اُسے میرے پاس بھیج۔ میں سمجھاؤں گا اس کو۔ دیکھتا ہوں کیسے نہیں مانتی۔ یہ ہم دونوں کی عجت کا سوال ہے۔''

دوسرا شخص جسے بیدی نے بھگتو کہا تھا کچھ دیر خاموش رہا پھر مسکین آواز میں بولا۔ ''ٹھیک ہے سرکار، میں آج شام کے بعد اُسے لے کر آؤں گا۔''

اتنے میں ایک کانسٹیبل آتا دکھائی دیا۔ میں جلدی سے چق اٹھا کر اندر داخل ہوگیا۔ بیدی خشک لہجے میں بولا۔ ''اوئے نوازے! تجھے تیرے باپ نے تمیز نہیں سکھائی۔ افسر کے کمرے میں اس طرح منہ اٹھا کر چلے آوت ہیں؟ آواج کیوں نہیں دی پہلے؟''

میں نے دل ہی دل میں اُس پر لعنت بھیجی۔ پھر شرمندگی سے کہا۔ ''معافی چاہتا ہوں مائی باپ! دراصل یہ پُرزہ تھا، بالکل سیدھا سادا ہے اگر کوئی لوہار یہاں گاؤں میں ہی ڈھال دے تو شہر نہ جانا پڑے گا۔''

بیدی نے کہا۔ ''ابے یہ لوہار تیرے سامنے ہی تو بیٹھا ہے۔ جو چاہے اس سے ڈھلوا لے۔ بڑا خرانٹ کاریگر ہے۔ صرف ایک پتنی ہے جو اس کے سانچے میں نہیں ڈھلتی۔'' اب مجھے یقین ہوچکا تھا کہ یہی جولاں کا شوہر ہے۔ میں نے پتنی والی بات نظرانداز کرتے ہوئے پُرزہ بھگتو کو دکھایا اور اُس سے باتیں کرنے لگا۔ میرا مقصد یہی تھا کہ بھگتو کے طور اطوار کا پتہ چلے۔ جلد ہی مجھے اندازہ ہوگیا کہ وہ ایک جاہل سا بزدل شخص ہے اور اُس سے ہرگز توقع نہیں کی جاسکتی کہ اُس نے اپنے طور پر انیل کو کوئی نقصان پہنچایا ہوگا۔

شام تک میں بڑی شدت سے جولاں اور بھگتو کا انتظار کرتا رہا۔ آخر اندھیرا پھیلا اور خدا خدا کرکے وہ دونوں تھانے کے دروازے پر نظر آئے۔ بھگتو نے سکھوں کا مخصوص لباس پہن رکھا تھا۔ یعنی دھوتی قمیص اور پگڑی۔ جولاں نے بھی لاچا اور لمبی سی ڈوریئے والی قمیص پہن رکھی تھی۔ ایک ٹاسے کی چادر سے اُس نے منہ سر لپیٹا ہوا تھا۔ اُسے دیکھ کر ایک سنتری نے ٹھنڈی آہ بھری اور منہ میں گنگنانے لگا۔

وِچ سوہنی دی چال میں تن من ساڑ لیا
ٹالی نوں جپھا ماریا تے کُرتا پھاڑ لیا

میں نے کہا۔"سنتری بادشاہ۔ بڑے دل کو لگی ہے تمہارے۔"

وہ بولا۔"بھرا جی اے شے ای ایسی ہے۔ جدھروں لنگ جاوے سیاپا پاندی اے (بھائی صاحب! یہ چیز ہی ایسی ہے جہاں سے گزر جائے مصیبت ڈال دیتی ہے)

میں نے کہا۔"سنتری بادشاہ یہ "مصیبت" تھانے کیا کرنے آئی ہے؟"

سنتری بولا" افسروں کی باتیں افسر ہی جانیں۔ خیال ہے کہ بھگتو اُسے ڈرانے دھمکانے کے لیے"وڈے تھانیدار" کے پاس لایا ہے۔ اُس کے اپنے قابو میں تو رہی نہیں۔ ہوسکتا ہے وڈے تھانیدار کے ڈر سے اپنی حرکتیں چھوڑ دے۔"

"کیسی حرکتیں؟" میں نے پوچھا۔

سنتری نے لوفروں کی طرح ایک آنکھ دبائی اور بولا۔"بھولے بادشاہ وہی حرکتاں......بے برکتاں......"

وڈے تھانیدار کے کمرے میں ہونے والی گفتگو کوئی پون گھنٹہ جاری رہی۔ آدھے گھنٹے تک بھگتو بھی کمرے میں موجود رہا۔ پھر وہ باہر آ گیا اور دس پندرہ منٹ تھانیدار اور جولاں کے درمیان تنہائی میں گفتگو ہوئی۔ آخر جولاں بھی باہر نکل آئی اور اپنے شوہر کے ساتھ سر جھکا کر چلتی تھانے کے احاطے سے باہر نکل گئی۔

یہ سارا معاملہ کچھ الجھا ہوا تھا۔ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ یہ کیا چکر چل رہا ہے۔ شاید جولاں کا شوہر اور تھانیدار اُسے کسی غیر اخلاقی کام پر مجبور کر رہے تھے۔ یہ بھی ہوسکتا تھا کہ غیر اخلاقی کام جولاں خود کر رہی ہو اور وہ اُسے راہِ راست پر لانا چاہتے ہوں۔ شادی شدہ ہونے کے باوجود جولاں کا انیل سے کیا تعلق تھا اور گاؤں والے اُسے چھمک چھلو اور فتنہ پرور کیوں سمجھتے تھے؟ ایسے ہی بہت سے سوال میرے ذہن میں سر اٹھا رہے تھے۔

☆=====☆=====☆

یہ اگلے روز کی بات ہے۔ علی الصبح بیدی تیز قدموں سے تھانے میں داخل ہوا۔ اُس کے ساتھ ایک اے ایس آئی اور دو رائفل مین بھی تھے۔ میں اس وقت سو رہا تھا۔ بیدی نے چارپائی کو ٹھوکر مار کر مجھے جگایا اور فوراً جیپ نکالنے کا نادر شاہی حکم صادر کیا۔ میں سمجھ گیا کہ کسی مجرم کا پیچھا کرنا ہے۔ جونہی میں نے جیپ سٹارٹ کی۔ بیدی اچک کر اندر داخل ہو گیا۔ عملے نے بھی اُس کی تقلید کی۔

"ڈیک نالے کی طرف چلو" اُس نے گرج کر کہا۔

میں نے جیپ کا رخ گاؤں کی شمالی جانب ڈیک نالے کی طرف کر دیا۔ قریباً دس منٹ

بعد ہم ڈیک نالے کے کنارے ایک جھونپڑے کے سامنے پہنچے۔ گھاس پھونس اور لکڑی سے بنا ہوا یہ جھونپڑا کسی ملاح کا تھا۔ کنارے پر دو کشتیاں بھی ہلکورے لے رہی تھیں۔ ایک کشتی چھوٹی اور دوسری بڑی تھی۔ جیپ کی کان پھاڑ آواز سن کر ایک اُدھیڑ عمر عورت اور ایک چودہ پندرہ سال کی لڑکی باہر نکل آئی۔ دونوں نے میلے کچیلے کپڑے پہن رکھے تھے۔ بیدی کو اپنے سامنے دیکھ کر وہ دونوں تھر تھر کانپنے لگیں۔ بیدی پھنکارتا ہوا جیپ سے اترا اور پھر اُس نے آگے بڑھ کر اُدھیڑ عمر عورت کو بالوں سے پکڑ لیا اور گھسیٹ کر جیپ کے پاس لے آیا۔ پھر گالیوں کی بوچھاڑ کرتے ہوئے بولا۔

"حرامجادی، سالی! کہاں بھگایا ہے بیٹے کو جلدی بتا۔ ورنہ ابھی پانی میں غوطے دے کر مار دوں گا۔"

عورت نے واسطے دیتے ہوئے کہا کہ اُسے کچھ معلوم نہیں۔ وہ ماں بیٹی تو خود رات سے پریشان ہیں۔ بیدی نے عورت پر تھپڑوں کی بارش کر دی۔ پھر نوعمر لڑکی کو ایک طرف دھکیل کر جھونپڑے میں داخل ہو گیا۔ اُس نے اچھی طرح سے جھونپڑی کی تلاشی لی۔ پھر ماں بیٹی کو جیپ میں بٹھا لیا اور انہیں کہا کہ وہ پولیس کو انوپ سنگھ کے ٹھکانے پر لے جائیں ورنہ پولیس انہیں اپنے ٹھکانے پر لے جائے گی اور پھر اُن دونوں کے ساتھ جو کچھ ہوگا اُس کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتیں۔ وڈے تھانیدار کی دھمکیوں اور ننگی گالیوں سے گھبرا کر وہ دونوں بری طرح رو رہی تھیں۔ تھانیدار انہیں گاہے بگاہے جھانپڑ بھی رسید کر دیتا تھا۔ اُس نے انہیں مجرموں کی طرح جیپ کے فرش پر بٹھا رکھا تھا۔ اُس کا چنگیز خانی رویہ دیکھ دیکھ کر میرا خون کھول رہا تھا لیکن اس وقت میں صرف ایک ڈرائیور تھا جو اس علاقے کے بے تاج بادشاہ کو "قانون سکھا" کر اپنی عاقبت خراب نہیں کر سکتا تھا۔ تھانیدار اور عملے کی باتوں سے جلد ہی مجھ پر یہ انکشاف ہو گیا کہ بھگتو کی بیوی جولاں رات اپنے ایک پرانے یار کے ساتھ فرار ہو گئی ہے۔ اس شخص کا نام انوپ سنگھ تھا اور اب ہم اُس کی تلاش میں جا رہے تھے۔ دراصل آدھی رات کو بھگتو کے کسی جاننے والے نے اُسے گہری نیند سے جگا کر پوچھا تھا کہ تمہاری بیوی کدھر ہے؟ بھگتو نے کہا تھا گھر میں ہے۔ تم کیوں پوچھ رہے ہو۔ اُس شخص نے کہا تھا ذرا جا کر دیکھو تو سہی۔ بھگتو اندر گیا اور چند ہی لمحوں میں گھبرایا ہوا واپس آ گیا تھا...... بتانے والے نے اُسے بتایا تھا کہ وہ انوپ سنگھ کے ساتھ ایک سانڈنی پر بیٹھی ہوئی پہاڑ کی طرف یعنی شمال کی طرف جا رہی تھی۔ بھگتو کچھ دیر تو سکتے میں رہا تھا۔ پھر بھاگا بھاگا اپنے خیر خواہ شیکھر بیدی کے پاس پہنچا تھا......اور اب ہم انوپ سنگھ اور جولاں کی تلاش میں تھے۔ بھگتو بھی ہمارے ساتھ تھا۔ اُس

کے چہرے پر وہی شرمندگی تھی جو ایک بھاگ جانے والی بیوی کے شوہر کا مقدر ہوتی ہے۔

انوپ کی ماں اور بہن کی نشاندہی پر ہم نے کم از کم چار مقامات پر چھاپے مارے لیکن مفرور جوڑے کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ بیدی نے انوپ کے دو دوستوں کو شک کے تحت گرفتار کیا۔ ان میں ایک اُسی کی طرح ملاح تھا اور دوسرا ترکھان۔ اُن دونوں کو پیچھے باندھ کر ننگے پاؤں دوڑاتا ہوا وہ واپس جاکوٹ آ گیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ انوپ کی ماں اور نوعمر بہن کو بھی تھانے لے جائے گا۔ پھر شاید اُس کے دل میں کچھ رحم آ گیا۔ اُس نے انہیں ڈرا دھمکا کر جھونپڑے میں واپس چھوڑ دیا۔ اور صاف الفاظ میں دھمکی دی کہ اگر اُن دونوں نے فرار ہونے کی کوشش کی تو وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گی۔

جس وقت ہم جھونپڑے سے رخصت ہو رہے تھے اچانک میری نگاہ ایک شخص پر پڑی اور میں بری طرح ٹھٹک گیا۔ یہ شخص گاؤں کا ڈاکیہ تھا۔ عمر کوئی پچیس سال رہی ہوگی لیکن سر سے بالکل گنجا تھا۔ شاید کسی بیماری کی وجہ سے ایسا ہو گیا تھا۔ میں نے اُس کا گنجا سر گندم کے ایک کھیت میں سے نکلتے دیکھا۔ ایک لمحے کے لیے اُس نے جھونپڑے کی طرف دیکھا پھر اُس کی نظر پولیس پر پڑی اور وہ پلک جھپکنے میں نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ یہ منظر شاید میرے سوا کوئی بھی نہ دیکھ سکا تھا۔ میرے دل میں ایک شبہ سا سر اٹھانے لگا۔ اگر میں ''وڈے تھانیدار'' صاحب کو اس شبے سے آگاہ کر دیتا تو یقیناً وہ ڈاکیے کو اُسی وقت گرفتار کر لیتا مگر میں اس معاملے کو اپنے طور پر دیکھنا چاہتا تھا۔

شام کا وقت تھا۔ دھوپ گندم کے ادھ پکے کھیتوں کو الوداعی بوسہ دے رہی تھی۔ دور کہیں کسی رہٹ کے چلنے کی صدا پرندوں کی چہچہاہٹ میں ڈوب اُبھر رہی تھی۔ بڑا سہانا منظر تھا۔ میں اور بلال شاہ ایک کھیت کے منڈیر پر بیٹھے کسی کا انتظار کر رہے تھے۔ ایسے موسم میں ''انتظار'' کی بات سے شاید آپ سمجھیں گے کہ ہم پتلی کمر اور لال گالوں والی کسی الھڑ مٹیار کا انتظار کر رہے تھے لیکن نہیں...... یہ انتظار ایک ڈاکیے کا تھا اور ڈاکیہ بھی گنجا پاپی، جسے دیکھ کر موسم کی ساری اُمنگ ترنگ رفوچکر ہو جائے۔ ہم دونوں کے منہ میں کیکر کی مسواکیں تھیں اور آنکھیں پگڈنڈی پر لگی تھیں...... میں معلوم کر چکا تھا کہ گاؤں سے واپسی پر ڈاکیہ ہر روز اس پگڈنڈی سے گزرتا ہے۔ آخر کار صاحب بہادر جھومتے جھامتے، اچھلتے پھلانگتے اپنی طرف آتے دکھائی دیئے۔ بغل میں ڈاک کا بستہ اور کان پر پنسل تھی۔ ٹنڈ کا تانبہ سنہری دھوپ میں آتشیں گولے کی طرح چمک رہا تھا۔ ہمیں دیکھ کر اُس نے سلام کیا۔ اُسے معلوم تھا ہم تھانے کے نئے ملازم ہیں...... لیکن یہ ہرگز معلوم نہیں تھا کہ یہ ''نئے ملازم'' اُس کے ساتھ کیا کرنے

جا رہے ہیں۔ جونہی وہ ہمارے پاس آیا۔ بلال شاہ نے اٹھ کر ایک زوردار تھاپ اُس کے تانبے پر لگائی پھر لنگڑائی دے کر اُسے کھیت میں گرا دیا۔ میں بھی لپک کر اُس کے سر پر پہنچ گیا۔ ایکا ایکی ڈاکیے کے چہرے پر بے پناہ خوف نظر آنے لگا۔

میں نے ایک ہاتھ سے اُس کی گردن کو دبوچا اور غرا کر کہا۔ ''کل تم ڈیک نالے کے کنارے چوہدریوں کے کھیت میں کیا کر رہے تھے......''

میرے سوال نے اُسے بری طرح بوکھلا دیا۔ ہکلا کر بولا۔ ''چوہدریوں کے کھیت میں...... میں تو نہیں گیا تھا۔''

اُس کا جواب اُس کے حق میں اور بھی برا ثابت ہوا۔ اگر وہ کہہ دیتا کہ میں وہاں پیشاب وغیرہ کرنے کے لیے بیٹھا ہوا تھا تو مجھے الجھن ہو سکتی تھی۔ مگر وہ تو صاف مکر گیا تھا۔ اُس کے انکار نے میرے شک کو مضبوط تر کر دیا۔ میں نے اُس کا منہ ڈھانپ لیا اور بلال شاہ نے میرے اشارے پر بے دریغ اُس پر ٹھوکروں اور مکوں کی بارش کر دی۔ شاید وہ دھوبی گھاٹ کا سارا غصہ اُس پر اتار دیتا لیکن میں نے اُسے منع کر دیا۔ ڈاکیہ اب بری طرح کراہ رہا تھا۔ میں نے اُسے گریبان سے پکڑ کر جھٹکا دیا اور بتایا کہ ہم ''وڈے تھانیدار'' کے بھیجے ہوئے اُس کے پاس آئے ہیں اور اگر اُس نے سچ نہ اگلا تو پھر اُسے تھانے لے جانا پڑے گا اور یوں گاؤں والوں کے سامنے بے عزتی کا سن کر ڈاکیے کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ وہ احسان مندی کی نظروں سے ہمیں دیکھنے لگا۔ جیسے خاموشی کی زبان میں کہہ رہا ہو، میں کس زبان سے آپ کا شکریہ ادا کروں کہ آپ نے کھیت میں مجھے پھینٹی لگائی اور حشر نشر سے بچایا۔ وہ سمجھ چکا تھا کہ اب بری طرح پھنس چکا ہے اور چھپانے سے کچھ فائدہ نہیں۔ اُس کا رنگ مٹی کی طرح زرد ہو چکا تھا۔

اُس نے اپنا نام زکریا بتایا اور لرزتے کانپتے لہجے میں انکشاف کیا کہ کل وہ ملاح انوپ کا ایک پیغام لے کر اُس کی ماں اور بہن کے پاس آیا تھا...... میرے لیے یہ ایک نہایت اہم خبر تھی۔

اس کا صاف مطلب تھا زکریا، انوپ سنگھ کے ٹھکانے سے آگاہ ہے۔ یہ ہماری بہت بڑی کامیابی تھی۔ میں نے دلی مسرت کو چھپاتے ہوئے پوچھا۔ ''اب انوپ اور جولاں کہاں ہیں؟''

اُس نے ہارے ہوئے انداز میں سر جھکایا اور بولا۔ ''پکی ڈھیری گاؤں میں انوپ کا ایک یار رہتا ہے۔ اس وقت دونوں اُس کے ڈیرے پر ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''تمہیں اُن دونوں کا پتہ کیسے چلا؟''

وہ بولا۔ ''میں پکی ڈھیری میں ڈاک بانٹنے گیا تھا۔ انوپ نے مجھے دیکھ لیا اور اپنے ساتھ ڈیرے پر لے گیا۔ انوپ کا مجھ پر ایک بہت بڑا احسان ہے جی۔ ایک دفعہ سیلاب میں اُس نے مجھے اور میری ماں کو ڈوبنے سے بچایا تھا۔ جب انوپ نے مجھ سے کہا کہ میری ماں اور بہن کے نام خط لکھو اور اُن تک پہنچا دو تو میں انکار نہ کرسکا۔ کل میں انہیں انوپ کا خط سنانے کے لیے وہاں پہنچا تھا لیکن پولیس کو دیکھ کر گھبرا گیا اور واپس چلا گیا۔''

اب ساری بات سمجھ میں آرہی تھی۔ انوپ نے ماں کو اپنی اچانک گمشدگی کی وجہ بتانے کے لیے ڈاکیے زکریا کو بھیجا تھا۔ مگر وہ میرے ہتھے چڑھ گیا۔ میں نے دیکھا زکریا اب پھوں پھوں کر کے رو رہا تھا۔ اُس نے پھٹی پھٹی آواز میں کہا۔ ''کیسا بدقسمت ہوں میں بھی۔ اپنے محسن کا احسان اتارنے نکلا تھا، اُلٹا اُن کے لیے مصیبت بن گیا۔''

مجھے زکریا کے رونے پر کچھ شک سا ہو رہا تھا۔ یوں لگتا تھا دکھاوے کے لیے رو رہا ہے۔ میں نے پولیس والوں کے خاص انداز میں اچانک اندھیرے میں تیر چھوڑا۔ میں نے کہا۔ ''اُلو کے پٹھے! تیرا کیا خیال ہے کہ انوپ ابھی تک گرفتار نہیں ہوا۔ اُس نے بتا دیا ہے کہ تُو نے اُس سے کتنے پیسے لیے تھے......''

حیرت انگیز طور پر تیر نشانے پر لگا۔ زکریا کا رنگ فق ہو گیا۔ گڑبڑا کر بولا ''وہ......وہ تو جی اُس نے اپنی مرضی سے دیئے تھے۔'' میں نے غصے میں دو تین اور ٹھوکریں اُس کی پسلیوں میں لگائیں۔ پھر گریبان سے گھسیٹ کر کھڑا کر دیا۔

کچھ ہی دیر بعد ہم تینوں دو گھوڑوں پر سوار تیزی سے ''پکی ڈھیری'' کی طرف جا رہے تھے۔ گنجا زکریا میرے پیچھے بیٹھا ہوا تھا۔ میں راستے میں اُس سے مختلف سوال بھی کرتا جا رہا تھا۔ میں نے پوچھا ''وہ خط کہاں ہے جو انوپ نے اپنی ماں کے لیے لکھوایا تھا؟'' اُس نے جھٹ تھیلے میں سے ایک تہہ شدہ کاغذ نکال کر میری طرف بڑھا دیا۔ صرف چند سطریں لکھی تھیں۔

''ماں! میری طرف سے فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں ایک ضروری کام سے شہر جا رہا ہوں، ایک دو روز میں آ جاؤں گا۔ ہوسکتا ہے تھوڑے دن زیادہ لگ جائیں۔ گھبرانے کی بات نہیں چھوٹی کشتی کی مرمت کروا لینا......وغیرہ وغیرہ۔'' خط میں کوئی کام کی بات نہیں تھی۔

میں نے زکریا سے پوچھا۔ ''انوپ نے جس کے پاس پناہ لی ہے وہ کون ہے؟''

اُس نے بتایا کہ اُس کا نام شیرا ہے۔ آج کل جیل کاٹ رہا ہے۔ اُس کا ڈیرہ خالی تھا۔

انوپ نے اُس کے گھر والوں سے ڈیرے کی چابی لے رکھی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''انوپ اور جولاں کے تعلقات کے بارے میں تُو کیا جانتا ہے؟''

زکریا وہی کچھ بتا سکا جو اس سے پہلے مجھے معلوم تھا یعنی انوپ اور جولاں کا پرانا دوستانہ تھا......وغیرہ وغیرہ۔ اُس نے قسمیں کھا کر کہا کہ اس کے علاوہ اُسے کچھ معلوم نہیں۔

زکریا کی باتوں سے مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ انوپ ایک پھنے خان قسم کا شخص ہے۔ اُس کی دوستی بھی جرائم پیشہ لوگوں سے تھی۔ ہوسکتا تھا انیل کی گمشدگی میں اُس کا ہاتھ ہو۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے رقیب تھے۔ ممکن تھا کہ انوپ اُسے راستے سے ہٹانا چاہتا ہو۔ اُس نے خود یا اپنے کسی ساتھی کے ذریعے انیل کو اٹھوا لیا ہو اور ہوسکتا ہے قتل کر دیا ہو۔ اگر واقعی ایسا ہوا تھا تو پھر لڑکی کا شوہر بھگتو اور تھانیدار بیدی بے قصور ہے۔ مشکل یہ تھی کہ گاؤں میں کوئی شخص مجھے یہ پوری کہانی سنانے پر آمادہ نہیں تھا۔ سب اتنا ہی بتاتے تھے کہ جولاں اچھے کردار کی لڑکی نہیں۔ کئی مردوں سے اُس کے تعلقات رہے ہیں۔ اُس نے ڈاکٹر پر بھی ڈورے ڈالے اور پھر اپنے پرانے آشنا کے ساتھ بھاگ گئی۔ مجھے کوئی ایسا شخص نہیں ملا تھا۔ جس نے تصویر کا دوسرا رخ بھی دکھایا ہو۔

رات کوئی دس بجے ہم پکی ڈھیری کے نواح میں واقع ایک ڈیرے پر پہنچے۔ چاندنی رات تھی۔ درختوں کے درمیان چند کچے پکے کمرے پُراسرار نظر آرہے تھے۔ قریب ہی دو گھوڑے بندھے تھے۔ ایک شخص موٹا کھیس لپیٹے گھوڑوں کے پاس سو رہا تھا۔ مجھے شک گزرا کہ اُس کے تکیے کے نیچے پستول وغیرہ ہے۔ میں نے ایک جھٹکے سے اُس کا تکیہ اٹھا کر 32 بور کا ریوالور نکال لیا۔ یہ شخص ڈیرے کا اکلوتا رکھوالا تھا۔ اپنا ریوالور اپنی ہی طرف اُٹھا پا کر وہ بری طرح گھبرایا۔ میں نے بلال شاہ کو اشارہ کیا۔ اُس نے دو منٹ میں رکھوالے کو اُس کی رنگین پگڑی سے باندھ کر بھنگ کے پودوں میں ڈال دیا۔ تب ہم نے ڈیرے کے دروازے پر دستک دی۔ کسی نے کمرے میں لالٹین کی لو تیز کی۔ پھر بھاری آواز میں پوچھا۔ ''کون ہے؟''

میرے اشارے پر ڈاکیے نے جواب دیا۔ اندر والے نے جھٹ دروازہ کھول دیا۔ میرے سامنے مضبوط ہاتھ پیر کا ایک لمبا تڑنگا شخص کھڑا تھا۔ وہ دھوتی بنیان میں تھا۔ کیس بندھے ہوئے تھے۔ ہم دونوں کو دیکھ کر وہ بری طرح گھبرایا۔ میں اُسے ریوالور سے دھکیلتا ہوا اندر لے گیا۔ ایک سُریلی چیخ سنائی دی۔ میں نے دیکھا گداز جسم والی ایک دراز قد لڑکی لالٹین کے پاس سہمی کھڑی تھی۔ اُس کی لمبی گردن اور ایک رخسار روشنی کی زد میں تھا۔ یہ دونوں روشن حصے اُسے خوبصورت ثابت کرنے کے لیے کافی تھے۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ یہی جولاں

ہے، مگر میں اُس کی گود میں سات آٹھ ماہ کا بچہ دیکھ کر حیران رہ گیا۔ مجھے پہلی دفعہ پتہ چلا کہ جولاں ایک بچے کی ماں بھی ہے۔

میں نے رعب دار آواز میں اپنا تعارف کرایا۔ یہ جان کر کہ میں پولیس انسپکٹر ہوں جولاں اور انوپ خوفزدہ ہو گئے۔ زکریا بھی اس انکشاف پر حیران رہ گیا۔ میں نے بلال شاہ کو ہدایت کی کہ وہ جولاں کی گود سے بچہ لے لے اور اُسے دوسرے کمرے میں جا کر لٹا دے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اُن دونوں کو کسی بھی چالاکی کا موقع دوں۔ ریوالور کی نالی بدستور اُن دونوں کی طرف اٹھی ہوئی تھی۔ بلال شاہ سوئے ہوئے بچے کو دوسرے کمرے میں لے گیا تو میں نے مفرور جوڑے سے پوچھ گچھ شروع کی۔ وہ جانتے تھے کہ بری طرح پھنس چکے ہیں۔ لہٰذا انہوں نے اِدھر اُدھر کی ہانکنے کی کوشش نہیں کی اور میری تھوڑی سی کوشش کے بعد اصل موضوع پر آ گئے۔ انوپ اور جولاں سے میری یہ گفتگو تقریباً تین گھنٹے جاری رہی۔ اس دوران جولاں نے صرف ایک دفعہ دوسرے کمرے میں جا کر اپنے بچے کو دودھ پلایا۔ اس ساری گفتگو کے دوران مختلف سوال جواب ہوئے کہیں کہیں مجھے اُن دونوں کو دھمکانا بھی پڑا۔ کہیں پیار محبت سے کام لیا۔ اس ساری گفتگو کا خلاصہ کچھ اس طرح ہے۔

جولاں جاکوٹ کے قریبی گاؤں پتن کی رہنے والی تھی۔ ان دونوں دیہات کے درمیان وہ ڈیک نالہ بہتا تھا جہاں انوپ سنگھ کی جھونپڑی بھی تھی۔ انوپ جاکوٹ کا رہائشی تھا۔ جولاں کے والدین اپنے رشتے داروں سے ملنے کے لیے اکثر جاکوٹ آتے رہتے تھے۔ جولاں بھی اُن کے ساتھ ہوتی تھی۔ دوسرے لوگوں کی طرح انہیں بھی بعض دفعہ نالہ پار کرنے کے لیے انوپ کی کشتی میں بیٹھنا پڑتا تھا۔ نوعمری ہی سے جولاں انوپ کی محبت میں گرفتار ہو گئی اور وقت کے ساتھ یہ محبت چپکے چپکے پروان چڑھتی رہی، لیکن قدرت کو اُن کا ملاپ منظور نہیں تھا۔ جولاں کا باپ اُس کی شادی اپنی ہی ذات برادری میں کرنا چاہتا تھا لہٰذا اُس نے جولاں کو بھگت سنگھ عرف بھگتو لوہار کے پلے باندھ دیا۔ ایک شریف بھلی مانس لڑکی کی طرح جولاں نے والدین کا یہ فیصلہ قبول کیا اور شادی کے بعد دل و جان سے شوہر کی خدمت کرنے لگی۔ گزرے زمانے کی ہر یاد اُس نے اپنے دل سے کھرچ دی اور اپنے سسرال کے گھر ایک نئی زندگی کا آغاز کیا۔

قریباً ایک سال کا عرصہ تو خیریت سے گزرا پھر جولاں کی پُرسکون زندگی میں طوفان سر اٹھانے لگے۔ بھگتو لوہار ایک کاہل آدمی تھا۔ آمدن اتنی کم تھی کہ بمشکل گزر بسر ہوتی تھی۔ سونے پر سہاگہ یہ ہوا کہ اُسے نشے کی عادت پڑ گئی۔ ٹھرا پی کر چارپائی پر پڑے رہنا اُس کا

معمول بن گیا۔ گھر میں فاقے پڑنے لگے۔ جولاں سے اپنی نندوں اور کمسن دیوروں کی بھوک نہیں دیکھی جاتی تھی۔ وہ چوہدری کی حویلی میں جا کر کام کرنے لگی۔ چوہدری بسوا جیت راؤ کی طرح اُس کی پتنی بھی بڑی خدا ترس تھی۔ گھر کا بچا کھچا سالن، روٹی، کپڑا لتا اور دوسری اشیاء جولاں کو دے دیتی تھی۔ جولاں ان چیزوں کو اپنی محنت کا صلہ جان کر لے لیتی تھی۔ تنخواہ وغیرہ کا تو گاؤں میں کوئی تصور ہی نہیں تھا۔

جولاں کی بدقسمتی یہ تھی کہ وہ قبول صورت اور پُرکشش تھی۔ اپنی انہی خوبیوں کے ساتھ اُسے مختلف کاموں سے بار بار چوہدری صاحب کے کمرے میں بھی جانا پڑتا تھا۔ بڑے چوہدری صاحب کی عمر پینتالیس کے لگ بھگ تھی جوان بچوں کے باپ تھے۔ گاؤں میں اُن کی نیک نامی تھی، لیکن وہ جولاں کو آتے جاتے ایسی نظروں سے دیکھتے کہ اُسے جھرجھری سی آ جاتی۔ کبھی کبھی وہ جولاں سے کہتے کہ گھی گرم کر کے لاؤ اور میرے سر میں ڈالو۔ پھر انہوں نے اُس سے کمر کی مالش کروانا بھی شروع کر دی۔ ایک روز جب چوہدرانی چھت پر تھی اور جولاں چوہدری صاحب کی مالش کر رہی تھی۔ چوہدری نے ایک ایسی حرکت کی کہ وہ شرم سے پانی پانی ہو گئی۔ بہرحال اُس نے دل کو تسلی دی کہ شاید چوہدری صاحب سے بے خیالی میں ایسا ہو گیا ہے مگر اگلے دو تین ہفتوں میں اُس کا یہ خیال غلط ثابت ہو گیا۔ اب اُسے یہ بھی احساس ہو رہا تھا کہ حویلی کے تمام ملازمین اُسے چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہیں اور پیٹھ پیچھے ہنستے ہیں۔

ایک دن جولاں نے یہ سارا معاملہ اپنی ایک گہری سہیلی روپا سے کہہ دیا۔ روپا اُس کی باتیں سن کر پہلے تو خوب ہنسی پھر بولی۔ ''جولاں تُو بھی بڑی بھولی ہے۔ چوہدری صاحب تجھ سے پریم کرنا چاہتے ہیں اور تُو اُن سے بھاگ رہی ہے۔''

روپا کی بات سن کر جولاں کے کان سائیں سائیں کرنے لگے۔ بچپن سے اُس کے دل میں چوہدریوں کی حویلی کے بارے ایک خوف سا رہتا تھا۔ اس کی وجہ کیا تھی اُسے خود بھی معلوم نہیں تھا۔ شاید یہ انجانا سا خوف اور تجسس گاؤں کی ہر عورت کے دل میں موجود رہتا تھا۔ پھر جب اُس کی شادی ہو گئی اور وہ فاقوں سے مجبور ہو کر حویلی میں کام کرنے لگی تو آہستہ آہستہ یہ خوف خود ہی دور ہو گیا تھا۔ مگر اب...... بالکل اچانک یہ خوف پھر پوری شدت کے ساتھ اُس کے ذہن میں جاگ گیا تھا۔ روپا نے اُسے یہ بتا کر حیران کر دیا کہ اس قسم کے واقعات کچھ سال پہلے اُس کے ساتھ بھی پیش آ چکے ہیں۔ بلکہ حویلی میں کام کرنے والی کئی عورتوں کو اس طرح کے واقعات پیش آتے ہیں اور گاؤں کی ہندو آبادی میں یہ باتیں زیادہ

بری بھی نہیں سمجھی جاتیں۔

روپا نے بتایا کہ چوہدری صاحب اونچی ذات کے برہمن ہیں اور اُن کی سیوا کرنا ہم شودروں کا کرتبے ہے۔ وہ جولاں کو بازو سے پکڑ کر حویلی کے ایک کمرے میں لے گئی۔ یہاں دیوار پر شیشے کا ایک کافی بڑا سنہری فریم لگا ہوا تھا۔ فریم کے اندر کوئی تصویر نہیں تھی بلکہ ایک تحریر تھی۔ روپا نے جولاں سے کہا۔ ''یہ پڑھ سکتی ہو؟'' جولاں نے نفی میں سر ہلایا۔ روپا نے کہا۔ ''میں بھی نہیں پڑھ سکتی...... صرف پنڈت جی پڑھ سکتے ہیں۔ مجھے بھی انہوں نے پڑھ کر سنایا تھا۔ یہ اُن دنوں کی بات ہے جب تمہاری طرح میں چوہدری صاحب کی کمر کی مالش کیا کرتی تھی اور بہت پریشان تھی۔ پنڈت جی نے بہت کچھ سنایا تھا لیکن مجھے یہ چند باتیں یاد ہیں۔

سوامی منوجی کہہ گئے ہیں۔ ''دنیا میں جو کچھ ہے وہ برہمن جاتی کے لیے ہے۔ جو برہمن پر ہاتھ اُٹھائے یا اُس کا ہاتھ روکے سو برس تک نرک میں رہے گا۔ اگر برہمن کو تنکے سے بھی مارے تو اکیس جنم تک کتے اور گدھے کی جون میں پیدا ہوگا۔ برہمن کے جسم پر ہتھیار سے زخم لگایا جائے تو مٹی کے جتنے ذروں پر خون لگے گا، اگلے جہان میں زخم لگانے والے کو اُتنے برس گیدڑ اور کتے سے بھوجن کرنا پڑے گا......''

روپا کی باتیں سن کر جولاں کا خون کھول رہا تھا۔ اُس نے کہا کہ تم یہ کیوں بھول رہی ہو کہ میں سکھ ہوں اور مجھے تمہارے دھرم کے وچاروں سے کوئی سروکار نہیں۔ میں ہرگز یہ کالک اپنے منہ پر نہیں لگاؤں گی۔

روپا نے ہمدردی سے کہا۔ ''جولاں تو ابھی کم عمر ہے۔ تجھے پتہ نہیں کہ چوہدریوں کے جال سے نکلنا کتنا مشکل ہوسکتا ہے۔ تیری اور تیرے پری وار کی بہتری خاموش رہنے میں ہی ہے۔''

جولاں پاؤں پٹختی ہوئی حویلی سے اپنے گھر آگئی۔ رات کو اُس نے اپنے خاوند سے کہا کہ وہ اب حویلی نہیں جائے گی۔ اُس نے پوچھا تو جولاں نے روتے سسکتے ہوئے سب کچھ بتا دیا۔ بھگتو نکھٹو ضرور تھا لیکن ابھی غیرت اُس کے اندر زندہ تھی۔ اُسے چوہدری بسوا جیت کے کردار کے بارے تھوڑی بہت بھنک تھی لیکن یہ اُس کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ ایک سکھ عورت کو اپنے رنگ میں رنگنے کی کوشش کرے گا۔ اُس نے اُسی روز اسی گھڑی ٹھرا پینا چھوڑ دیا اور لگن کے ساتھ کام کرنے لگا۔ جولاں نے حویلی میں جانا ترک کر دیا۔ دس پندرہ روز خیریت رہے پھر ایک روز چوہدری کے کارندوں نے ایک پرانے جھگڑے کو بنیاد بنا کر بھگتو کی

دکان پر قبضہ کرلیا اور اُس کا سامان اُٹھا کر باہر پھینک دیا۔ بھگتو کی دکان پر قبضہ کرنے والا چوہدری کا ایک خاص آدمی تھا۔ بھگتو اُس کی شکایت لے کر تھانیدار بیدی کے پاس پہنچا لیکن یہاں دادرسی کے بجائے چمڑے کا چھتر اُس کے حصے میں آیا۔ تھانیدار نے پہلے تو اُسے خوب مارا پیٹا، پھر پیار محبت سے سمجھایا کہ وہ چوہدری سے ٹکر لینے کی کوشش نہ کرے۔ اُس نے اُسے انعام اکرام کا لالچ بھی دیا۔ بھگتو فطری طور پر ایک بزدل آدمی تھا۔ بیوی کی فریاد سن کر وقتی طور پر اُس کی غیرت جاگی تو تھی لیکن جتنی جلدی جاگی اُتنی جلدی سو بھی گئی۔ تھانیدار کی ایک ہی چھینٹی نے اُسے ٹھنڈا ٹھار کر دیا۔ اُوپر سے ولایتی شراب کی دو تین بوتلیں ملیں تو وہ نشے میں مدہوش ہو کر گھر آگیا۔ تین چار روز گھر میں پڑا شراب پیتا اور کاجو کھاتا رہا۔ آخر چوتھے روز اُس نے جولاں کو بلایا اور بولا۔

''اری! تُو گئی نہیں حویلی میں۔ جا، ہو آ۔ اُن کا کام رکا پڑا ہوگا۔ چودھرائن اتنی محبت کرتی ہے تجھ سے۔ اُس کا ہی خیال کر لے۔''

جولاں نے حیران نظروں سے اپنے مدہوش پتی کی طرف دیکھا اور اُس کا مطلب سمجھنے کی کوشش کرنے لگی۔ وہ اپنے ہاتھوں سے اُسے ایک غلط آدمی کی طرف بھیج رہا تھا۔ اُس نے اپنے بچے کو سینے سے بھینچ لیا اور سر اُٹھا کر بولی۔

''نہیں بھگتو! میں نہیں جاؤں گی حویلی میں۔ اگر...... تجھے اتنا ہی خیال ہے تو اپنی کسی بہن کو بھیج دے۔''

اس بات نے بھگتو کو آگ بگولہ کر دیا۔ وہ غصے میں پھنکارتا ہوا اُٹھا اور اُسے لاتوں اور گھونسوں سے پیٹنے لگا۔ کھینچا تانی میں جولاں کی قمیص پھٹ گئی۔ وہ بچے کو لپٹا کر کمرے میں گھس گئی اور اندر سے کنڈی چڑھا لی۔ بھگتو باہر ''شیر ببر'' کی طرح گرجتا رہا۔ ''میں دیکھتا ہوں کیسے نہیں تُو میری بات مانتی۔ کھال اُتار دوں گا تیری۔ زبان کھینچ لوں گا۔''

جولاں دیکھ رہی تھی کہ اُس کے چاروں طرف گھیرا تنگ ہو رہا تھا۔ ایک روز چپکے سے میکے روانہ ہوگئی۔ اُس کے میکے میں سکھوں کے دس بارہ گھر موجود تھے۔ اُس کا ارادہ تھا کہ وہ اپنے بھائی بندوں کو اپنی بپتا سنائے گی ہوسکتا ہے وہ اُس کے بچاؤ کا کوئی راستہ نکال لیں۔ اُس نے میکے میں جا کر اپنی ماں سے بات کی۔ بوڑھی ماں اُس کی کہانی سن کر رونے لگی۔ بولی۔ ''میری دھی! اس گاؤں میں کس میں اتنی طاقت ہے کہ چوہدری یا تھانیدار سے ٹکر لے سکے۔ سکھ ہوں یا ہندو سارے کھوٹے سکے ہیں۔ اناج کے ایک دانے کے لیے چوہدریوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے ہیں۔ خود تیرے باپو کا کھیت بھی چھوٹے چوہدری کا ہے۔ آج وہ

ہمیں وہاں سے نکال دے تو تیری دونوں بہنیں بغیر داج کے گھر میں پڑی رہ جائیں۔ اب تو اُن کی شادیاں بھی سر پر آ گئی ہیں۔ دونوں کے سسرال سے اس کٹائی پر بیاہ کا وعدہ کیا ہوا ہے۔''

جولاں چلا کر بولی۔'' بے بے! تو پھر میں کیا کروں اگر...... اگر تُو میری جگہ ہوتی تو کیا کرتی۔ بتا...... کیا کرتی؟''

اُس کی ماں نے اُسے اپنی چھاتی سے چمٹا لیا اور گھبرا کر بولی۔'' آہستہ بول جولاں دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔ کیوں ہم سب کو نشر کرے گی۔'' وہ اُس کے نرم بالوں میں انگلیاں پھیرتی رہی اور خود بھی آنسو بہاتی رہی، پھر گلوگیر آواز میں بولی۔

'' دھیئے! جب سب در بند ہو جاتے ہیں تو ایک در پھر بھی کھلا رہتا ہے۔ میں تیری فریاد لے کر سچے سائیں تک جاؤں گی۔ آٹھ پہر کا راستہ ہے پر میں کسی نہ کسی طرح کاٹ ہی لوں گا۔ مسلمان ہے لیکن بڑا پہنچا ہوا ہے۔ ہندو، سکھ، عیسائی سب کو اُس کے در سے خیر ملتی ہے۔ تُو جا اب اپنے گھر جا۔ بالکل بے فکر ہو کر جا...... اُوپر والا چنگیاں ہی کرے گا۔''

جولاں نے چونک کر اپنی ماں کو دیکھا۔ ایک لمحے کے لیے اُسے محسوس ہوا جیسے وہ بھی اُس سے جان چھڑا رہی ہے۔ اُسے تسلی تشفی دے کر اُس کے حال پر چھوڑ رہی ہے۔ ڈر رہی ہے کہ کہیں اُس کی وجہ سے اُس کی باقی اولاد کی زندگیاں بھی برباد نہ ہو جائیں۔

جولاں کو اپنے میکے چند دن ٹھہرنا تھا لیکن وہ کچھ ایسی دل گرفتہ ہوئی کہ اُسی دن سسرال واپس آ گئی لیکن اپنے ساتھ وہ ایک بھرپور عزم لے کے آئی تھی۔ وہ عزم جو ایک پاکباز عورت کی آنکھ میں اُس وقت جاگتا ہے جب اُس پر شرافت کے تمام دروازے بند کر کے اُسے ہوس کے خنجر سے ہلاک کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ جب اُسے بتایا جاتا ہے کہ اُس کی زندگی کی قیمت اُس کی آبرو ہے، اُس کی خودداری ہے۔ جولاں نے فیصلہ کر لیا کہ وہ کسی صورت چوہدری کی خواہش کے آگے سر نہیں جھکائے گی۔ اگر پوری دنیا بھی چوہدری کی طرف دار بن جائے تو وہ اپنے فیصلے پر اڑی رہے گی۔

☆======☆======☆

یہ وہ دن تھے جب پرکاش ڈھلوں کا نوجوان ڈاکٹر بیٹا انیل ڈھلوں خدمتِ خلق کا جذبہ لے کر گاؤں پہنچا تھا۔ وہ منوہر لال پٹواری کے مکان میں اپنا کلینک کھول کر علاج معالجے کا آغاز کر چکا تھا۔ وہ ایک پڑھا لکھا اور روشن خیال نوجوان تھا۔ اُسے اس علاقے اور خاص طور پر اس گاؤں کے حالات دیکھ کر حیرانی ہو رہی تھی۔ اُسے یوں لگتا تھا جیسے وہ دس

صدی پہلے کے کسی زمانے میں آ گیا ہے۔ ہر طرف جاہلیت اور توہم پرستی عروج پر تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ شہروں کی روشنی ان علاقوں سے کچھ زیادہ ہی دور تھی۔ جلد یا بدیر اُسے جولاں کی کہانی کا علم ہو گیا۔ پھر ایک موقعے پر جولاں بھی اپنے بچے کی دوا لینے اُس کے پاس آئی اور وہ یہ دیکھ کر غمگین ہوا کہ ایک سیدھی سادی گھریلو عورت کو کس طرح اقتدار کے نشے میں برباد کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اُسے اس خوش شکل معصوم لڑکی سے ہمدردی پیدا ہو گئی۔ جولاں بھی اُسے غمگسار پا کر اکثر اُس کے پاس آنے لگی۔ ڈاکٹر انیل نے اُس سے پورے حالات دریافت کیے اور اُسے یقین دلایا کہ وہ اُس کی مدد کرے گا۔ وہ جانتا تھا کہ چوہدری کا رویہ سراسر غیر اخلاقی، ناجائز اور قابلِ سزا ہے اور اُسے من مانی سے روکنا ہر شہری کا اخلاقی فرض ہے لیکن یہ جذباتی نوجوان یہ نہیں جانتا تھا کہ وہ ایک نقار خانے میں ہے اور یہاں طوطی کی آواز کوئی نہیں سنے گا۔ بلکہ اگر اُس نے زیادہ ٹیں ٹیں کی تو بے رحم ہاتھ اُس کا گلا گھونٹنے سے بھی باز نہیں آئیں گے۔ اُسے اپنی شرافت اور سچائی پر یقین تھا اور اُس کا خیال تھا کہ وہ اپنے شریفانہ اور سچے رویئے سے حالات کو سدھار لے گا۔

اُس نے چوہدری بسوا جیت کے نوعمر بیمار پوتے کو موت کے منہ سے بچایا تھا۔ اس لیے وہ اُس کی زیادہ نہیں تو تھوڑی بہت عزت ضرور کرتا تھا۔ انیل سب سے پہلے چوہدری سے ملا اور باتوں باتوں میں اُسے اس کی غلطی کا احساس دلانے کی کوشش کی۔ نصیحتوں اور مشوروں کا ایک لیکچر پلایا۔ مگر پتھر پر شیشے کا کیا اثر ہوتا ہے۔ چوہدری نے ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال دی۔ بلکہ اُلٹا اُسے ہدایت کی کہ وہ صرف اپنے کام سے کام رکھے ورنہ اُس کا اس علاقے میں رہنا مشکل ہو جائے گا۔ چوہدری کی جانب سے مایوس ہونے کے بعد انیل نے وڈے تھانیدار شیکھر بیدی سے رجوع کیا۔ اُس نے بیدی سے کہا کہ وہ اس علاقے کا سب سے بااثر شخص ہے اور قانون کا محافظ بھی۔ اُس کی ناک کے عین نیچے قانون شکنی ہو رہی ہے۔ یہ کوئی اچھی مثال نہیں۔ اُسے چاہیے کہ وہ چوہدری پر اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے ایک شریف عورت کو اُس کے چنگل سے بچائے۔ تھانیدار، چوہدری کا نمک خوار تھا اور ہر طرح سے اُس کی مٹھی میں تھا۔ بلکہ اپنی من مانیوں اور عیاشیوں میں دونوں ایک دوسرے کے پارٹنر تھے۔ اُس نے وہی بات کرنا تھی جو اُس کے پارٹنر کے حق میں جاتی تھی۔ اُس نے ہوشیاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اُلٹا انیل کو اپنے رنگ میں رنگنا شروع کر دیا۔ پہلے شراب کی بوتلیں ڈاکٹر کے کلینک بھیجیں۔ پھر ایک دو لڑکیاں اپنے پوشیدہ امراض لے کر اُس کے پاس آنے لگیں۔ یہ سب کچھ تھانیدار کی ہدایت پر ہو رہا تھا۔ ایک مجرے میں تھانیدار نے ڈاکٹر کو زبردستی شراب

پلانے کی کوشش بھی کی۔ ڈاکٹر پر اب سب کچھ کھل چکا تھا۔ اُس نے واشگاف الفاظ میں تھانیدار سے کہہ دیا کہ وہ اپنی چالوں سے باز رہے اور اپنا وہ فرض پورا کرے جو قانون کے محافظ کی حیثیت سے اُس پر عائد ہوتا ہے۔ اس طرح تھانیدار اور ڈاکٹر میں ٹھن گئی۔ جولاں نے انیل کو سمجھانے کی بہت کوشش کی کہ وہ چوہدری اور تھانیدار سے ٹکرانے کی کوشش نہ کرے اور اُسے اُس کے حال پر چھوڑ دے لیکن وہ نہیں مانا۔ اُسے اپنی اصول پرستی سے محبت تھی۔ اُس نے جولاں سے کہا۔

”جولاں! میں تیری آواز قانون کے کانوں تک ضرور پہنچاؤں گا۔ اگر میں شہر کے اخباروں میں تھانیدار اور چوہدری کے فوٹو نہ چھپواؤں تو میرا نام نہیں۔“

دونوں گاؤں کے پچھواڑے جوار کے کھیتوں میں کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ جولاں نے کہا۔ ”ڈاکٹر صاحب! یہ کھیت دیکھ رہے ہیں۔ ان میں جتنے بوٹے ہیں اتنے ہی چوہدریوں کے ہاتھ ہوتے ہیں۔ تم بسوا جیت کے کس کس ہاتھ سے بچو گے۔ کوئی نہ کوئی ہاتھ ضرور تم سے تمہاری زندگی چھین لے گا۔ میں جس مصیبت میں پھنسی ہوئی ہوں اُس میں تو میرا شوہر بھی میرا ساتھ چھوڑ چکا ہے۔ تم تو پھر غیر ہو۔ کہاں تک میرے لیے خود کو کانٹوں پر گھسیٹو گے۔“

ابھی اُن دونوں میں یہ گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ کھیتوں میں ہلچل کے آثار نظر آئے۔ پھر گاؤں کے بیس پچیس افراد نے انہیں گھیرے میں لے لیا۔ ان میں سب سے آگے جولاں کا شوہر تھا۔ گاؤں کے پنچ بھی ان لوگوں میں نظر آ رہے تھے۔ جولاں کے شوہر نے جولاں پر لاٹھیوں کی بارش کر دی۔ گاؤں کے لوگوں نے انیل کو مارنا پیٹنا شروع کر دیا۔ وہ تو پنچوں نے اُس کی جان بچائی، ورنہ شاید اُسی جگہ اُس کا خاتمہ ہو جاتا۔ پھر وہی ہوا جو ہونا تھا۔ چوہدری کے کارندے اور گاؤں کے تماش بین انیل کو گھسیٹتے ہوئے چوہدری بسوا جیت کی حویلی میں لے گئے اور ایک کمرے میں بند کر دیا۔ پورے علاقے میں یہ خبر پھیل گئی کہ شہری ڈاکٹر ایک شادی شدہ عورت کے ساتھ پکڑا گیا ہے۔ جب انیل، چوہدری کی حویلی پہنچ گیا تو گاؤں والوں کو یقین ہو گیا کہ اب اُس کی لاش ہی باہر آئے گی۔ چوہدری بسوا جیت اور تھانیدار شیکھر بیدی اُسے زندہ چھوڑنے والے نہیں تھے۔ اس سے پہلے بھی وہ کئی ”مجرموں“ کے ساتھ یہی سلوک کر چکے تھے...... لیکن اگلے روز لوگوں کو یہ جان کر حیرت ہوئی کہ رات ڈاکٹر انیل موقع پا کر حویلی سے فرار ہو گیا ہے۔ اُس کے کمرے کی کھڑکی ٹوٹی ہوئی تھی اور حویلی کے اصطبل سے ایک گھوڑا بھی غائب تھا۔ بعد میں یہ گھوڑا آٹھ دس کوس دور ایک دوسرے گاؤں سے مل

گیا...... بعض لوگوں کا خیال تھا اور اب بھی ہے کہ انیل کو چوہدریوں کی بہو نے آزاد کرایا تھا۔ اُس کے کمسن بیٹے کو شدید بیماری کی حالت میں ڈاکٹر کے علاج سے افاقہ ہوا تھا۔ بہرحال ڈاکٹر فرار ہو گیا اور تھانیدار بیدی کو اپنی نوکری خطرے میں نظر آنے لگی۔ چوہدری کو بھی باز پُرس اور مقدموں کا خوف لاحق ہو گیا۔ اُن دونوں نے فوری طور پر اپنے آدمی ڈاکٹر انیل کے پیچھے لگا دیئے اور انہیں ہدایت کی کہ وہ ڈاکٹر کو کسی قیمت پر شہر تک نہ پہنچنے دیں...... اور اگر وہ پہنچ گیا ہے تو کچھ بھی بولنے سے پہلے اُس کی زبان بند کر دیں...... اس کے بعد ڈاکٹر انیل پر کیا بیتی؟ انوپ سنگھ یا جولاں کو کچھ معلوم نہیں تھا۔ ڈاکٹر کے فرار کے بعد گاؤں کے جو حالات ہوئے وہ کچھ اس طرح تھے۔ تھانیدار اور جولاں کے شوہر بھگتو نے جولاں کو خوب ڈرایا دھمکایا کہ وہ پنچوں سے کہہ کر اُسے سخت سے سخت سزا دلوائیں گے۔ پھر اس سزا کے بعد اُسے شہر بھیج دیا جائے گا جہاں اُس پر کئی ایک مقدمے بنیں گے۔ جولاں کتنی بھی باہمت تھی لیکن جب سارا گاؤں ایک طرف ہو گیا اور سماج کے ٹھیکیداروں نے اُسے چاروں طرف سے گھیر لیا تو وہ چکرا کر رہ گئی۔ اُسے اپنے ماں باپ کا خیال آیا جو گلی گلی بدنام ہو چکے تھے اور ہونے والے تھے۔ اپنی جوان بہنوں کے ننگے سر اُس کے تصور میں آئے۔ اُس آٹھ ماہ کے معصوم کا خیال آیا جسے ہمیشہ کے لیے اُس سے جدا کیا جانے والا تھا...... وہ سوچنے پر مجبور ہوگئی...... بہت کچھ سوچنے پر مجبور ہوگئی۔ اُس کی جھکی ہوئی گردن دیکھی تو تھانیدار بیدی اور بھگتو کی آنکھوں میں فاتحانہ چمک لہرانے لگی۔ اُسی روز تھانیدار بیدی نے پنچوں سے مل کر معاملہ رفع دفع کر دیا...... چھ سات روز اسی طرح گزر گئے۔ پھر ایک شام بھگتو گھر آیا تو ولایتی شراب کے نشے میں چُور تھا۔ وہ جولاں کے لیے کپڑوں کے دو تین بڑے اچھے جوڑے لایا تھا۔ اس کے علاوہ مٹھائی، کباب، کلیجے اور پتہ نہیں کیا کیا کچھ تھا۔ لگتا تھا اُس کے پاس کافی پیسے آ گئے ہیں۔ شراب پیتے ہوئے اور کھانا کھاتے ہوئے اُس نے جولاں سے کہا۔

”کل سہ پہر تیار ہو جانا۔ ساجن پور گاؤں میں میرے ایک یار کی شادی ہے۔ وہاں جانا ہے۔“

”ساجن پور“ اور ”تیاری“ کی بات سن کر جولاں کا ماتھا ٹھنکا۔ وہ جانتی تھی ساجن پور میں بھگتو کا کوئی یار نہیں۔ ہاں راستے میں چوہدری بسوا جیت کا ڈیرہ ضرور ہے۔ جہاں ایک دفعہ دو قتل بھی ہوئے تھے۔ اپنے شوہر کی بات سن کر جولاں کی جان لرز گئی۔ وہ سمجھ گئی کہ اُس کی عزت پر حرف آنے والا ہے۔ اُس نے روتے ہوئے اپنے شوہر کے آگے ہاتھ جوڑ دیئے۔

”بھگتو مجھے اس طرح برباد نہ کر اپنے ہاتھوں سے میرا گلا گھونٹ دے۔ مجھے تیرے ان

کپڑوں اور پیسوں کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں صرف عزت کی بھوکی ہوں۔ مجھے عزت نہیں دے سکتا تو میری جان لے لے۔''

بھگتو نے لال گلابی آنکھوں سے اُسے گھورا پھر بوتل کو مضبوطی سے تھامتے ہوئے بولا۔

''حرامزادی! تھانیدار کی بات بھول گئی ہے۔ جیلوں میں سڑا دے گا ہم سب کو۔ ایسی مار مارے گا کہ شرافت کی چڑیا پھر سے اُڑ جائے گی۔''

جولاں نے کہا۔''تم مجھے پنچوں کے سامنے پیش کرو۔ مجھے یقین ہے وہ مجھ پر رحم کھائیں گے۔''

بھگتو نے نشے میں ہاتھ ہلایا۔''ہا......رحم کھائیں گے۔ وہ وہی کچھ کریں گے جو تھانیدار کہے گا اور تجھے پتہ ہی ہے تھانیدار کیا کہے گا۔'' پھر اُس نے شراب کا ایک بڑا گھونٹ لے کر پوری بے حیائی سے بیوی کی آنکھوں میں دیکھا اور انگلی اُٹھا کر خوفناک لہجے میں بولا۔''میں کوئی بہانہ سننا پسند نہیں کروں گا۔ کل تجھے ہر صورت میرے ساتھ چلنا ہے......سن رہی ہے میری بات؟''

جولاں نے چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپایا اور چارپائی پر گر کر رونے لگی۔

اُس رات جولاں نے اُس فیصلے کو عملی جامہ پہنایا جو وہ بہت پہلے کر چکی تھی۔ اُس نے اپنے معصوم بچے کو چھاتی سے لپٹا لیا اور جی بھر کر دودھ پلایا۔ پھر اُسے گود میں اٹھا کر بہت سی میٹھی میٹھی لوریاں دیں اور جب وہ اپنی بدنصیب ماں کی بانہوں میں سو گیا......اور رات آدھی سے زیادہ گزر گئی تو وہ اُسے لے کر خاموشی سے باہر آ گئی۔ پہریداروں اور گاؤں کے آوارہ کتوں سے بچتی بچاتی وہ ڈیک نالے کی طرف چلی آئی۔ اُس کے جسم پر ایک چادر تھی جو تیز ہوا میں پھڑپھڑا رہی تھی۔ وہ بچے کو گود میں اٹھائے نالے کے کنارے خاموش کھڑی تھی۔ یخ بستہ پانی کا بے رحم شور سنتی رہی۔ پھر ایک ہلکی سی آہ کے ساتھ اُس نے پانی میں چھلانگ لگا دی۔

جولاں کے بچپن کا پیار......انوپ سنگھ اُس وقت اپنے جھونپڑے سے کچھ فاصلے پر خاموش بیٹھا تھا۔ نہ جانے کیوں اُسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ شاید مچھروں کی وجہ سے ایسا ہوا تھا۔ وہ اپنے خیالوں میں گم تھا جب اچانک اُسے پانی پر کوئی سفید چیز متحرک نظر آئی۔ کوئی جسم بہتا اور غوطے کھاتا ہوا جا رہا تھا۔ اس کے علاوہ ایک ننھے بچے کی مہین آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔ انوپ آناً فاناً اُٹھا۔ اُس نے پاؤں سے جوتی نکالی اور دوڑ کر پانی میں چھلانگ لگا دی۔

ٹھیک پانچ منٹ بعد وہ نالے کے کنارے گیلی ریت پر جولاں اور اُس کے بچے کے

پیٹ سے پانی نکال رہا تھا۔ ماں بیٹا موت کے منہ سے واپس آ گئے تھے......جولاں کا سانس باقاعدگی سے چلنے لگا اور دل کی دھڑکن ٹھیک ہو گئی تو اُس نے آنکھیں کھول دیں۔ بچہ اُس کے پہلو میں ہمک رہا تھا۔ انوپ سنگھ یک ٹک اُن دونوں کو دیکھتا چلا گیا۔ ماضی کے شکوے گلے اُس کی آنکھوں میں آنسو بن کر چمک رہے تھے لیکن یہ وقت شکووں، گلوں کا نہیں تھا اور نہ ہی اب ان باتوں سے کوئی فائدہ تھا......اُسے جولاں اور چوہدری بسوا جیت کی ساری کہانی معلوم تھی اور وہ اندازہ لگا چکا تھا کہ جولاں نے خودکشی کی کوشش کیوں کی ہے۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس جگہ جولاں کی عزت اور زندگی کو سخت خطرہ ہے۔ اُس نے فوری طور پر فیصلہ کیا اور جولاں کو کسی محفوظ ٹھکانے تک پہنچانے کا ارادہ کر لیا۔ اُس نے دور ایک نظر اپنے جھونپڑے پر ڈالی اور جولاں پر جھک کر اُس سے سرگوشیاں کرنے لگا۔

ایک سخت کوشش کے بعد اُس نے جولاں کو اپنے ساتھ چلنے پر راضی کر لیا۔ وہ اُسے اور اُس کے بچے کو لے کر راتوں رات ''پکی ڈھیری'' پہنچ گیا اور یہاں اُسے اپنے دوست کے ڈیرے پر لے آیا۔ میرے اندازے کے برعکس انوپ سنگھ ایک شریف اور بھلا مانس شخص تھا۔ وہ غیر شادی شدہ اور جوان تھا، ایک جوان اور خوبصورت عورت کے ساتھ اس مکان میں تنہا رہتے ہوئے اُسے آج تیسری رات تھی۔ پھر یہ عورت یا لڑکی اُس کی محبت بھی تھی۔ اس کے باوجود اُس نے آنکھ اُٹھا کر اُس کی طرف نہیں دیکھا۔ یہ بڑے حوصلے اور ظرف کی بات تھی......وہ جولاں اور اُس کے بچے کو شہر پہنچانا چاہتا تھا۔ جہاں جولاں کا کوئی دور کا رشتے دار رہتا تھا مگر اس سے پہلے وہ اپنی ماں اور بہن تک اپنی خبر پہنچا دینا چاہتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ پانی میں چھلانگ لگاتے وقت وہ اپنی جوتی بھی کنارے پر اتار آیا ہے۔ یہ بات اُن دونوں کے لیے بہت پریشان کن ثابت ہو سکتی تھی۔ اتفاقاً کیے زکریا سے اُس کا رابطہ ہو گیا اور اُس نے زکریا کی مٹھی گرم کر کے اُسے اپنا پیغام پہنچانے بھیج دیا......بعد کے واقعات آپ جانتے ہی ہیں۔

انوپ اور جولاں کی کہانی ختم ہوئی۔ کمرے میں ایک گہرا سناٹا چھا گیا۔ لالٹین کی روشنی میں ہم پانچوں اپنی اپنی سوچ میں گم تھے۔ میں تیزی سے آئندہ کا لائحہ عمل سوچ رہا تھا۔ دفعتاً دروازے پر ایک تیز دستک ہوئی۔ میرے اشارے پر بلال شاہ اُٹھ کر دروازے کی طرف گیا مگر اس سے پہلے کہ وہ دروازہ کھولتا کسی نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''انوپ! مخبری ہو گئی ہے۔ چوہدری اپنے بندوں کے ساتھ اسی طرف آ رہا ہے۔ جان بچانی ہے تو بھاگ جا......'' پھر جواب سنے بغیر اطلاع دینے والا خود بھی بھاگ گیا۔ اُس کے

دوڑتے قدموں کی آواز سناٹے میں دور تک سنائی دی۔ تب اچانک اردگرد کے کھیت گھوڑوں کی سرپٹ ٹاپوں سے گونج اٹھے۔ میں نے محافظ کے تکیے سے نکالا ہوا 32 بور کا ریوالور ہاتھ میں لیا اور دروازے کی طرف بڑھا۔ جونہی میں نے دروازہ کھولا کوئی ایک درجن افراد گھوڑوں سے چھلانگیں لگا کر میرے سامنے آ گئے۔ وہ سب کے سب مسلح تھے۔ چوہدری بسواجیت اور اُس کا چھوٹا بھائی بھی اُن میں نظر آ رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر وہ حیران رہ گئے۔

''تم یہاں؟'' چوہدری نے میری طرف انگلی اُٹھا کر پوچھا۔ وہ مجھے بیدی کے ڈرائیور کے طور پر جانتا تھا۔

میں نے کہا۔ ''ہاں چوہدری صاحب! میں بھی ان دونوں کی کھوج میں تھا۔ آپ نہ بھی آتے تو میں ایک گھنٹے تک انہیں آپ کی حویلی میں لے آیا۔''

چوہدری اور اُس کے کارندے مجھے دھکیلتے ہوئے کمرے میں گھس گئے۔ اس کے ساتھ ہی انوپ کی کراہیں اور جولاں کی چیخیں گونجنے لگیں۔ چوہدری کے بندے اُن دونوں کو بری طرح پیٹ رہے تھے...... پھر دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے اُن دونوں کو پگڑیوں سے باندھ کر زمین پر ڈال دیا۔ آٹھ ماہ کا معصوم بچہ حالات کی ستم ظریفی پر حلق پھاڑ کر چیخ رہا تھا لیکن اُس کی فریاد سننے والا کوئی نہیں تھا۔ میں نے دیکھا جولاں کی فریادی نظریں میری طرف اٹھی ہوئی ہیں۔ جیسے کہہ رہی ہو۔ ''تم تو کہتے تھے میں اصلی تھانیدار ہوں۔ اب کہاں ہے تمہاری تھانیداری؟ کیا تم بھی اُس ہجوم میں شامل ہو جاؤ گے جو میری جان لینے پر تُلا ہوا ہے۔''

اس دوران خستہ حال جیپ کی خوفناک گڑگڑاہٹ سنائی دی۔ چند لمحوں بعد تھانیدار بیدی تین رائفل مینوں کے ساتھ موقع پر پہنچ گیا۔ چوہدری کے کارندے اُس وقت انوپ اور جولاں کو اُٹھا کر باہر لے آئے تھے اور بری طرح پیٹ رہے تھے۔ تھانیدار نے آگے بڑھ کر انہیں روک دیا۔ پھر بڑے اور چھوٹے چوہدری کو لے کر جیپ میں آ گیا۔ بڑے چوہدری کے کہنے پر اُس نے مجھے اور بلال شاہ کو بھی جیپ میں بلا لیا۔ میری یہاں موجودگی پر وہ خود بھی حیران ہو رہا تھا۔ میں نے ابھی اپنا راز کھولنا مناسب نہیں سمجھا۔ بیدی کے پوچھنے پر میں نے اُسے بتایا کہ کل مجھے ڈاکیے زکریا پر شک ہوا تھا اور اُسی کی نشاندہی پر میں یہاں تک پہنچا ہوں۔ میرا ارادہ تھا کہ دونوں مجرم اچانک آپ کے سامنے پیش کر کے آپ کو حیران کر دوں گا۔ بیدی میری باتوں سے پوری طرح مطمئن نہیں ہوا لیکن اس وقت وہ تفصیل میں نہیں جا سکتا تھا۔ اُس نے چوہدری سے کہا۔

''چوہدری صاحب! میرا خیال ہے اس معاملے کو فی الحال ٹھنڈا کر دیں۔ لڑکے کو پکڑ

لیتے ہیں اور لڑکی وارثوں کے سپرد کر دیتے ہیں......''

چوہدری کو اس بات پر بہت حیرت ہوئی۔ شاید اُسے لگا تھا کہ اُس کے منہ سے نوالہ چھینا جا رہا ہے۔ اُس نے سرگوشی میں کہا۔ ''کیوں تھانیدار کیا بات ہوئی؟''

تھانیدار نے اپنی ڈاڑھی کھجائی پھر الجھن سے بولا۔ ''میں رات بھی آپ سے بات کرنا چاہتا تھا لیکن ٹائم نہ ملا۔ دراصل شہر سے ایک خط آیا ہے۔ ایک بھڑوا انسپکٹر یہاں آ رہا ہے۔ میں سوچتا ہوں خواہ مخواہ کوئی مصیبت نہ پڑ جائے۔'' (یہ خط دراصل میری روانگی کے وقت ہی ایس ایس پی صاحب نے لکھا تھا لیکن دور دراز علاقہ ہونے کی وجہ سے وہ کافی دیر کے ساتھ یہاں پہنچا تھا)

چوہدری نے کہا۔ ''بیدی یار! کیسی بات کرتے ہو۔ ایسے انسپکٹروں سے تم ہزار بار نبٹ چکے ہو۔ منہ کھول کر آئے گا ہم منہ بند کر دیں گے تو واپس چلا جائے گا۔''

بیدی نے مجھے ایک غائبانہ گالی سے نوازا اور بولا۔ ''میں نے اُس کا نام سنا ہوا ہے۔ بڑا نیکوکار اور شرافت کا پتلا بنتا ہے۔ ہماری لائن کا آدمی نہیں ہے وہ۔ بہتر ہے جرا ہاتھ پاؤں بچا کر رہیں۔''

میں اپنے بارے میں ریمارکس سن کر محظوظ ہو رہا تھا۔ چوہدری، بیدی کی طرف کچھ اور جھک گیا اور دونوں کانوں کان میں گفتگو کرنے لگے۔ جیسا کہ اس گفتگو کے بارے میں بعد میں پتہ چلا۔ چوہدری کا ارادہ تھا کہ تھانیدار جولاں اور انوپ کو اُس کے حوالے کر دے اور وہ اُن کے ساتھ اچھا برا کرنے کے بعد انہیں نہر میں ڈبو کر مار ڈالے۔ بعد میں کہا جا سکتا تھا کہ انہوں نے پکڑے جانے کے خوف سے ڈیک نالے میں چھلانگ لگائی اور تیز بہاؤ کی وجہ سے ڈوب گئے...... لیکن تھانیدار کو اپنی فکر پڑی ہوئی تھی لہٰذا وہ اس تجویز پر راضی نہیں ہوا۔ اُس نے کہا کہ جولاں اور انوپ پر الزامات لگا کر انہیں پنچوں کے سامنے پیش کر دیا جائے اور اس معاملے کو کچھ دیر اسی طرح لٹکا رہنے دیا جائے...... اُس نے دوسرا مشورہ یہ دیا کہ ڈاکٹر انیل کو فوراً ہلاک کر دیا جائے...... جی ہاں...... ڈاکٹر انیل چوہدری بسواجیت کی حبس بے جا میں تھا۔ اُسے چوہدری کے ساجن پور والے ڈیرے میں رکھا گیا تھا اور دو مسلح آدمی ہر وقت اُس پر پہرہ دیتے تھے۔

دراصل ڈاکٹر انیل کو اُس وقت اغوا کیا گیا تھا جب وہ اپنے ایڈووکیٹ دوست کے گھر سے واپس آ رہا تھا۔ اغوا کرنے والے سادہ لباس میں پولیس کے آدمی تھے اور انہیں بیدی نے انیل کے پیچھے لگا رکھا تھا۔ ساجن پور کے اُس قید خانے میں تین ہفتوں کے اندر انیل کو بے

شمار اذیتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اگر میں اُن تین ہفتوں کی تفصیل میں گیا تو پوری ایک کتاب بن جائے گی۔

جب انیل کے انجام کے بارے میں سب طے ہوگیا تو چوہدری نے اپنے کچھ کارندے جولاں اور انوپ کے پاس چھوڑ دیئے۔ دو رائفل مین بھی وہیں اتار دیئے گئے۔ میں چوہدری بسوا جیت، اُس کے بھائی اور تھانیدار کو لے کر ساجن پور کی طرف روانہ ہوا۔ وہاں سے ساجن پور کا فاصلہ دو میل کے قریب تھا۔ فجر کی اذانیں ہو رہی تھیں۔ جب ہم ساجن پور کے قریب سے گزر کر چوہدری کے ڈیرے پر پہنچے۔ ڈیرے داروں نے آگے بڑھ کر استقبال کیا۔ ڈیرے کے ایک کمرے میں سُرخ قالین بچھا ہوا تھا اور گاؤ تکیے لگے ہوئے تھے۔ لگتا تھا یہاں مجرا وغیرہ ہوتا رہتا ہے۔ چوہدری اور تھانیدار گاؤ تکیے کے سہارے بیٹھ گئے۔ ہم دیواروں کے سہارے مؤدب کھڑے رہے۔

تھوڑی دیر بعد کہیں قریب سے دھینگا مشتی کی آوازیں آئیں۔ تب تین آدمی ڈاکٹر انیل کو گھسیٹتے کھینچتے کمرے میں لے آئے۔ وہ ایک سُرخ و سپید نوجوان تھا لیکن بال سکھوں کے انداز میں نہیں تھے یعنی وہ ''مونا سکھ'' تھا۔ اُس کے چہرے پر چوٹوں کے نشان تھے اور ڈاڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ اُس کے دونوں ہاتھ پشت پر کسی رسی وغیرہ سے باندھے گئے تھے۔ مسلح آدمیوں نے اُسے دھکا دیا اور وہ اوندھے منہ تھانیدار کے قدموں میں گرا۔ تھانیدار نے اپنے بوٹ سے اُس کا زخمی چہرہ اوپر اٹھایا اور ماں بہن کی گالیاں دینے لگا۔ شاید وہ اُسے مارنے سے پہلے اچھی طرح دل کی بھڑاس نکال لینا چاہتا تھا۔ چوہدری نے بھی اُسے ایک دو ٹھوکریں رسید کیں۔ پھر چوہدری کے اشارے پر اُس کے کارندے بھوکے کتوں کی طرح اُس پر ٹوٹ پڑے۔ وہ اُسے مار مار کر جان سے مار دینا چاہتے تھے۔ قیمتی قالین کو خون سے بچانے کے لیے یہ ایک اچھا طریقہ تھا...... اور یہ طریقہ اُس اصول پرست نوجوان پر آزمایا جا رہا تھا جس نے ظالموں اور دھوکے بازوں کے ہجوم میں گھس کر علی الاعلان سچ بولا تھا۔ جس نے ایک تنہا اور بے کس عورت کا ساتھ دینے کی بیوقوفی کی تھی...... اُس جیسے نوجوان کو اس بیوقوفی کی سزا ملنی ہی چاہیے تھی۔ وہ مار کھا رہا تھا...... اور تڑپ رہا تھا۔ ہر ایک کی طرف رحم طلب نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ مگر یہاں اُس پر رحم کھانے والا کوئی نہیں تھا...... اُس وقت میں نے شلوار کے نیفے سے 32 بور کا ریوالور نکالا۔ دو قدم آگے بڑھا اور تھانیدار شیکھر بیدی کی کھوپڑی کا نشانہ لے لیا...... یہ منظر دیکھ کر چوہدری اور تھانیدار کے منہ کھلے رہ گئے۔ مار پیٹ کرنے والوں کے ہاتھ بھی رک گئے۔

''کون...... کون ہو تم؟'' بیدی نے مجھے شکی نظروں سے دیکھتے ہوئے ہراساں لہجے میں پوچھا۔

''انسپکٹر نواز خان۔'' میں نے پورے اعتماد سے کہا۔

تھانیدار کا کھلا ہوا منہ کچھ اور کُھل گیا۔ وہ ہکلایا۔ ''آ...... آپ...... میں...... میں تو۔'' مجھے اپنے عقب میں آہٹ سنائی دی۔ اگر مجھے ایک لمحے کی تاخیر ہوتی تو جرمن ساختہ 39 کے برین گن کی دس پندرہ گولیاں میرے جسم میں پیوست ہو جاتیں۔ یہ خوفناک ہتھیار چوہدری بسوا جیت کے چھوٹے بھائی یعنی چھوٹے چوہدری نے استعمال کیا تھا اور نہایت پاگل پن کے ساتھ استعمال کیا تھا۔

میری زندگی باقی تھی جو میں گولیوں کی زد سے نکل گیا۔ یونہی میں نے تڑپ کر اپنی جگہ چھوڑی، کم از کم دس گولیاں بڑے چوہدری کے جسم میں پیوست ہوگئیں۔ ایک آدھ گولی تھانیدار کے حصے میں بھی آئی اور وہ گاؤ تکیے کے اوپر گر کر کراہنے لگا۔ چوہدری کے زندہ بچنے کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ اُس کے منہ پر جیسے کسی نے کیچڑ کا چھینٹا دے مارا تھا۔ تاریک سوراخوں میں سے سُرخ خون نکل کر پورے قالین کو بھگو رہا تھا۔ چھوٹے چوہدری کی برین گن اب خالی ہو چکی تھی۔ وہ سکتے کے عالم میں کھڑا تھا۔ میں نے گھوم کر ریوالور اُس کی کنپٹی پر رکھ دیا۔ کمرے میں گولیوں کا دھواں تھا اور فضا میں ابھی تک برسٹ کی بازگشت گونج رہی تھی۔

☆======☆======☆

چوہدری بسوا جیت کی ہلاکت اور تھانیدار کے زخمی ہونے کے بعد میں نے گاؤں کے حالات پر کس طرح قابو پایا یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ درحقیقت خدا کی بے آواز لاٹھی کچھ اس طرح گھومی تھی کہ انصاف کے تمام تقاضے آپوں آپ پورے ہوگئے تھے۔ چھوٹے چوہدری کے ہاتھوں بڑا چوہدری مارا گیا۔ چھوٹا چوہدری قتل کیس میں گرفتار ہوا۔ تھانیدار کو نہ صرف اپنے بائیں بازو سے محروم ہونا پڑا بلکہ اُس کی ملازمت بھی گئی۔ اس کے علاوہ اُس پر کئی ایک کیس بنے۔ نوجوان ڈاکٹر انیل اپنے ضمیر کے سامنے سرخرو ہو کر شہر واپس آیا اور اُس کے والدین کا طویل انتظار ختم ہوا۔ مستقل طور پر شہر واپس آنے سے پہلے ڈاکٹر انیل نے ایک اور اہم کام کیا۔ اُس نے جولاں کے شوہر کی جان بچائی۔ جولاں کے شوہر بھگتو نے مایوسی اور شدید پشیمانی کے عالم میں خودکشی کی کوشش کی تھی۔ اُس نے بھاری مقدار میں نیلا تھوتھا کھا لیا تھا۔

اُس نے ٹوٹی پھوٹی لکھائی میں ایک خط چھوڑا تھا جس میں اُس نے لکھا تھا کہ ''میں نے اپنی پاک دامن بیوی کو بدنام کرنے اور اُسے برے راستے پر چلانے کا مہا پاپ کیا ہے۔ مجھے اُس سے معافی مانگنے کا ایک ہی طریقہ سمجھ میں آرہا ہے کہ میں اپنی جان دے دوں۔'' اور واقعی اگر انیل جیسا قابل ڈاکٹر اُسے بچانے کی جدوجہد نہ کرتا تو وہ جولاں کو بیوہ کر جاتا اُس کی جان بچ گئی۔ اُس نے اپنی بے راہ روی سے ہمیشہ کے لیے توبہ کر کے ایک نئی زندگی کا آغاز کیا...... باقی انوپ سنگھ کے بارے میں کیا لکھوں وہ تو اُن ملاحوں میں سے تھا جو کچی عمر میں دل کو روگ لگا لیتے ہیں اور پھر ساری عمر کشتیاں چلاتے ہوئے گاتے رہتے ہیں۔

''روہی رنگ رنگلیڑی میرا یار ملا دے'' اور ''پینگ ٹٹ گئی ہلارا کھا کے'' وغیرہ وغیرہ۔
ان کی قسمت میں ہمیشہ کے لیے ترسنا ہوتا ہے۔

☆======ختم شد======☆